ہندوستان کے

مشہور اَطِبّاء

حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1988
دوسری طباعت	:	2014
تعداد	:	550
قیمت	:	-/109 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	598

Hindustan Ke Mashhoor Atibba

By: Hakeem Hafiz Syed Habibur Rahman

ISBN :978-93-5160-028-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو پچھلے کئی دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادرہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستی، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ کونسل کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلم ہے۔ کونسل کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذولسانی اور اردو۔اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ کونسل کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تا کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

اہل علم سے گذارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ وہ خامی اگلی اشاعت میں دور کی جا سکے

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست اطبا

عرض مصنف	VII
1- اشرف الحکماء و امامِ فن حکیم محمد شریف خاں۔	1
2- شاعر باکمال و بے مثل طبیب حکیم مومن خاں مومن۔	11
3- حاذقِ طب و ماہر جنسیات حکیم محمود خاں	33
4- طبیب حاذق حکیم ابوعلی محمد جعفر۔	47
5- تاج الاطباء و بانی ادارۂ طب حکیم حاجی محمد عبدالعزیز	57
6- صوفی صاحب درویش و نیک اندیش حکیم سید برکات احمد ٹونکی۔	71
7- مسیح الملک حاذق الملک مسیحائے ہند حکیم حافظ محمد اجمل خاں۔	81
8- شاہی طبیب لقمان حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا۔	113
9- تصوف و سلسلۂ عالیہ و قادریہ کا نقیب حکیم حاجی قاضی سید کرم حسین قادری	125
10- ممالک غیر میں طب یونانی کا نقیب شمس الاطبا خان صاحب حکیم غلام جیلانی	145
11- اردو ادب بنگال کا تابندہ ستارہ شفاالملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخونزادہ	153
12- ماہر سرجن طبیب حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر۔	163
13- بانی طبی درسگاہ علامہ حکیم احمد حسین عثانی۔	179

14- شہنشاہ تصنیفات نازش طب علامہ حکیم کبیر الدین۔ 189

15- مجاہدین تحریک آزادی اور عظیم کانگریسی رہنما حکیم محمد اسحاق۔ 203

16- پہلوان حکیم شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی۔ 225

17- بھارت میں کاروان طب کا سپہ سالار و پدم شری حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی۔ 239

18- اُردو کا بلند پایہ ادیب حکیم سید علی کوثر چاندپوری۔ 251

19- طبی سیاست کے ترجمان حکیم شکیل احمد شمسی۔ 263

عرض مصنف

پتھروں کے ابتدائی زمانے میں عبادت گاہوں کے راہب جھاڑ پھونک کے پردے میں جڑی بوٹیاں بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ طب کی یہ ابتدائی صورت تھی۔

اس فن کو سب سے پہلے باقاعدہ اسقل بیوس نے اختیار کیا۔ اسقل بیوس حضرت ادریس علیہ السلام کے دور میں گزرا ہے۔ اسقل بیوس کے بعد بے شمار دردمند انسانوں نے طب کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ یونانی طبیبوں کی تعداد کی ایک طویل فہرست ہے جو ایک طویل عرصے میں پھلے پھولے اور بڑھے۔ وہ جواہر ریزے جو آسمان طب پر ماہ و انجم کی طرح چمکے۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

فیثاغورث۔ افلاطون۔ بقراط۔ ارسطو۔ لقمان۔ جالینوس

ظہور اسلام کے بعد طب نبوی سے اس فن شریف کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ عرب کا مشہور طبیب حارث بن کلدہ تھا۔ رفتہ رفتہ طب کی کتب سریانی، عبرانی اور یونانی سے عربی زبان میں منتقل ہونی شروع ہوگئیں۔ اس فن کو حشو زوائد سے پاک وصاف کیا گیا۔ بے شمار اضافے ہوئے۔ طب یونانی کی درسگاہیں اور بیمارستان (ہسپتال) کھلنے شروع ہوگئے۔ اس طرح طب یونان کا رواج عام ہوگیا۔ یہ سہرا ان اطبا حضرات کے سر جاتا ہے۔ بخت یشوع، جبرئیل بن بخت یشوع،

حنین بن اسحاق، یوحنا بن ماسویہ، علی بن ابن طبری، جابر بن حیان، محمد بن زکریا رازی، ثابت بن قرۃ، ابوسہل مسیحی۔ ابوالقاسم زہراوی ابن الہیثم۔ شیخ بوعلی سینا۔ جرجانی۔ داؤد انطاکی۔

ہندوستان میں ویدک طریقۂ علاج رائج تھا۔ مغلوں کی آمد کے ساتھ طب یونانی کا رواج بھی رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ گیلانی، حکیم علوی خان، حکیم محمد اکبر ارزانی، حکیم اعظم خان نے نہ صرف طب یونانی کو عروج پر پہنچایا۔ اپنے تجربات سے گراں قدر اضافے کیے بلکہ اپنے پیچھے بے شمار تصنیف و تالیف کا ذخیرہ بھی چھوڑا۔ فن طب یونانی کے لیے ان اطبا کی خدمات جلیل القدر اور ناقابل فراموش ہونے کی بین ثبوت ہیں۔

عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات اور ماضی کے حالات کے مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ انسان کو یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور طبیعت سے آگاہی حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دور کی ہستیوں کو بلکہ خود اپنی ہستی کو بھی پرکھتا ہے اور اپنی قدر و قیمت کا تعین بھی کرنے لگ جاتا ہے۔

کیا قدرت نے عظیم شخصیتوں اور ہستیوں کے لیے کوئی الگ معیار اور ان کی تخلیق کے لیے کوئی الگ سانچہ بنا رکھا ہے؟ یا وہ پیدائشی طور پر عظیم ہوتی ہیں۔ یا کچھ ایسی خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں جن کو انسان اپنا کر یا اختیار کر کے بڑا آدمی یا عظیم مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو اکثر ذہنوں میں ابھرتے رہتے ہیں۔ پھر سوال آتا ہے کہ آخر عظمت خود کیا شے ہے؟

عظمت وہ دولت غیر مترقبہ نعمت ہے جو نہ تو دولت، سرمایہ اور اقتدار کے پیمانے سے ناپی جا سکتی ہے اور نہ ہی جاہ و حشم کا نام عظمت ہے۔ عظمت تعداد یا کمیت کا نام نہیں بلکہ صرف کیفیت کا نام ہے۔ جو کسی انسان کے مزاج میں رچ بس جاتی ہے اور مختلف مواقع پر اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح تھرمامیٹر حرارت کے درجوں کا تعین کرتا ہے اسی طرح انسان کی روش کردار۔ گفتار سے اس کی شخصیت اور اس میں موجود عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ اور خاص کر اپنے اسلاف کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے ذہن و جسم انسانی نہ صرف اس سے اتنا متاثر ہوتا ہے بلکہ اس ماحول، حالات کے مطابق خود کو بنانے میں، ڈھالنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی گراں قدر۔ گراں مایہ ہستیاں اپنے

اندر جس وصف کو جذب کرتی رہیں اور مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتی رہیں ہیں۔ وہ صرف تاریخ کے مطالعہ اور اس کے اثرات کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔

بڑے آدمیوں کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ شجاعت، عدل، انصاف، سخاوت، شرافت، حسن اخلاق اور جذبۂ فیض رسانی۔ ان ہی اوصاف سے کسی بھی بشر انسانی کی عظمت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عظمت انفرادی ہو یا اجتماعی۔ میدان زندگی میں صرف وہی افراد اور قومیں عظمت حاصل کر سکتی ہیں جو اوصاف حسنہ کو اپنے اندر جذب کرنے کا مادہ رکھتی ہیں۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ان ہی اشخاص کو بقائے دوام حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاق اور پاک اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔ جو صرف اپنے لیے نہیں جیتے بلکہ دوسروں کے لیے مرتے اور جیتے ہیں اور خلق خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔

سرزمین ہند میں طب کی ایسی بے شمار صاحب کمال ہستیاں گزری ہیں جن سے صاحب نظر و شعور عقیدت کا ملہ رکھتے ہیں اور ان کے کاموں کو نہ صرف درسیات میں بلکہ سبق آموز انداز میں بھی بیان کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت میں اپنے اسلاف کے کارناموں سے کماحقہٗ واقفیت اور ان سے عقیدت و محبت کا اظہار ہی کسی قوم کے زندہ و تابندہ ہونے کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔

''ہندوستان کے مشہور حکما'' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اور موجودہ قوم بخوبی طور پر ان کے کمالات سے آگاہ ہو سکے اور یہاں کے سماج میں اپنا امتیاز اور اعلیٰ معیار اور طرز زندگی قائم رکھ سکے۔

دنیا میں علوم و فنون کی یہ تاریخ ہے کہ جب جب یہ فن یا علم نسل در نسل ترقی کرتا ہے یا چلتا ہے تو وہ فن یا علم خاندانی اثرات سے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے اور اس خاندان کو اس فن یا پیشہ کی بنا پر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہیت ہو یا کسی حیثیت کا ذاتی اقتدار۔ علم و ہنر ہو یا کسی طرح کا فن یہ کبھی ایک ہی فرد پر ختم ہو جاتا ہے اور کبھی پشت در پشت اور پیڑھی در پیڑھی چلتا ہے۔ فن طب میں بھی دنیا میں ایسے ہی واقعات پیش آئے ہیں کہ کبھی ایک فرد تک یہ فن محدود رہا ہے۔ جیسے جالینوس، حکیم زکریا رازی، حکیم بوعلی سینا وغیرہ وغیرہ اور کبھی نسلوں تک یہ فن چلتا رہا۔ جیسے خاندان قرہ خاندان اسقلبیوس، خاندان بخت یشوع اور خاندان حنین وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستان میں جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں مختلف خاندان اور افراد نمایاں رہے ہیں وہیں فنِ طبابت میں خاندان شریفی، خاندان بقائی اور خاندان عزیز نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں۔

خاندان شریفی

ہندوستان کی تاریخ طب جب مکمل طور پر ترتیب دی جائے گی تو خاندانِ شریفی کے نمایاں تذکرے کے بغیر یہ تاریخ طب ادھوری اور غیر مکمل ہوگی۔ خاندان شریفی ہندوستان کا وہ مایہ ناز خاندان ہے جس نے ہندوستان میں فن طب کو جلا بخشی۔

خاندان شریفی کے آبا و اجداد ترکستان کے مشہور شہر کاشغر کے رہنے والے تھے۔ جب شہنشاہ بابر نے 1526 میں ہندوستان پر حملہ کیا تو اس خاندان نے بھی بابر کی رفاقت کی اور شہنشاہ کے ساتھ تمام حملوں میں شریک رہا۔ اس خاندان کے بزرگ جو ہزار سواروں پر مشتمل فوج پر سردار تھے اور خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے نسب سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور خواجہ عبید اللہ احرار کے خاندان کا شمار ائمۂ دین میں کیا جاتا تھا۔

شہنشاہ بابر کی کامیابیوں کے بعد یہ خاندان یہیں مقیم ہو گیا اور سلطنت کے امور مہمہ یا امور سلطنت میں حصہ لیتا رہا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان کے نشینوں کی توجہ سیاست سے زیادہ مذہب کی جانب مبذول ہو گئی چنانچہ اس خاندان کے دو مشہور بزرگ خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم درویش گزرے ہیں۔

خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم حیدر آبا میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے زہد و تقویٰ کا سندھ میں عام چرچا تھا اور صرف مسلمان ہی ان دونوں بھائیوں کے حلقۂ مریدین میں شامل نہ تھے بلکہ اہل ہندو بھی ان کے جاہ و جلال و بزرگی کے بہت زیادہ معترف اور عقیدت مند تھے۔

ان کی نیکی، بے غرضی اور خاموش دعوت سینکڑوں کی اصلاح کا باعث ہوئی۔ خواجہ محمد ہاشم اور خواجہ محمد قاسم کے بعد ملا علی قاری نے اس خاندان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ملا علی قاری کی علمی، مذہبی ادبی و تاریخی قابلیت، ان کی تصنیفات و تالیفات سے ظاہر ہیں۔ جو آج بھی ارباب

علم ودانش ومذہب کو فیضان پہنچارہی ہیں۔

حکیم اجمل خان یا خاندانِ شریفی کے شجرۂ نسب پر سب سے بڑی سند خود حکیم محمود خان اعظم کی ایک تحریر ہے جو خود ان کی اپنی ہی لکھی ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ:

"مکشوف خاطر باد کتابیکہ در آں سلسلہ خاندانی درج بود ہنگامِ تقسیم کتب خانہ
جدی (حکیم محمد شریف خان) کہ بہ شش پسران منقسم شدہ بود در حصۂ عموی صاحب
کلدن حکیم محمد اشرف خان مرحوم رفتہ واز آں جا بمعرض تلف در آمد لہٰذا از ضبطِ تحریر
حال ابتدائی خاندانی معذور ماندم۔"

بابر کی بڑی کامیابی یہ نہ تھی جو اسے میدان پانی پت میں ملی تھی بلکہ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس کے حملے کے وقت جو ساتھی اور رفقا ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب اور اپنے علوم وتمدن کا سرمایہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ ان ہی کے سرمایہ سے ہندوستان کی ایک جدید اور مشترک تہذیب کا نقشہ مکمل ہوا۔

اگر چہ اس خاندان نے سیاست اور مذہب میں خاص مقام حاصل کر لیا تھا لیکن ان کی اصل کارکردگی کا میدان عمل ابھی تک ان کے کارہائے نمایاں سے خالی تھا۔

اپنے خاندان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں خود حکیم اجمل خاں کے بقول ملا علی ہی اس دور میں خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ تھے اور وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے۔ اکبر اعظم ہی کے دور میں اس خاندان کا تعلق دربار شاہی ہی سے قائم ہوا چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانے تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد دربار شاہی سے وابستہ رہا۔ ملا علی قاری کے علم وفضل نے ان کے خاندان میں طب یونانی کے فضل وکمال کی راہ اختیار کی۔ ملا علی قاری اور ملا علی داؤد کے والد سلطان محمد ہرات کے رہنے والے تھے۔

ان ہی ملا علی قاری کے پوتے حکیم فاضل خان نے سب سے پہلے میدان طبابت میں قدم رکھا اور تھوڑے ہی عرصے میں وقار حاصل کر لیا۔ جن کے بعد اس خاندان میں ان کے لڑکے حکیم واصل خان اول ان کے لڑکے حکیم اجمل خان اول۔ حکیم اجمل خان کے صاحبزادے حکیم شریف خان۔ حکیم صادق علی خان، حکیم محمود خان، حکیم عبد المجید خان اور حکیم واصل خان جیسے نامور اور

قابل طبیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خاندانی روایات کو زندہ رکھا اور یہ سب اپنے علم و فضل میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔

سب سے اہم بات ان بزرگوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی رہی کہ وہ ہمیشہ اپنے خاندانی روایات و دستور کو برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے آباد و اجداد کے وطن ترکستان سے تعلق برقرار رکھنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

اکبر کے زمانے میں یہ خاندان آگرہ آکر مقیم ہو ہی گیا تھا۔ فاضل خان کے بڑے بیٹے حکیم محمد واصل خان اول عہد عالمگیری میں اکبرآباد (آگرہ سے) دہلی آئے اور اورنگ زیبؒ کے آخری زمانے میں دربار کے عہدۂ طبابت پر فائز ہوئے جہاں شہنشاہ عالمگیر نے خطاب اور منصب ہزاری کے علاوہ جاگیرات بھی عطا فرمائی تھیں۔

یہ تھا خاندان شریفی کا جاہ و جلال اور سلسلۂ نسب۔

شجرہ خاندانِ شریفی[3]

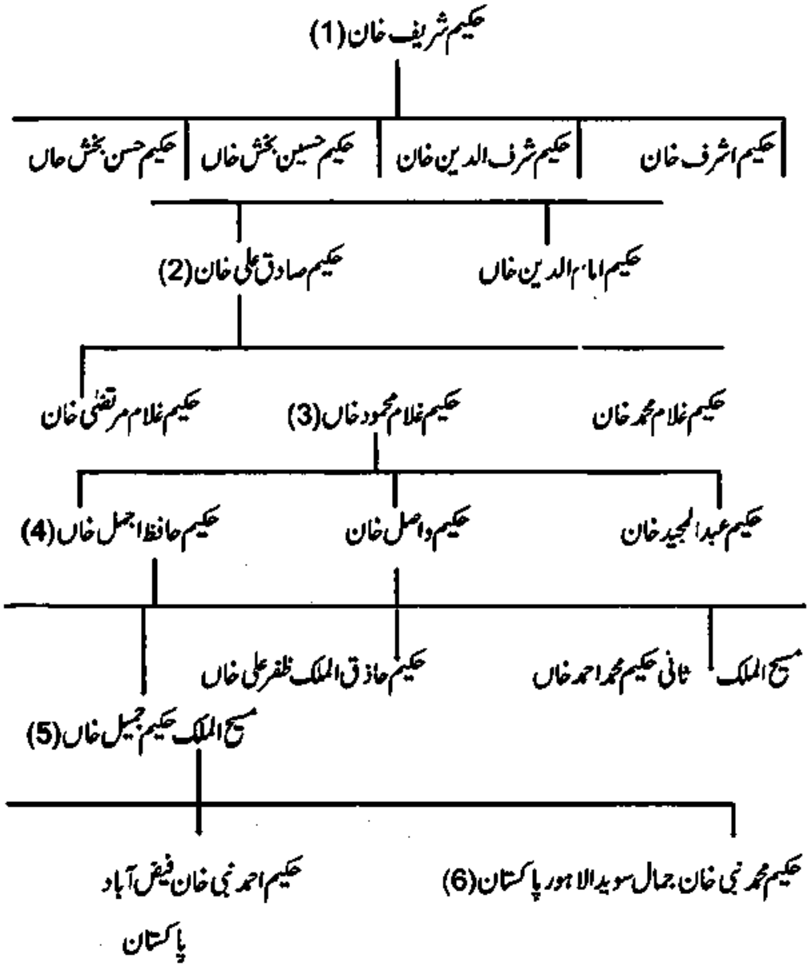

شجرہ خاندان شریفیے

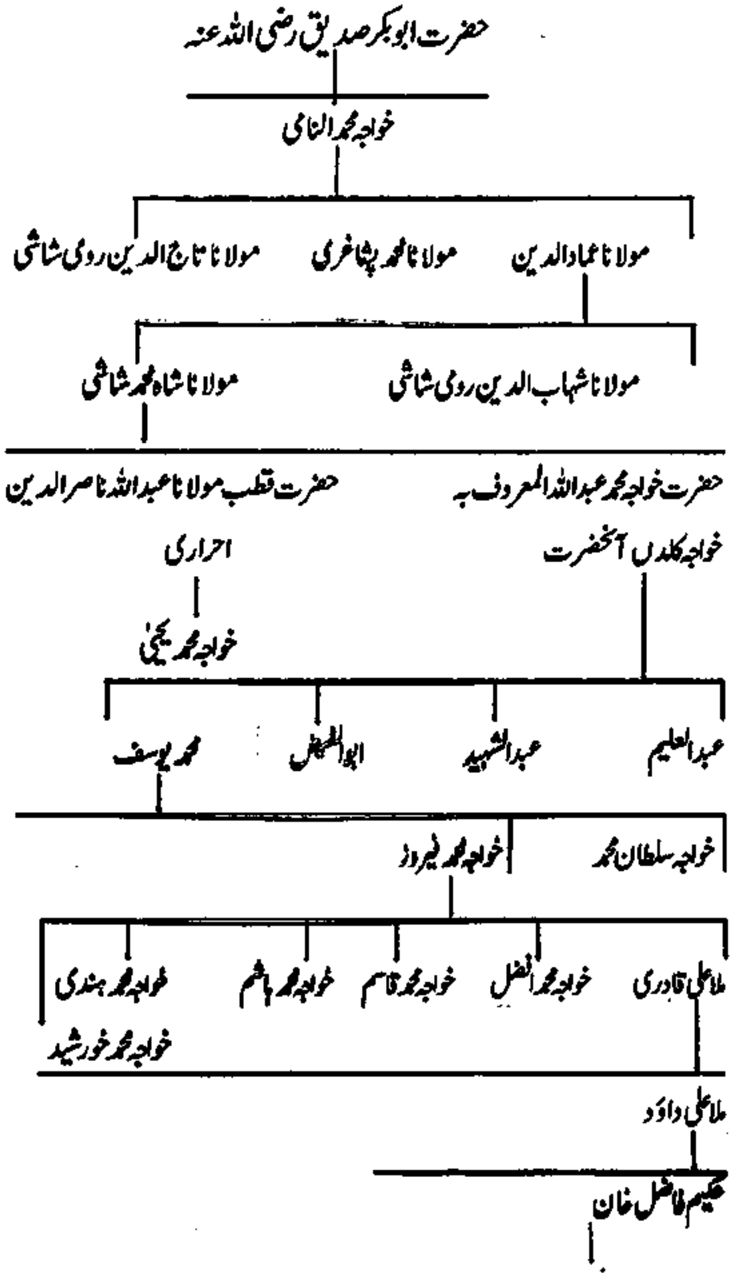

حکیم واصل خان   حکیم اجمل خان اول گوالیار

حکیم اکمل خاں

حکیم محمد شریف خان   حکیم سعید خان

حکیم اشرف خان ۔ حکیم حسن بخش خان ۔ حکیم حسن بخش خان ۔ حکیم صادق علی ۔ خاں

حکیم امام الدین خاں ۔ حکیم شریف الدین خاں

حکیم غلام محمد خاں   حکیم غلام محمود خان   حکیم غلام مرتضٰی خان

حکیم عبدالمجید خان   حکیم واصل خان   حکیم حافظ اجمل خان   حکیم محمد جمیل خان

حکیم محمد نبی خان جمال سویدا پاکستان   حکیم احمد نبی خان بھارت

اشرف الحکما و امام فن حکیم محمد شریف خان

1138ھ مطابق 1714-1222ھ مطابق 1798

خاندان شریفی کے اصل بانی حکیم فاضل خان تھے لیکن یہ خاندان اپنے اصل کمالات جوہر کی بنا پر حکیم شریف خان کے نام سے موسوم ہوا۔ جس طرح اودھ کے طبی خانوادے کے بانی حکیم یعقوب تھے لیکن خاندان حکیم محمد عبدالعزیز کے نام سے خاندانِ عزیزی موسوم ہوا۔

جس کی بنیادی وجہ ان اطبا کے کارہائے نمایاں تھے۔

حکیم محمد شریف خان اگرچہ حکیم فاضل خان کے بعد چوتھی پشت میں تشریف لائے لیکن گراں قدر طبی خدمات کی وجہ سے انہی کے نام سے ان کے خاندان نے ہندوستان گیر نہیں بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کی۔ دہلی کا یہی وہ قابل فخر خاندان ہے جس نے مسلسل بہت سے نامی گرامی اور مایہ ناز اطبا پیدا کیے اور آج نو (9) پشت کے بعد بھی طبابت کا سلسلہ جاری ہے۔

خاندان:-

تاریخی حیثیت سے حکیم محمد شریف خان کے آباؤ اجداد شہنشاہ بابر کے ساتھ بسلسلہ فتوحاتِ ہند۔ ابتدا میں بحیثیت پیر و مرشد کے وابستہ رہے تھے بعد میں جب نفری تعداد زیادہ ہوگئی تو کچھ نے فوج میں تعلیم حاصل کر کے شمولیت اختیار کر لی۔ چند فن طبابت سے وابستہ ہو گئے اور کچھ اپنے

حکیم شریف خاں بانی خاندان شریفی

سابقہ طریقے پر جمے رہے۔

اس خاندان میں سب سے پہلے ملاعلی داؤد کے فرزند جناب حکیم محمد فاضل خان صاحب نے فن طب میں مہارت اور شہرت حاصل کی۔انھوں نے سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔زندگی بھر اپنا آزادانہ مطب کر کے خلق اللہ کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ان کے اکلوتے بیٹے حکیم محمد واصل خان اول نے ان کے بعد خاندانی وقار کو بڑی آن بان سے قائم رکھا اور اپنی وفات کے بعد دو فرزند چھوڑے۔حکیم محمد اکمل خان اور حکیم محمد اجمل خان اول۔

حکیم محمد اکمل نے علاج و معالجہ میں بڑا نام پیدا کیا اور کمال فن کی وجہ سے دربار شاہی سے ان کو حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔

حکیم محمد شریف خان انہی حاذق الملک حکیم محمد اکمل خان کے لائق و فائق بیٹے ہیں۔جن کے نام پر طب یونانی کی تاریخ میں ان کا خاندان انہی کے نام سے موسوم ہوا۔

پیدائش:

خاندان مغلیہ کے دور اخیر میں محمد شاہ کی حکومت کے ابتدائی دور یعنی 1138ھ مطابق 1714 میں حکیم محمد شریف خان تولد ہوئے۔

تعلیم و تربیت:

ابتدائی تعلیم و تربیت حسب دستور زمانہ گھر کے علمی، ادبی اور سب سے بڑھ کر مذہبی ماحول میں ہوئی۔اس کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل کے لیے مشہور عالم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خاندان کے علما کے سامنے زانوئے ادب میں سرخم کیا۔فارسی و عربی نیز دیگر علوم وفنون مروجہ کے بعد طب کی تعلیم کے لیے اپنے لائق و فائق باپ کے علاوہ اپنے عاقل و فاضل چچا سے رجوع ہوئے یہی نہیں حسب فرمائش والد بزرگ گوار کے مزید تعلیم طب کے لیے حکیم عابد سرہندی اور اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم اچھے صاحب کے سامنے بھی سر تسلیم خم کیا۔

خدمات:

اس خاندان کی طبی حیثیت حکیم شریف خان کے زمانے میں بہت ممتاز ہوگئی تھی اور حکیم شریف خان کا شمار بعہد محمد شاہ ایک فاضل و کامل طبیب اور مایہ ناز عالم کے ہوگیا تھا۔یہ اپنے والد

حکیم محمد اکمل خان کی سند کے حقیقی جانشین ثابت ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے اس فن اور مسند والد کو بلند تر کیا۔ دربار شاہی میں اثر و رسوخ اپنے کمال فن اور معراج طب کی وجہ سے حاصل کر کے اشرف الحکما کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ساری حیات انھوں نے طب کی ترقی اور اصلاح کے لیے کوششیں کیں۔

حکیم محمود خان نے اپنی یادداشت میں خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہے کہ ''اُن کے جد امجد حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ کے علاقوں میں 25 ہزار کی جاگیر ملی تھی۔

حکیم شریف خان کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب خاندان تخت مغلیہ میں گھن لگ چکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نے سرزمین ہند پر اپنے پنجے گاڑنا شروع کر دیے تھے اور پایۂ تخت دہلی پر اس وقت مرہٹوں کا غلبہ تھا اور صرف کہنے کو حکومت مغلیہ کی سلطنت تھی۔ دربار دہلی پر مرہٹوں کی پکڑ اس وقت اتنی زیادہ تھی کہ حکیم محمد شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ میں 25 ہزار کی جو جاگیر شاہ عالم سے ملی تھی اس پر بادشاہ وقت کی مہر کے اندر ''مادھوراؤ سندھیا'' کا نام ''وکیل مطلق۔ مختار الملک۔ عمدۃ الامرا'' اور ''فدوی شاہ عالم بادشاہ نمازی'' کے عنوان سے درج ہے وہ 27 سال جلوس یعنی 1786 تحریر ہے۔

علاوہ تحریری، تصنیفی، مذہبی، طبی، اخلاقی کے فنی کمالات میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ زندہ جاوید یہ ہے کہ اُنھوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے طب یونانی کو بربادی سے بڑی حد تک محفوظ کر لیا اور یہ خیال کر کے کہ اب شاہی دربار کی سرپرستی سے فن طب محروم ہو گیا ہے انھوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب کیا طریقۂ کار ہو سکتا ہے کہ دربار شاہی کی سرپرستی کے سوا بھی طب یونانی کو کسی طرح باقی رکھا جا سکتا ہے۔

حکیم شریف خان اور ان کی طبی حیثیت کا ذکر سرسید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کے علاوہ کسی تاریخ میں مکمل و مفصل نہیں ملتا ہے۔ دیگر تصنیف ''فرحت الناظرین'' میں دور مغلیہ کے حالات شروع تا آخر تک ملتے ہیں۔ لیکن حکیم شریف خان کے حالات زیادہ تفصیل سے کہیں بھی نظر نواز نہیں ہوتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب تاریخ ان سے اس قدر روشناس نہ ہوا ہو اور ان کو اس قابل نہ سمجھتا ہو کہ ان کا ذکر نمایاں حیثیت سے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور

تاریخ داں اور مصلح قوم سرسید نے بھی حکیم شریف خان کی فنی خوبیوں، طبی قابلیت کے ساتھ طبیب حاذق ہونے کا تو ذکر کیا ہے لیکن انھیں شاہی طبیب کی حیثیت سے نہیں گردانا ہے۔

شاہ عالم ثانی نے ان کو جو سند توصیفی اور جاگیر عطا کی تھی بہت ممکن ہے کہ شاہ عالم ثانی نے یہ سب حکیم محمد شریف خان کی علمی قابلیت اور حکیم محمد شریف خان کا اپنی تصانیف و کتاب ''تحفۂ عالم شاہی'' یا ''خواص الجواہر'' کا انتساب شاہ عالم ثانی کے نام کی بنا رہی ہو۔ یعنی خطا اور سند توصیف کا سبب عقیدت مصنف یا انتساب کتاب بادشاہ وقت ہو۔

حکیم شریف خان اپنے وقت کے جید بزرگ، محدث، فقیہ اور یگانہ روز طبیب تھے۔ انھوں نے فن طب میں ایک نئی روح پھونکی اور فن طب کو ایک نئی زندگی عطا کی۔

تاریخ میں اتنے بڑے حکیم کے حالات تفصیل سے کہیں نہیں ملتے ہیں۔ سوائے ایک دو تاریخ کی کتب کے۔ اس کی نمایاں وجہ تاریخ بتانے سے بھی قاصر ہے۔

سرسید نے اپنی مشہور تصنیف تاریخی'' آثار الصنادید'' میں جو پہلی بار 1363ھ مطابق 1846 میں زیور طباعت سے مزین ہوئی تھی۔ صرف ضمنی طور پر حکیم صادق علی خان کے تذکرے میں ان کا ذکر خیر کیا ہے۔

> ''وہ اپنے عصر میں سر آمد حکما اور سر حلقۂ اطبا تھے۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے۔ جالینوس اور ارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطبا، نامی انہی کی نسبت شاگردی سے سرمایۂ اعتبار کا ر رکھتے ہیں۔''114

حکیم شریف خان نے ویدک کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس فن پر بھی متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ انھوں نے بعض ویدک مرکبات و کشتہ جات کو طب یونانی میں شامل کیا اور بعض دیسی جڑی بوٹیوں کو بھی اس فن میں شامل کر دیا تھا۔

تصانیف:

حکیم محمد شریف خان نے مختلف علوم و فنون کے ساتھ طب، مذہب اور فن ویدک پر بھی

خامہ فرسائی کی ہے۔

حکیم شریف خان نے فن طب کی مایہ ناز تصنیف ''علاج الامراض'' کی وجہ سے نہ اپنے کو بلکہ اپنے لائق وفائق مصنف کو بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے زندہ و جاوید کر دیا اور جو آج بھی اتنا وقفہ گزر جانے کے باوجود طب کی بنیادی کتاب شمار کی جاتی ہے اور جس کو حکیم واصل خان اول نے تحریر کرنا شروع کیا تھا حکیم شریف خان نے تکمیل تک پہنچایا۔

ان کی طب کی تصانیف کی تعداد 7 ہے جو اپنی حیثیت اور اہمیت میں مستحکم ہے۔

طب کے علاوہ جہاں دیگر علوم میں ان کی تصانیف ملتی ہیں وہاں کلام مجید کا ترجمہ انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کیا تھا۔ اردو ترجمہ کی حیثیت ان معنوں میں بہت زیادہ ہے کہ پہلی بار ان کے ذریعہ سے کلام پاک ایک ایسی زبان میں ترجمہ ہوا جو ملک کی ابھی ابتدائی زبان تھی اور ابھی یہ زبان باوجود مقبولیت کے ابھی اپنی ابتدائی منزل اور شکل میں تھی۔ لیکن حقیقت میں حکیم محمد شریف خان کی عظمت فن طب کی بنیادی کتب میں حواشی لکھنے کی بنا پر پوشیدہ ہے۔

انھوں نے قانون شرح اسباب او نفیسی پر حواشی بھی لکھے۔ ان حواشی سے ان کی وسعت نظر تحقیق اور اصابت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں انھوں نے بعض نہایت دقیق اور مختلف فیہ مسائل کے متعلق نہایت خوبی کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔

حکیم شریف خان نے تاریخ طب میں پہلی بار ایک ایسا جرأت مندانہ قدم اٹھایا کہ تاریخ میں حکیم شریف خان کا نام زندہ و جاوید ہو گیا۔

انھوں نے طب یونانی کو ہندی طب ویدک کے ساتھ مخلوط کیا اور اجداد میں حکیم واصل خان کے ذریعہ شروع کی جانے والی کتاب ''علاج الامراض'' میں نہ صرف اپنے بلکہ اسلاف کے ساتھ ساتھ دیگر معروف اطبا کے تجربات و معمولات کو مذکورہ کتاب میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب میں تمام قدیمی طب کی کتب کے نسخے میں جو مستعمل رہ چکے ہیں ان کو اور بعض مفید و موثر ویدک نسخے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

دستور دنیا ہے کہ جب کوئی قوم کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوتی ہے تو اپنے ساتھ مقام اول سے تہذیب و تمدن تہذیب اور تاریخی اثرات لے جاتی ہے اور دوسروں کو اس سے متاثر کرتی ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ جانے پر وہاں پر پہلے سے موجود تہذیب وتمدن، جغرافیائی تاریخی، سیاسی، سماجی اثرات کو قبول کرتے ہیں اور ایک نئی تہذیب کا وجود آتا ہے جو دونوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔

حکیم محمد شریف خان بھی اس سے نہ بچ سکے اور کشتہ سازی نیز دوسرے تجربات و مرکبات کو طب یونانی کے ساتھ شامل کر کے ہندی تہذیب کو اپنایا۔

غرض کہ حکیم محمد شریف خان نے فن طب پر بیش بہا کتابیں تصنیف اور تالیف کیں۔ قرآن پاک کا اردو و فارسی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے نام نامی و اسم گرامی کی نسبت سے خاندان شریفی کی ابتدا ہوئی۔ پھر ہر نسل اپنی ذات میں ایک دور سمیٹے ہوئے آئی اور خدمت خلق و خدمت فن کے گہرے نقوش چھوڑتی ہوئی گزر گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے سکون و جمود کے بعد حکیم محمد شریف خان ایک مجتہدانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے اور ان کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ انھوں نے اس دور تقلید اعمیٰ میں مسائل طب پر مجتہدانہ نظر ڈالی اور معاصر اطبا کی ردوقبول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے طب یونانی میں اصلاح و اضافہ کی نئی روح پھونک دی۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد شریف خاں کا مطب نہایت کامیاب مطب تھا شہرت دور دور تک جا پہنچی تھی نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دور دراز ممالک جیسے ایران، افغانستان، بخارا اور حرمین شریفین تک سے مریض اور ان کے تیماردار آتے تھے۔

وفات:

1222ھ مطابق 1798 میں بعمر 84 سال راہی ملک عدم ہوئے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار سے متصل مسجد کے جنوبی حصہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ عین اس وقت جب ان کو دفن کیا جا رہا تھا شاہ عبدالعزیز نے دخل الجنۃ بلد حساب سے سن وفات نکالا۔

حکیم غلام رضی خان نے بھی اسی جملے سے سن وفات نکالا۔

مختلف تاریخ دانوں نے مختلف اوقات میں ان کی وصال کی تاریخیں تحریر کی ہیں سیرت اجمل میں 1806 تو بعض نے 1815 سال وفات تحریر کیا ہے۔ یہاں تک کہ قاموس المشاہیر کا مصنف تو ان کے وفات کی تاریخ 1231ھ قرار دیتا ہے۔

لیکن یہ سب غلط ہے۔ حقیقت میں شاہ عبدالعزیز دہلوی محدثؒ کی تاریخ وفات کہی ہوئی موجود تھی تو دیگر تاریخیں قرین قیاس نہیں ہیں۔

پسماندگان:

جیسا کہ شجرۂ نسب سے ظاہر ہے کہ ان کی اولادوں میں تمام کے تمام اطبا اور ایسے اطبا کہ جن کے علم وفن کا چاروں جانب ڈنکا بجا، پیدا ہوئے تھے۔

ان کے چھ صاحبزادے تھے۔

(1) حکیم اشرف خان (2) حکیم حسن بخش خان (3) حکیم حسین بخش خاں (4) حکیم صادق علی خان (5) حکیم امام الدین خان (6) حکیم شرف الدین خان۔

حکیم صادق خان، حکیم شریف خان کے جانشین ان کے انتقال کے بعد مقرر ہوئے۔

طبی معرکے:

حکیم شریف خان کے ذاتی تجربات ومشاہدات تو علاج الامراض میں درج ہیں ہی، چند ایسے واقعات علاج ہوئے جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

ایک بار محمد شاہ ثانی کو قبض کی شکایت ہوئی بادشاہ وقت نے کہا کہ ایسی دوا ہو جو غذا بھی ہو یعنی دوا کی بدمزگی کی بنا پر وہ دوا نہ کھانا چاہتے تھے۔ حکیم شریف خان جو کہ باقاعدہ ابھی تک شاہی طبیب مقرر نہ ہوئے تھے بلائے گئے اور ان سے حالات بتائے گئے اور بادشاہ وقت محمد شاہ ثانی کی نبض حکیم صاحب نے دیکھ کر مندرجہ ذیل نسخہ لکھا۔

سیب تازہ لے کر کاٹ کر دو حصوں میں بیج نکال دیں اور قبض کشا دوائیں اس مقام پر جہاں سے بیج نکالے تھے بھر دی گئیں اور بھوبھل گاڑ دیا گیا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ پھل صاف کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پھل (سیب) خیال کر کے کھالیا۔ اب بادشاہ حکیم صاحب کا منتظر رہا کہ یہ اب دوا نما کوئی چیز دیں تب کوئی شے دیں۔

جب بادشاہ کو اجابت خوب کھل آئی تو بادشاہ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ اب دوا کی ضرورت نہیں ہے۔

حکیم شریف خان نے عرض کیا کہ حضور دوا تو کھلا دی گئی اور یہ دوا ہی کا اثر ہے کہ آپ کا

مرض (تکلیف) ختم ہوگئی ہے۔

دراصل سیب سے بیج نکال دینے کے بعد جو دست آور دائیں بھری گئی تھیں اس کا اثر (OSMOSIS) طریقۂ عمل کے ذریعے سارے سیب میں چلا گیا تھا۔

اسی طرح ایک بار پھر بادشاہ کو تکلیف ہوئی پرانی۔ تمام شاہی طبیبوں نے کھانا منع کر دیا۔ ایسے موقع پر حکیم شریف صاحب کو تکلیف دی گئی۔ اس کے قبل بھی بارہا مرتبہ حکیم صاحب کو متعدد موقعوں پر شاہی افراد کے علاج کے لیے بلوایا جا چکا تھا۔

حکیم شریف صاحب نے محمد شاہ عالم ثانی کی نبض دیکھی اور ایک حلوہ تیار کر کے دے دیا۔

گلقند رجس میں پانچ حروف ہیں

گل کے دو حروف یعنی پھول دو حصہ اور قند کے 3 حروف یعنی شکر 3 حصہ جب حکیم صاحب نے یہ حلوہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تو بادشاہ نے کہا۔

حلوہ خیلے خوب است

اور اپنے ہاتھ میں گل قند کا برتن لے لیا اور لذت کی وجہ سے سارا حلوہ کھا گیا۔ جس سے خوب کھل کر اجابت ہوئی اور مرض سے چھٹکارا مل گیا۔

حکیم مومن خاں مومن

1801 مطابق 1215ھ- جون 1851 مطابق جمعہ رمضان المبارک 1268ھ

شاعر باکمال و بے مثل طبیب

خاندان:

مومن خان مومن 1801 مطابق 1215ھ میں چیلوں کے کوچے میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ان کا آبائی مکان تھا۔ ان کے اجداد یعنی دادا حکیم نامدار خان اور حکیم کامدار خان کشمیر سے شاہ عالم کے زمانے میں چیلوں کے کوچہ دہلی میں (جو اکابرین کا مسکن اور مرکز تھا) آ کر آباد ہو گئے تھے اور جنھیں اپنی طبی لیاقت کی بنیاد پر دربار میں شاہی طبیب کا درجہ مل گیا تھا اور دربار سے وابستہ ہونے پر ان کے دادا کو خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا۔ یہ نسلاً کشمیری تھے اور قوم کے پٹھان تھے۔ ان کی پہلی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں احمدی بیگم سے ہوئی تھی۔ دوسری شادی شاہ محمد نصیر کی دختر انجمن النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ جس کی بنا پر یہ قیاس کیا جانے لگا کہ مومن خاں اہل سادات سے ہیں۔

صلہ خدمت کی بنا پر بادشاہ نے پرگنہ نارنول کے چند مواضعات جس میں موضع بلدیہ بھی تھا، بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ پھر بعد میں یہ دونوں خاندان نامدار خانی اور کامدار خانی کے ناموں سے

حکیم مومن خاں مومن

منسوب ہوئے ۔ یہ زمانہ مغلوں کے آخری دور کا تھا۔ انگریزوں کے زمانے تک یہ جاگیریں مومن خان کے خاندان والوں کے قبضہ میں رہیں۔ لیکن جب انگریزی سرکار نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جائداد ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثا حکیم نامدار خان مقرر کر دی جس میں سے حکیم مومن خاں مومن کو پانچ سو روپیہ ترکہ خاندانی ملنے لگا۔

پیدائش:

مومن کے والد حکیم غلام نبی خان کوچہ چیلان کے اپنے آبائی مطب میں مطب کرتے تھے ۔ چونکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا مدرسہ بھی اسی محلّہ میں تھا اور شاہ عبدالعزیز سے غلام نبی خان کے قدیمی خاندانی مراسم تھے ۔ شاہ صاحب کی رفاقت نے حکیم غلام نبی خان کو خاصا مذہبی بنا دیا تھا جس کے اثرات مابعد مومن خان پر بھی پڑے۔

چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ عبدالعزیز صاحب کو بلا لائے اور اُن سے بچہ کے کان میں اذان دینے کو کہا۔ شاہ صاحب نے نہ صرف اذان دی بلکہ بچہ کا نام بھی مومن خان رکھا۔ حالانکہ گھر کے دیگر لوگوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور اپنی پسند کا نام حبیب اللہ خان کشمیری رکھا لیکن نومولد نے شاہ صاحب کے نام سے نام پایا یعنی جب کامل طبیب ہو گئے ۔ شعر وشاعری کا ذوق ہو گیا اور شعر موزوں کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور ان کے استاد نیز دوستوں نے بھی یہ نام پسند کیا اور جب سب نے پسند کیا تو خدا نے بھی پسند کیا اور مقبول ہوا یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالح کی بدولت واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بہ شان مومن دنیا سے اٹھے۔

تعلیم وتربیت:

مومن کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا پھر ابتدائی تعلیم شاہ صاحب کے مدرسہ میں شروع ہوئی جو ان کے محلّہ کوچہ چیلان میں واقع تھا۔ اس کے بعد شاہ عبدالقادرؒ کے مدرسے میں ان کی خدمت میں پہنچائے گئے اور یہیں عربی، فارسی، حدیث، فقہ، منطق، معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔

مومن کو بچپن سے ان بزرگوں سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے وعظ بھی سنتے تھے ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ”ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ

صاحب کا وعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکات باطنی سے بھرا ہوا تھا۔ بے فرق اپنے والد بزرگوار حکیم غلام نبی خان کے مطب میں بیٹھ کر ان کے سامنے دہرا دیتے تھے۔" مزا تو یہ تھا کہ مومن نکات باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اس طرح بیان کر دیتے تھے جس کی جھلک حضرت شاہ صاحب کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے۔

غرض کہ مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے ان کے سائے میں نہ صرف مختلف علوم سے واقفیت پیدا کی بلکہ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ اسی لیے مومن زندگی بھر حضرت شاہ صاحب کے احسان مند رہے۔ انھوں نے ہمیشہ شاہ صاحب کا نام عزت سے لیا ہے اور ان کی تعریفیں کرتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات پر جو تاریخ انھوں نے کہی ہے اس کے اشعار سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ صاحب کو وحیدالزماں اور "یکتائے دوراں" کہا ہے۔

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبد العزیز ۔۔۔ بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے ۔۔۔ آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کے بہانے لے گیا ۔۔۔ کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہہ و بالا ہوا ۔۔۔ ٹوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن ۔۔۔ ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس در آفریں تعزیت میں میں بھی تھا ۔۔۔ جب پڑھی تاریخ یہ مومن نے آ کر بے بدل

دست بے داد اجل سے بے سرو پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس قطعہ کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت نے اُن پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ اسی لیے انھوں نے زندگی بھر ان کی شخصیت کو فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم اور علم و عمل کا منبع سمجھا۔ اس کی بدولت مومن میں بھی بعض ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جن کو ان کی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھنا چاہیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جیسے مینارۂ علم و ادب سے زانوئے ادب طے کرنے اور کسب فیض حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی پیشے طبابت کی جانب

متوجہ ہوئے۔ چونکہ مختلف اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی میں خاصی دست گاہ حاصل کر لی تھی۔اس لیے جب انھوں نے طبابت کی جانب توجہ دی تو اس میں بھی بہت جلد کمال حاصل کر لیا۔

طبی تعلیم:

چونکہ طب کے ماہر خود ان کے خاندان میں ان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم نبی خان اپنے زمانے کے ماہر طب اور اعلیٰ طبیب تھے۔انھیں سے مومن نے طبابت سیکھی اور ان کے دواخانے میں نسخہ نویسی یعنی مریض کو دیکھنا اور ان کے مرض کے مطابق نسخہ لکھنا سیکھا۔مومن نے کچھ وقت اسی طرح گزارا اور بہت قلیل عرصہ میں خود ایک اعلیٰ اور ایک طبیب کامل کی حیثیت سے وہ بہت جلد مشہور ہو گئے۔

کریم الدین نے لکھا ہے کہ" حکیم اس پایہ کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت سیکھنے میں گنواتے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پاتے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے طبیب حاذق سمجھے جاتے تھے اور ایک طبیب کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بھی لگاؤ تھا۔یہی وجہ ہے کہ دوسرے علوم وفنون سے بھی ان کی گہری دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔

مومن خان کے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم غلام حسن خاں کا مدائی خاندان سے تھے چونکہ دونوں اپنے زمانے کے مشہور و معروف اور جید طبیب تھے۔ان کی قدر و منزلت بہت تھی اور اپنے وقت کے مانے ہوئے طبیب تھے۔سرسید نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

ارشد تلامذہ حکیم شریف خان سے ہیں۔مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں حل ہوئے ہیں۔ غالب یوں ہے کہ اس جزو زماں میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز صاحب دہلوی اور مولوی رفیع الدین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ سے سالہا سال تک استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کیے۔شفائے کامل ان کے دست حق پرست میں ودیعت ہے۔راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردگی حاصل ہے۔"

اور اسی طرح حکیم غلام حیدر خان کے بارے میں لکھا ہے کہ" حکیم غلام حیدر خان موصوف

بصفات کمال کتب طبیہ میں مہارت۔ تام علاج ومعالجے میں دست گاہ تمام رکھتے تھے۔ تحصیل فن طب حکیم شریف خان سے کی تھی۔ اب عرصہ چند سال کا ہے کہ اس جہان سے عالم باقی کی طرف روانہ ہوئے۔

چونکہ حکیم کے معنی ہوتے ہیں تمام علوم پر قدرت رکھنے والا۔ خدا کی ذات کو چھوڑ کر دیگر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے لیکن حکیم اپنی علمی قابلیت کی بناپر تمامی علوم سے بہم واقفیت رکھتا ہے۔

دیگر علوم:

حکیم مومن کو علم نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ علم نجم کے اہل کمال سے اس علم کو سیکھا اور مہارت بہم ایسی پہنچائی کہ احکام سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاؤں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے اور نہ ہی تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا جاؤں اس کا جواب دیتے جاؤ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر ان کو تسلیم کرتے جاتے تھے۔

ان کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ واقعی نجوم کے بہت بڑے ماہر تھے'' واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بےقرار اور پریشان آیا۔ حکیم مومن خان مومن کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اس وقت موجود تھے خان صاحب (حکیم صاحب) نے اسے دیکھ کر کہا کہ ''تمھارا کچھ مال جاتا رہا ہے۔''؟ اس نے کہا۔ ''صاحب میں لٹ گیا'' کہا۔ ''خاموش رہو'' جو میں کہوں اسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اس کا انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کہ زیور کی قسم سے تھا؟''

''صاحب ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی!''

کہا۔ ''تم نے لیا ہے یا تمھاری بیوی نے، کوئی غیر چرانے نہیں آیا ہے۔''

اس نے کہا ''میرا مال تھا اور میری بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چراتے؟''

ہنس کر فرمایا ''کہیں رکھ کر بھول گئے ہوگے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔

اس نے کہا ''صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ فرمایا پھر دیکھو۔'' وہ گیا

اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھ لیا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ خان صاحب نے کہا۔ اسی گھر میں ہے تم غلط کہتے ہو۔

کہا۔ آپ چل کر تلاشی لے لیجیے۔ میں تو ڈھونڈ چکا۔

فرمایا۔ یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔

وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا پھر کہا۔ اس گھر کے جنوب کے رُخ ایک کوٹھری ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے اس کے اوپر مال موجود ہے جا کر لے لو۔ اس نے کہا مچان کو تو میں نے تین دفعہ چھان مارا ہے۔ وہاں نہیں ملا ہے۔ فرمایا۔ اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض جب گیا اور روشنی کر کے دیکھا ڈبہ اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔

منجم جس اعلیٰ پائے کے تھے ویسے ہی حکیم مومن خاں مومن ایک اچھے عامل بھی تھے گنڈہ تعویذ بھی دیا کرتے تھے۔ سارے شہر میں دھوم تھی۔ مومن خان کی علم نجوم سے واقفیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے جو انھوں نے دیباچہ تقویم سال ہزار دو صد و پن جاہ دو صد کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس دیباچہ میں انھوں نے علم نجوم کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ہی عالمانہ سیر حاصل بحث کی ہے۔

نجوم کے ساتھ ساتھ علم رمل سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ علم رمل میں ماہر و یکتا ہونے کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح ہو جائے گا۔

حکیم مومن خان مومن کے شاگرد رشید رمل عرش گیاوی جنھوں نے اپنے استاد پر حیات مومن تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

''حکیم مومن خان مومن کا دربار لگا ہوا ہے۔ مختلف علوم و فنون کے شائق دامنِ طلب پھیلائے ہوئے ہیں کہ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے۔ خان صاحب راقم کو فرماتے ہیں۔ بھئی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی۔ وہ زور لگا کر کہتے ہیں۔ حضور یہ ابھی جاتی ہے۔ خان صاحب شطرنج کھیل رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں اور دیوار کی طرف دیکھ کر حکم لگاتے ہیں۔ واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے۔ کیونکر جائے گی۔ دیکھو اور پھر دیکھو۔ گھنٹہ، دو گھنٹہ کے بعد بالا خانے پر جہاں خان صاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ریشمی کپڑوں کے دو گٹھر لیے ایک

سوداگر آتا ہے (خان صاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کم از کم پائجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے۔)

سوداگر جوں ہی مزدور کے سر سے ایک گٹھ کپڑے کا پورب والے دروازہ سے داخل ہو کر کمرے میں اتارتا ہے۔ گانٹھ سے ایک چھپکلی پٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے۔ پھر دونوں چھپکلیاں مل ملا کر ایک جانب کا راستہ لیتی ہیں۔

عرش گیاوی صاحب عالم تحیر میں حکیم مومن کا منہ دیکھتے ہیں وہ مسکرا کر فرماتے ہیں ہے۔" میاں ہنوز دلی دور است" تم چاہتے ہو کہ شاعری کی طرح اس کو بھی حاصل کر لوں تو یہ مذاق نہیں۔"

حکیم مومن نے ان علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی کا فن بھی حاصل کیا تھا۔ نظیر بین باز جو اس زمانے میں استاد تھا حکیم مومن کے انتقال پر بین اٹھا کر صرف اس لیے رکھ دی تھی کہ اب دلی میں اس کا کوئی قدر دان نہیں رہا۔

شطرنج کے کھیل کو بھی انھوں نے ایک علم اور فن کی طرح سیکھا تھا اور اس میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جایا کرتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خان سے قرابت دیرینہ رکھتے تھے اور شہر کے دو چار مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

شعری و ادبی ذوق:

یوں تو مومن نے کئی علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ اس لیے اپنی زندگی ـــــ میں سب سے زیادہ انھوں نے شعر و شاعری کے فن میں پھر اس کے بعد طب کے فن میں دلچسپی لی۔ انیسویں صدی کے دلی کے مخصوص شاعرانہ ماحول میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مومن کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی اور وہ اس فن کے ساتھ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی عمر سے ہی انھوں نے اس صنف کے ساتھ دل بستگی پیدا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس دل بستگی نے ان کے یہاں شعر کہنے اور شاعری کا شوق پیدا کیا۔ آس پاس اور گرد و پیش کے

شاعرانہ ماحول نے اس آتش شوق کو بھڑکایا۔

شاہ نصیر سے بہت مختصر عرصہ کسب سخن حاصل کرنے کے بعد خود اپنے علم کی بدولت استادی گر کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ اور تمام افراد پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ یعنی کہ مومن نے بہت جلد شعر و شاعری میں کمال حاصل کر لیا اور وہ تمام اصناف سخن پر قادر ہو گئے—انھوں نے غزلیں کہیں مثنویوں کی تخلیق کی۔ قصیدے لکھے، مسدس، مخمس، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند۔ سب کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی اور اس زبان میں بھی مختلف اصناف کو چار چاند لگا دیے اور بہت تھوڑے عرصہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا ایک قادرالکلام اور خوش فکر شاعر اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے زمانے کے استاد سمجھے جانے لگے۔

ان کے والد ماجد کا انتقال 1241ھ میں ہوا تھا۔ مومن نے ان کے انتقال پر ایک قطعہ تاریخ فارسی میں کہا۔

پدرم شد اسیر دامِ اجل   روحش از مسند آشیاں دربست
طائرے بود آسماں پرواز   رفت پر شاخسار قرب نشست
بہ من الہام گشت سالِ وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست

اور اردو میں ''شور انگیزی قلم سنہ چاک اشک فشاں در ماتم حکیم غلام نبی خان'' کے عنوان سے ایک تاریخ کہی۔

جہان نہ کوئی نکو بے جہاں   وحید زماں والد مہرباں
یہاں تک انھیں شوقِ خلد بریں   کہ ہر دم کو گنتے دم واپسیں
نہ دل میں نہ ان کے زباں پر کبھو   رضائے الٰہی سوا آرزو
غرض آ گیا وقتِ موعود جب   گئی تن سے وہ جان عشرت طلب
تاسف نے کیا کیا ستایا مجھے   قلق نے زمیں پر لٹایا مجھے
غضب جان کو بے قراری ہوئی   بری حالت ایسی ہماری ہوئی

کہ دُکھا دل عشرت آلود مرگ　　ہوئی زندگی اپنی محسوس مرگ
جہاں سے جب ایسا شفیق اُٹھ گیا　　تو جینے کا سچ ہے مزا کیا رہا
کہوں کیا کسی سے کہ کیا غم ہوا　　سزاوار اشفاق ماتم ہوا
دلے شعر کی جو ہوس ہے کمال　　اسی غم میں تاریخ کا تھا خیال

جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آہ
تو قد فازا فوزاً عظیماً کہا

ان قطعات تاریخ سے مومن کے والد کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک خصال آدمی تھے۔ لوگوں کو ان سے محبت تھی۔ زمانہ ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شفیق اور مہربان باپ تھے۔ انھیں ہر لحظہ خُلد بریں کا خیال رہتا تھا۔ رضائے الٰہی کے سوا ان کے دل میں کوئی اور آرزو نہیں تھی۔ غرض وہ بڑے نیک دل اور صاف باطن انسان تھے انھیں صحیح معنوں میں جنتی کہنا چاہیے۔

والد کے انتقال کے وقت مومن کی عمر 26 سال تھی۔ ظاہر ہے کہ والد کی وفات کے بعد وہ بے یار و مددگار ہو گئے ہوں گے اور ساری ذمہ داریاں انھیں اٹھانی پڑی ہوں گی۔ انشائے مومن میں انھوں نے ایک خط اپنی عمہ محترمہ یعنی حکیم احسن اللہ خان کی ماں کے نام لکھا ہے۔ اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سانحہ پر روشنی ڈالی ہے۔

نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ ایک مایہ ناز طبیب کی حیثیت سے بھی حکیم مومن خان مومن نے اپنے زمانہ میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔ وہ شاعری کو اظہار جذبات کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس سے کبھی کچھ حاصل کرنے کی سعی نہیں کی۔ انھیں کبھی کسی دربار میں داخل ہونے کا خیال نہیں آیا۔ لال قلعہ اس زمانے میں شاعری کا مرکز تھا۔ لیکن شاعری کے سہارے انھوں نے قلعہ تک جانے کی کبھی آرزو نہیں کی۔ خاندانی شاہی طبیب ہونے کا بھی کبھی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس زمانے کے کئی رئیسوں نے انھیں ملازم رکھنا چاہا لیکن انھوں نے ملازمت قبول نہیں کی۔ کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ کچھ حاصل کرنے کے خیال سے کسی کی مدح نہیں کی۔ ان کے زمانہ کے امرا و رؤسا اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ انھیں کس طرح اپنے پاس ملازم

رکھ لیں لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ ملازمت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو انھیں پسند نہ تھی۔ اسی لیے جب کبھی بھی ملازمت کا سلسلہ ہوا تو انھوں نے کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی غیور طبیعت تھی۔ وہ کسی کے دست نگر بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی۔ اس لیے ملازمت کی پابندیوں کو برداشت کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ مومن کو والی رامپور، والی ٹونک، والی بھوپال۔ والی جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے دوستانہ جال میں پھنسانا چاہا۔ مہاراجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار پر طلب کیا مگر وہاں بھی نہ گئے۔ زادِ راہ تک واپس کر دیا۔

ریاست ٹونک کے وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خان نصرت جنگ بہادر کو مومن سے نسبت خاص تھی۔ وہ ان کے پیر بھائی ہوتے تھے۔ انھوں نے بلانے کی بہت کوشش کی۔ مومن نے معذرت کے طور پر ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے انکار کر دیا۔ قصیدے کے یہ اشعار بڑے معنی خیز ہیں ؎

یاد ایام عشرت افسانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں　　کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون　　بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں　　کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندئ دیوار　　کیا ہوئے وہ عماد طولانی
نہ ملا کچھ نشانِ آب رواں　　خاک سارے جہان میں چھانی

میرے گوہر تمام نا سفتہ　　میرے یاقوت سب بدخشانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں　　جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں کہاں
میری تقریر کی سی تابانی

اسی طرح انگریزوں نے جو مدرسۃ العلوم دہلی کالج کے نام سے قائم کیا تھا اس کالج میں فارسی مدرس کی جگہ بھی حکیم مومن صاحب کو پیش کی گئی تھی لیکن اس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ مومن بڑے خود دار آدمی تھے۔ اس خودداری نے انھیں مادی ضرورتوں سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ کئی علوم کے ماہر تھے۔ چاہتے تو ان میں سے کسی کو بھی اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف شاعر تھے اور شاعری کو کسی مقصد براری کے لیے ذریعہ بنانا ان کے نزدیک مناسب نہیں تھا۔

حکیم مومن خان مومن کے نزدیک شعر و شاعری محض تفریحِ طبع کی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اس فن کے تمام پہلوؤں سے انھیں لگاؤ تھا۔ وہ اس فن کے تمامی اسرار و رموز کو جانتے تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ نہ انھوں نے ایسی باتیں کیں جو عام طور پر شاعر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے زمانے میں دلّی کی سرزمین پر بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی سے بڑا نہ سمجھا۔ ان کی چشمک کسی سے نہ تھی۔ سب ان کی عزت کرتے اور انھیں عزیز رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مومن پر کسی نے اعتراضات نہیں کیے۔ زندگی بھر ان سے کوئی الجھا نہیں۔

غالب کی شاعری کا اس زمانے میں شہرہ تھا اور بلاشبہ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر غالب تھے۔ ان کے سامنے شاعری کا اعلیٰ و ارفع تصور تھا اس لیے وہ ذرا مشکل ہی سے کسی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ غالب نے اپنے زمانے میں صرف حکیم مومن خان مومن کے جوہر کو تسلیم کیا ہے اور صرف ان کو ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر مانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حکیم مومن خاں مومن کی جب یہ غزل دیکھی جس کا مطلع ہے۔

اثر ان کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اور جب غزل کا یہ شعر ان کی نظر سے گزرا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ کاش حکیم مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دے

دیتا۔ غالب جیسے سخن شناس کا اپنے ہم عصر حکیم مومن کے متعلق یہ اظہار صاف ظاہر کرتا ہے کہ انھیں حکیم مومن خان مومن کی شاعری سے دلچسپی تھی اور وہ انھیں ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر خیال کرتے تھے۔

حکیم مومن خان مومن میں خودداری، خود اعتمادی اور خدا اعتمادی حد درجہ تھی۔ کبھی کسی امیر، رئیس یا دربار میں صلہ کے عوض نہ تو گئے اور نہ ہی کوئی توقع رکھی۔ اسی لیے ایک دو کے سوا کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کی خودداری کا ایک واقعہ درج ہے۔

راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں مشہور تھیں۔ وہ ایک دن اپنے مصاحبوں کے ساتھ سرراہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خان صاحب کا ادھر سے گزر ہوا۔ مصاحبوں نے کہا ''حکیم مومن یہی شاعر ہے۔'' راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ کچھ نجوم و شعر و شاعری اور امراض و علاج کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کرلاؤ۔ ہتھنی کس کرلائی گئی۔ وہ حکیم صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا مہاراج میں غریب آدمی ہوں اسے کہاں سے کھلاؤں گا؟ اور کیونکر رکھوں گا۔ مہاراج نے کہا 100 روپیہ اور دو۔ حکیم اسی ہتھنی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس کے کہ ہتھنی روپیہ کھائے اسے بیچ دیا۔ پھر حکیم صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکریہ لکھ کر راجہ صاحب کو روانہ کیا جس کا مطلع یہ ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

کوئی مدح کسی دنیادار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے اور شاعری کو دنیاوی عزت، دولت اور شہرت کے لیے وسیلہ بنانا انھیں ناپسند تھا۔ ویسے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ایسی دردناک اور دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔

پسماندگان:

حکیم صاحب کی پہلی زوجہ محترمہ سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری اہلیہ صاحبہ سے ایک دختر جن کا نام محمدی بیگم تھا اور کئی صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا انتقال حکیم صاحب کی حیات میں ہوا لیکن ایک صاحب زادے خواجہ نصیر خان کی عمر جب چھ یا سات سال کی تھی تب حکیم مومن خان مومن کا

انتقال ہو گیا تھا۔ دوسرے صاحبزادے عبدالوہاب جو عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد فقر کی جانب رجوع ہوئے ان پر عرصہ تک جذب کی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں انتقال کیا۔

شاگرد:

شاعری کے فن میں حکیم مومن نے اپنے زمانے کے بعض اہم شاعروں کی رہنمائی کی۔ ان کے کچھ شاگرد تو خاصے مشہور ہوئے ہیں جنھوں نے اس زمانے میں ہی خاصا نام پیدا کرلیا تھا۔ حکیم مومن کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے ان میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سرفہرست ہے۔

دیگر شاگردوں میں حکیم سید منور علی آشفتہ، میر عبدالرحمٰن آہی، خلف میر حسین تسکین، حکیم مولا بخش قلق میرٹھی، نواب عباس علی خان، بیتاب رام پوری، شیخ علی بخش بیمار، مرزا غلام فخر الدین تہور، قاضی نجم الدین برق، مرزا محمود بیگ راحت، سعادت علی خان راسخ، مرزا قربان علی سالک، ظہور علی ظہور، عظمت اللہ عظمت، اصغر علی خان نسیم، غلام علی خان وحشت، فخر الدین یاس قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے تو خود اعتمادی کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا۔ مومن نے اپنی پانچویں مثنوی حسین مغموم میں ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

کون سے شاگرد ہیں استاد فن — بے سخن ہے دل رہا جن کا سخن
وحشت و مضطر کرم تسکین و یاس — بے خودی میں بھی ہیں جن کے بدحواس
اکبر و عظمت، سرا فراز سخن — پایہ بالاتر برا افراز سخن
باعث ناز و غرور روزگار — میرے مشفق میرے مونس میرے یار
شیفتہ سر دفتر اہل قلم — نکتۂ خاطر نشاں جس کا رقم
بے عدیل و بے سہیم و بے بدل — بے نظیر و بے مثال و بے مثل
رازدانِ نکتہ ہائے کس مدان — مغنی کرسی نشیں خاطر نشان

ہم نفس ہمدم رضا جو دوست دار
شیفتہ دلدار والد جان نثار

غرض کہ مومن کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا۔ ان میں بعضوں کو وہ اپنا بہت اچھا دوست بھی

سمجھتے تھے اس زمانے کی زندگی میں ان کی شخصیتیں اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ مومن سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا اسی لیے ان سب کے دلوں میں حکیم صاحب کی بڑی عزت تھی اور خود مومن ان شاگردوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ان سب نے مل کر اس صحیح شاعرانہ ماحول کو پیدا کیا تھا جو مومن کو بہت عزیز تھا اور جس کے بغیر مومن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

انتقال:

ایک دن حکیم مومن خان کے مکان کی مرمت ہو رہی تھی اور سامان بنایا جا رہا تھا۔ یہ اس چھت کی منڈیر سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ چھت کی اونچائی کم تھی۔ یکا یک جھکے اور ٹھوکر کھا کر کوٹھے سے نیچے گر پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو فرمایا۔ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا مگر میرا علم کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے جیوں گا۔ لو مرنے کی تاریخ لکھ لو۔

دست و بازو بشکست 1268ھ

آخر وہی ہوا۔ جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا۔

عمر کے لحاظ سے جبکہ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان معلوم ہوتا تھا یہ محض ترپن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس پینتالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں ہوئی۔ حسب ہدایت ان کا جنازہ دلی دروازہ مہدیوں کے شہر خموشاں میں جو کہ دہلی کا پرانا گورستان ہے دفن کیا گیا ہے یہ وہی قبرستان ہے جہاں شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگ دفن ہیں۔

شہر کے امیر غریب، علما، فضلا، شہزادے سب جنازے کے ساتھ تھے اور سب نے ان کی جواں مرگی کا سوگ منایا۔ غالب تو غالب ذوق کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا۔

مومن کی موت ایک شاعر، ایک اختر شناس اور ایک رند پارسا ہی کی موت نہیں تھی۔ ایک آدمی، ایک انسان دوست اور ایک محب اسلام کی موت بھی تھی۔ ان کی موت نے سارے ماحول کو متاثر کیا۔ بڑے بڑے شاعروں نے تاریخیں کہیں اور اس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے انتقال کا دلّی کے ہر شخص کو غم ہوا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی دلکش شخصیت سے لوگوں کے دلوں

میں جگہ بنائی تھی۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کی شخصیت مرنجان مرنج تھی۔ وہ کسی کی اچھائی اور برائی میں نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی کسی سے لڑائی مول نہیں لی۔ کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ کبھی کسی سے الجھے نہیں۔ کسی کی ہجو نہیں لکھی۔

بقول غالب لوگ ان کے غم میں کعبے کی طرح سیاہ پوش ہونے کے لیے مجبور ہو گئے۔

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر   خون نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

یہ مشہور ہے کہ مرنے سے بہت پہلے مومن کو اپنی وفات کا علم ہو گیا تھا۔ علم نجوم اور رمل کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ تک نکال لی تھی۔ چنانچہ یہ تاریخ ان کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اردو کے صاحب دیوان شعرا میں صرف حکیم مومن خان مومن ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے دیوان میں بعض ایسے قطعات ہیں۔ جن میں انھوں نے طب کی تمام اصطلاحوں اور تشبیہات کو واضح کیا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے طب کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انشائے مومن میں حکیم احسن اللہ خان کے نام بعض ایسے خطوط ہیں جن میں انھوں نے طبی معاملات و مسائل پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔

مواد شوق زیارت تحمین مغز فلوس مداوا اخراج نمی یابد چہ چارہ و سدہ احشائے پیچ و تاب حسرت دیدار بہ سقمونیا تقریر دلکشائی کشاید چہ تدبیر خونی بہ دل جوش می زند۔ برص نامہ را در مانے نیست انا علم حرکت مذبوحی وارد۔ خامہ را جنبش شریانی............... برز نانم رفت۔

حکیم احسن اللہ خان کو مندرجہ بالا مکتوب اس طرح تحریر کیا ہے کہ طبی اصطلاحات سے بھرپور کوئی نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

اعصاب محوِ زلف شکن در شکن ہوئے
گردن میں ہے تشنج اقدام سے کزاز ـــــــ!
میں کیا کہوں حقیقت رنگ عذار زرد
سمجھو تو صفرت یرقان اس سے ہے مجاز ـــ!
منہ کا مزا یہ تلخ کہ شیریں ہے اس سے تو

بے وجہ سر کہ رو دیے زہاد حیلہ ساز —!
صندل سے درد سر کو کہا جب تلک جبیں
میں اس کے آستاں پہ نہ رگڑوں بصد نیاز—!
ہاں شوق سر کہ رو دیے ہندی صنم ہے خاک
صفرا شکن ہو سرکہٗ انگوری مجاز —!
یاں بو سے چاہیں گر زلف یار کے
ممکن نہیں کہ دانۂ آلود ہو چارہ ساز —!
لازم ہے تیرے سینے پہ رخسارِ ماہ وش
کافور کی ہو قرص سے کیا چارۂ فراز —!
جھوٹی شراب یار کی درکار ہے کہاں
تسکیں پذیر ہو عرق بید سے جواز —!
اس جائے بوسۂ شکریں لب کا کام ہے
گل قند سے ہو کیونکر طبیعت کو احتراز —!

ایک قطعہ میں اپنا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

ہوا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بے درد کو لکھوں
کہ مجھ کو تختۂ مشق اطبا کیوں بنایا ہے
نہ یہ سمجھیں سب نے کچھ علالت سے مرض پاویں
پڑے ہیں آپ مالیخو لیا مجھ کو بتایا ہے
کوئی کہتا ہے کہ آلود دکہ صفرا گرانی ہے
سیاہ رو نے سنہرا رنگ جو چہرے کے پایا ہے
کوئی کہتا ہے لشیر غش ہوا جب بے خودی چھائی
مجھے وسواس سر سام درد غیں سچ ہی آیا ہے

کوئی کہتا ہے میں سمجھا یہ سر جو اٹھ نہیں سکتا
ہزالِ روح انسانی نے یارو سر اٹھایا ہے
کوئی کہتا ہے حاشا ہے یہ گرمی غب خالص کی
اسی جاں سوز شعلے نے دھواں دل کا اڑایا ہے
کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے
رطوبت گر نہیں تو کیوں پسینے میں نہایا ہے
کسی قشعریر سے عفونت کا جو دھیان آیا
تو آخر دیکھنے کو بول کا شیشہ منگایا ہے
کوئی کہتا ہے یہ سکتہ ہے نظرو ں میں ہماری تو
کئی بار احمقوں نے لاکے آئینہ دکھایا ہے
کوئی اطراف کی سردی سے گرم شو رو غوغا یوں
کہ سینکو چارہ بالضد مکر ر آزمایا ہے
کوئی کہتا ہے دیکھو ممتلی ہے نبض مسہل دو
و لیکن پیشتر سے گر کوئی منضج پلایا ہے
کسی کو کم غذائی سے گماں ہے ناتوانی کا
تو کہتا ہے کہ جلدی لاؤ گر کچھ بھی پکایا ہے
کسی نے شربت ورد مکرر کی جو ٹھہرائی
تو کوئی سن کے مثل غنچۂ و گل مسکرایا ہے
کوئی کہتا ہے اب تو ہو گیا کیلوس بھی ناقص
کہ سالم ویسے ہی ہیں گرچہ ہونٹوں کو چبایا ہے
کوئی کہتا ہے پاؤں جو تشنج سے سکڑتے ہیں
کہ فطرت ہے یہی قانون میں میں نے پڑھایا ہے

کوئی کہتا ہے یہ سوزش عزیزی ہے کہ نسخے میں
سبھی اجزا ہیں بارد بندہ تحفہ ساتھ لایا ہے
کوئی کہتا ہے روغن دیجیے بادام مقشر کا
یہ نکتہ مرتے دم استاد نے مجھ کو سکھایا ہے
یہ سودا عشق ہے تیرا یہ تپ سوز غریبی ہے
کہ بے جا گرمئ صحبت نے تیرا جی جلایا ہے
صداع و صدر کا باعث بھی تیری بد دماغی ہے
اگرچہ مبحث ناصح نے بھی سر کو پھرایا ہے

یہ طویل قطعات صرف اس مقصد سے یہاں نقل کیے گئے ہیں کہ ان سے مومن کی یہ تصویر سامنے آ جائے کہ حکیم مومن خان صرف عشق و معشوق کے شاعر نہیں تھے، بلکہ کامل طبیب ہیں۔

ان میں طب کی تمام اصطلاحوں کا ذکر ہے۔ تمام امراض کا بیان ہے۔ مومن نے اپنے عم بزرگوار کو ان دونوں قطعوں میں بہت بڑا طبیب بتایا ہے۔ لیکن وہ بھی ان کے مرض کا علاج نہ کر سکے۔

تصانیف:

مومن کا اردو کلام تو ان کی حیات میں ہی ان کے شاگرد مصطفیٰ خان شیفتہ نے ترتیب دے کر اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر ان کی زندگی ہی میں شائع کر دیا تھا لیکن فارسی کلام حکیم احسن اللہ خان نے 1271ھ میں مومن کی وفات کے تین سال بعد مطبع سلمانی میں اپنے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔

مومن کے اردو کلیات میں صرف 9 قصیدے ہیں ان میں سے سات کے موضوعات دینی ہیں۔ صرف دو قصیدے دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں ہے۔ ان میں بھی مومن نے قصیدے کا روایتی انداز اختیار نہیں کیا ہے برخلاف اس کے ایسی باتیں زیادہ کہی ہیں جن سے ان کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدے عام قصیدوں کے مقابلے میں مختلف نظر آتے ہیں اور ان میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔

قصیدوں کے بعد اس کلیات میں غزلوں کا حصہ ہے اور اس حصہ میں مومن کی کل دوسو اٹھارہ غزلیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ غزلوں کے بعد قطعات، رباعیات اور چند معمے ہیں۔

دیوان مومن میں مومن خان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پھر کچھ تاریخیں ہیں ان تاریخوں کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ انشائے مومن۔ مومن کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے ان خطوط کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا تھا اور اپنا ایک دیباچہ شروع میں درج کیا ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل کتاب ہے۔

حکیم مومن خاں مومن طبیب تو تھے ہی لیکن وہ پیدائشی شاعر تھے اور غزل ان کا خاص میدان تھا۔

طبی معرکے:

حکیم مومن خان مومن اپنے اجداد کے آباد مطب میں مریضوں کا معائنہ کرر ہے تھے کہ ایک خاتون جوار باب عیش ونشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں تشریف لائیں اور مستورات کے گوشہ میں جا بیٹھیں۔ وہ غائبانہ طور پر حکیم مومن خان مومن کی رنگ شاعری کی مداح تھیں اور علاج ومعالجہ کی معتقد۔

حکیم صاحب کے چند شاگردان رشید جو عام طور پر دوا خانہ کی زینت بنے رہتے تھے اور احباب جو گاہے گاہے مطب میں آکر حکیم صاحب سے فیض یاب ہوتے تھے۔ مریضوں سے رخصت ہونے کے بعد دریافت کیا کہ فلاں خاتون کون تھیں؟

مریضوں کے اژدہام میں حکیم صاحب بغور کسی مریض پر ذاتی حیثیت سے توجہ نہ دے سکتے تھے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا کون مریضہ؟

احباب نیز شاگردوں نے جواب دیا وہی خاتون جو گوٹہ لچکے کا ڈوپٹہ پہنے تھیں۔

حکیم صاحب فوراً سمجھ گئے کہ یہ ان مریضہ کی جانب اشارہ کرر ہے ہیں جوار باب عیش ونشاط کے طبقہ سے متعلق تھیں۔

شاگردوں کی موجودگی کے پیش نظر احتیاطی طور پر جواب دیا اچھا وہ۔ خمیرہ گاؤزبان سادہ بورق نصرۃ آنخجتہ۔

ایسے ہی ایک موقع پر حکیم مومن نے مریض کو اپنے مطب میں دیکھ کر ایک نسخہ تجویز کر دیا اور عطار خانے سے دوائیں خرید کر استعمال کرنے کو کہا۔ چند یوم کے بعد وہ مریض حکیم مومن خان کے آبائی مطب میں پھر حاضر ہوا۔ جب اس مریض کا نمبر آیا تو حکیم صاحب نے نسخہ طلب کیا۔ مریض نے بڑے تعجب سے کہا کہ حکیم صاحب وہ نسخہ تو اُبال کر پی گیا۔ اور دو یوم برابر پیتا رہا ہوں۔ نصف افاقہ ہوگیا ہے۔ وہی نسخہ پھر دے دیجیے۔ تاکہ دو یوم اور پی لوں جو نصف مرض رہ گیا ہے تاکہ وہ بھی ختم ہو جائے۔ حکیم صاحب نے مریض کی فرمائش کی تکمیل کی اور نسخہ لکھ کر دے دیا۔

اس مریض نے دو یوم مزید حسب سابق یہ نسخہ بھی استعمال کیا اور فائدہ ہوگیا۔

شاگردوں کے استفسار پر جواب دیا کہ چونکہ اس کو اعتماد ہوگیا تھا اس لیے ایسا ہی کیا۔ اگر ٹوکتا یا غلط استعمال کرنے پر اس کو ہدایت دیتا تو وہ نصف افاقہ سے محروم رہ جاتا۔

چونکہ حکیم مومن خان مومن عملیات نیز تعویذ دینے کے لیے مشہور تھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اسی عمل کے دباؤ میں ہوا ہو۔

حکیم محمود خاں دہلوی

1235ھ مطابق 1816   1309ھ مطابق 1900

حاذق طبیب اور ماہر جنسیات

مسیح الملک حافظ اجمل خان کے والد گرامی حکیم محمود خان طب کی ان مایہ ناز گرامی قدر ہستیوں میں ہیں جنھوں نے غدر 1857 میں غربا، مساکین ومظلوموں کا بھرپور ساتھ دیا اور اس پاداش میں جیل کی تنگ وتاریک سنگلاخ مقام پر بند بھی رہے۔

قومی یک جہتی اور چھوا چھوت کے خلاف حکیم محمود خان نے اس وقت تحریک چلائی جب اس جذبے کا وجود نہ تھا۔

دہلی کی تاریخ بھی ایک عجیب تاریخ ہے اس کی تاریخ بے شمار انقلابات خوں چکاں واقعات۔ ناگہانی آفات اور ہر طرح کے خون آشام وحادثات سے پُر ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جس نے اتنے مصائب دیکھے ہوں۔ زمانہ اور رفتار زمانہ کے مطابق سرد وگرم سہا ہو۔ یہ دلی اور صرف دلی ہی کی قسمت ہے کہ اس نے یہ تمام انقلابات خود دیکھے ہیں۔

خاندان:

حکیم شریف خان کے وارثِ طب حکیم صادق خاں کے تین فرزند تھے (1) حکیم غلام محمد

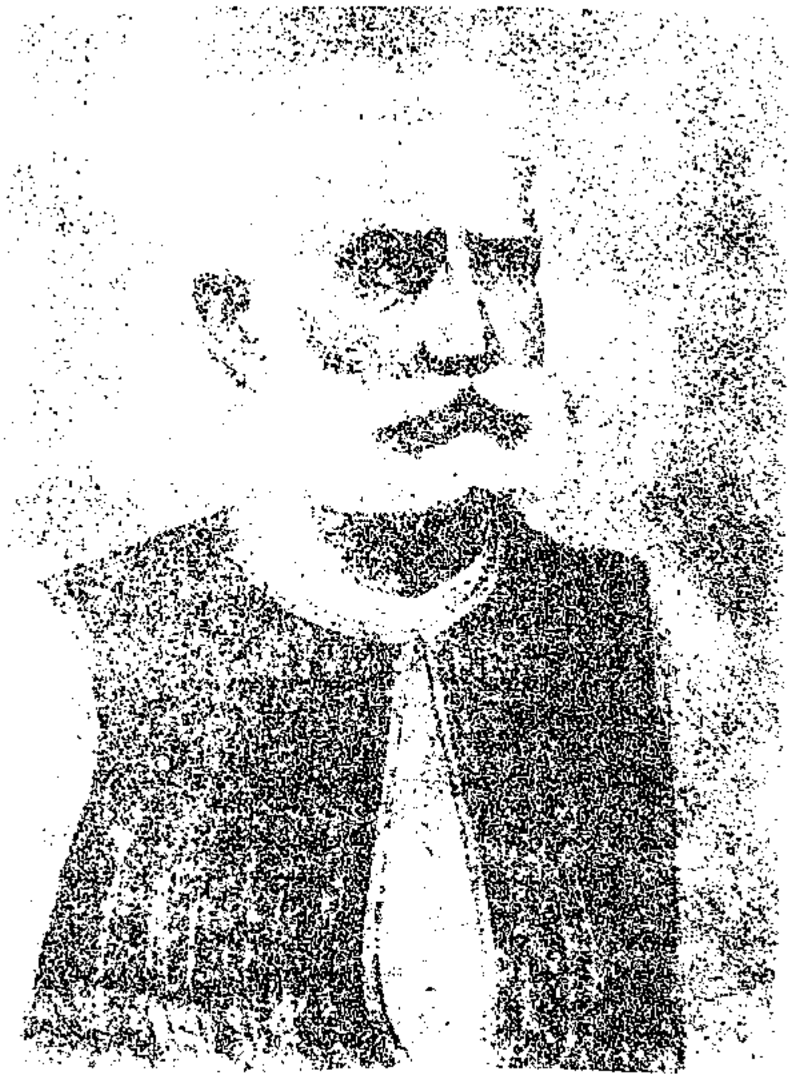

حکیم محمود خاں

خان (2) حکیم غلام محمود خان (3) حکیم غلام مرتضٰی خان۔ اول حکیم غلام محمد خان اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں 44 سال کی عمر میں رحلت فرما گئے تھے اور آخری صاحبزادے حکیم غلام مرتضٰی نے 1292ھ بہ عمر 54 سال میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

یہ اپنے گھر کے اب تن تنہا وارث اور اپنی خاندانی عظمتوں کے امین ٹھہرے اور ان کا خاندان تو سرزمین ہندوستان کا مشہور خاندان۔ خاندان شریفی ہی ہے۔

پیدائش:

حکیم محمود خان کی پیدائش اکبر شاہ ثانی کے زمانے 1235ھ میں بمقام دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد اعظم حکیم صادق خان طبیب شاہی کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح دربار شاہی سے وابستگی قرار پا گئی تھی۔

تعلیم تربیت:

حکیم شریف خان کے پوتے اور حکیم صادق علی خان کے منجھلے فرزند تھے۔ خاندانی جاہ و جلال، عظمت و شوکت خاندانی وقار غرضیکہ خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا ایسے میں ان کی تعلیم کی ابتدا گھر کے علمی و ادبی ماحول میں شروع ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مزید عربی و فارسی کی تکمیل اپنے زمانہ کے لائق و فائق استاد و شاہ عبدالقادر اور حافظ مولانا عبد الرحمٰن صاحب سے حاصل کی۔

تعلیم طب:

طب کی تعلیم کی ابتدا اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد اور پھر اپنے والد حکیم صادق علی خان سے حاصل کی۔

حکیم محمود خان کو اپنی خاندانی عظمت کا ورثہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ملا۔ جس کو انھوں نے خود اپنے ایک خط میں اس طرح بیان کیا تھا۔

> از ابتدائے طفولیت تا عنفوان شباب بہ لہو ولعب گزرانیدم ہر قدر کہ جناب فیض مآب۔ فطانت آیات۔ کرامت انتساب۔ حضرت قبلہ کونین و کعبہ دارین ولی نعمی ام مغفور............تعلیم فرمودہ بودند بہ ہجوم دیگر مکروہات

فراموش کردم کہ ناگاہ بعمر کمتر از 14 سال صرصر مخالفت درزند و موج فتن در رسید۔ اعنی جناب ممدوح ودیعت حیات بجان آفرین سپردند و عہدہ طبابت نامزد خاندانی بنام ایں گمنام مقرر گشت از آنکہ جناب بھائی صاحب قبلہ حکیم غلام محمد خان صاحب در حیات جناب ممدوح رحلت فرمائے عالم بقا بودہ باشند و برادر از جان ہنر حکیم غلام مرتضیٰ خان بوجہ ملازمت بہ سرکار پٹیالہ قیام داشت.....................

قومی وملّی کارنامے:

دہلی کے پُر آشوب دور میں جبکہ چہار جانب بدامنی، خون خرابہ تھا۔ علم وادب علوم وفنون کا نہ کوئی مرکز تھا اور نہ ہی گہوارہ۔ ایسے حالات میں دیگر خاندانوں اور اہل علم وفضل کے ساتھ خاندان شریفی کے افراد بھی دیسی ریاستوں سے وابستہ ہونے لگے تھے اور دہلی کے دیگر خاندانوں کے ساتھ ساتھ خاندان شریفی کے بھی بیشتر افراد وارباب علم وفن و ہنر لکھنؤ، رام پور، پٹنہ، کلکتہ اور حیدرآباد میں منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایسے حالات میں دیسی ریاستوں کے قدر دان والیان ریاستوں نے عہد مغلیہ کے ان جواہر پاروں اور جواہر ریزوں کو جہاں پایا چن لیا۔

حالات کی نزاکت اور دہلی کے متعدد بار لٹنے اجڑنے سے تنگ آکر حکیم محمود خان کے برادر کلاں حکیم غلام محمد خان پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ پر مہاراجہ پٹیالہ کے وہاں منسلک ہو گئے تھے اور وہیں رہنے لگے تھے۔ اس کے بعد ان کے صاحبزادے غلام اللہ خان بعد میں جن کی دختر سے حاذق الملک حکیم اجمل خان کی شادی ہوئی تھی اور چھوٹے بھائی حکیم مرتضیٰ خان بھی پٹیالہ سے عرصہ تک منسلک رہے۔ خود حکیم محمود خان ریاست جند کے راجہ نریندر بہادر کے معالج خصوصی تھے اور ریاست جند سے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔

حکیم غلام محمد جوان کے نہ صرف بڑے بھائی ہی تھے بلکہ محسن اور مربی بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ استاد طب بھی۔ حکیم غلام محمد نے حکیم محمود خان کا غدر 1857 میں بہت ساتھ دیا اور ان حکیم غلام محمد کے خاندانی اثرات نے خاندان شریفی کو تباہی سے بچا لیا ورنہ 1857 کے ایسے پر آشوب دور میں خاندان شریفی اور دلّی والوں کے مرکز میں شریف منزل تباہ و برباد ہو گئی ہوتی۔

غلام محمد نے مختلف علوم وفنون میں متعدد کتاب تحریر کی ہیں۔ جس سے ان کی حذاقت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تصانیف:

خاندان شریفی میں حکیم محمود خان وہ پہلے حکیم ہیں جنھوں نے زندگی بھر اپنا روز نامچہ لکھا اور یہ ایک ایسا بیش بہا ذخیرہ وہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ گئے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خانون شریفی وہ کتاب ہے جس میں خاندانی حالات درج تھے۔ اکثر روایات کا سرچشمہ حکیم محمود خان کی یہی تصنیف ہے۔ لیکن بعض روایات وحکایات زیادہ معتبر نہیں معلوم ہوتی ہیں۔

حکیم محمود خان کا سب سے بڑا کارنامہ میدان تصنیف وتالیف میں یہ ہے کہ انھوں نے زمانہ قدیم میں جنسیات جیسے خشک اور اچھوتے موضوع پر نہ صرف خامہ فرسائی کی بلکہ ایک ایسی جامع اور منفرد کتاب لکھی جو آج کے دور میں بھی اتنی ہی کارآمد اور مفید ہے جتنی قبل از زمانہ تھی۔

1- ضیاء الابصار فی حدی البصار فی حدی الباہ۔

2- کارنامۂ عشرت۔

ان دونوں کتابوں کا ایک ہی موضوع ہے۔ یعنی جنسی مسائل اور امراض باہیہ ونظریات باہیہ۔ حالانکہ ان کے اجداد بھی اپنی تمام تر کوششیں تجربات باہیہ پر صرف کرتے رہے تھے لیکن حکیم محمود خان نے انھیں انداز سے ان امراض کی ماہیت اسباب وعلامات پر زور صرف کیا ہے وہ صرف اور صرف انہی کا حصہ تھا۔ حالانکہ آج یہ موضوع جنسیات ہو کر ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

خدمات:

حکیم غلام محمود خان اپنے دور کے مشہور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے خدادوست متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ حکیم محمود خان کی شرافت اور اعلیٰ طبیعت کا اندازہ اس سے ہوگا جو انھوں نے اپنے خاندان کے لیے فارسی میں تحریر کی تھی۔

تحریر حسب ذیل ہے۔

انصاف کا دامن نہ چھوڑیں۔ یگانگت اور دوستی کا خیال رکھیں۔ ہرگز کسی آدمی کو برائی سے یاد نہ کریں۔ غیبت نہ کریں۔ مال حلال ذریعہ سے حاصل کریں۔ خصوصا یتیم کے مال کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جوئے، شراب، چوری اور دیگر نشہ آور اشیا سے پرہیز کریں۔ بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ محتاج اور پسماندہ افراد کی خاص طور پر مدد کریں۔ مرض کی تشخیص کے بغیر ہرگز علاج نہ کریں۔ اس سے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں گرفت ہوگی۔

حکیم محمود خان کے مزاج میں غصہ کے ساتھ حد درجہ غیرت تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو اپنی حمیت کو قربان کرنا گوارا نہیں کرتے تھے ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک بڑے والی ریاست نے ان کو گراں قدر معاوضے پر علاج کے لیے اپنی ریاست میں بلایا۔ مہاراجہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ جیسا کہ آج کل چھوا چھوت والے مانتے ہیں۔ حکیم صاحب حسب معمول وعدہ کے بموجب بوقت صبح مریض یعنی مہاراج کی نبض دیکھنے حاضر ہوئے۔ نبض دکھا کر حسب معمول مہاراجہ نے ملازمین سے کہا وہ مہاراجہ کا ہاتھ دھلائیں۔ حکیم محمود خان یہ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے مہاراجہ کے سامنے اپنے ملازم سے کہا کہ پانی لاکر میرے ہاتھ اور بازو دھلاؤ کیونکہ مہاراجہ کا ہاتھ چھو جانے سے میرا ہاتھ نجس ہوگیا ہے۔ مہاراجہ یہ سن کر حیران اور متحیر رہ گیا۔ کیونکہ کسی ریاست میں فرماں روائے ریاست کے سامنے ایسا کہنے کی کسی میں جرأت کہاں تھی۔ اس کے بعد (محمود خان) ہاتھ دھلوا کر وہاں سے چل پڑے اور مہاراجہ کے آدمیوں کے اصرار پر بھی وہاں نہ رکے۔

اسی طرح ایک واقعہ مزید ہوا۔ چونکہ حکیم محمود خان پرانے زمانے کے ایک نہایت باوضع بزرگ اور غربا پر بے حد مہربان حکیم تھے۔ ان کا مطب بلاشبہ مرجع خلائق تھا۔ ان کے مطب میں امیر غریب سب کو ایک جیسی جگہ ملتی تھی بارہا مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی رئیس نے موجود مریضوں میں سبقت کر کے کسی غریب سے پہلے نبض دکھانی چاہی اور حکیم صاحب نے اسے سخت زجر و توبیخ کی۔ جو امرا حکیم صاحب کی عادت سے واقف تھے وہ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ حکیم صاحب کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب بھی کبھی اہل زر سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور والیان ریاست اگر علاج کے لیے بلاتے تھے تو ہزار خوشامدوں اور التجاؤں کے بعد تشریف لے جایا کرتے تھے۔

مذہبی رجحانات:

ان سب کے ساتھ ساتھ حکیم محمود خان کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ غدر 1857 کی آزمائش سے جس طرح گزرے وہ ایک خداترس عالم باعمل اور صوفی صافی فرد کے لیے مناسب تھی۔

فن طب میں اگر ان کو تمام علمی مسائل مختلفہ میں علم الیقین اور درک تھا تو دوسری جانب ان کی عملی حیثیت شہرہ آفاق تھی۔ یہ آن بان کا بزرگ اگر دن بھر خلق اللہ کی خدمت فی سبیل اللہ کرتا تھا تو رات بھر اپنے مالک کے سامنے سر بہ سجدہ نظر آتا تھا حکیم محمود خاں نے اپنی ذات کو جامع صفات و کمالات بنا کر بے شمار انعامات الٰہی کا واقعی حقدار بنالیا تھا۔

حکیم محمود خان مرحوم کا پروگرام رات دن میں یہ تھا کہ وہ رات کے دو بجے بیدار ہو کر تہجد پڑھتے تھے اور صبح تک درود و وظائف میں مشغول رہتے۔ صبح کو اول نماز پڑھ کر گھوڑے پر سوار ہوتے اور محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتے۔ بعد ازاں واپس ہو کر صبح سات بجے مطب میں تشریف لاتے تھے اور دن کے 12 بجے تک مطب فرماتے تھے اس کے بعد کھانا کھا کر احباب کے بے تکلف جلسۂ مذاق اور شطرنج میں مشغول ہو جاتے تھے۔ شام کو بعد عصر مطب شروع کرتے تو شب کو 8 بجے ختم کرتے تھے۔ اس کے بعد شب کو کھانا کھاتے اور نماز عشا اور وظائف سے فارغ ہو کر 11 بجے رات کو آرام فرماتے تھے۔ دن کے کھانے سے فارغ ہو کر روزانہ دو گھنٹے تک پہلے اپنا روزنامچہ تحریر فرماتے۔ پھر احباب کی جانب متوجہ ہوتے تھے وہ صوم وصلوٰۃ اور شرعی اوامر ونواہی کے پابند تھے۔ نیز درویش صفت درویش مشرب اور صاحب نسبت فرد تھے۔

خود حکیم اجمل خان نے اپنے والد ماجد حکیم محمود خان کی نسبت فرمایا ہے کہ" اُن کو فن طب کے جملہ مشکل اور پیچیدہ اختلافی مسائل کے متعلق علم الیقین حاصل تھا۔ ان کا فیصلہ ناطق اور شک وشبہ کی گنجائش سے بالاتر ہوتا تھا۔

حکیم محمود خان ایک جامع صفات و کمالات طبیب ہی نہیں تھے بلکہ علمی کمالات اور روحانیت کی وجہ سے قدرت نے ان کو ایسا دست شفا عطا کیا تھا جس کی وجہ سے دنیائے طب میں ان کو اپنے اسلاف سے بھی زیادہ ممتاز اور سربلند کر دیا تھا۔

1857 کے لرزہ خیز مناظر اور مظالم حکیم محمود خان نے خود اپنی چشم تر سے دیکھے اور اس سے متاثر ہوئے کیونکہ وہ ایک بہت حساس دل وفطرت کے مالک تھے اور غریب وغربا کے ہمدرد۔ طوائف الملوکی کے اس دور میں انھوں نے عوام کے ساتھ بڑی ہمدردی کا برتاؤ کیا تھا۔ انگریزی حکومت میں جو بھی فرد کسی بھی شک یا شبہ میں پکڑ لیا جاتا تھا تو بلا تردد اس کی جائداد ہی نہیں بلکہ حکم فرنگی ایسٹ انڈیا کمپنی اس مال واسباب بھی ضبط کر لیا جاتا تھا۔ اوباش وآوارہ گرد جس کی شکایت کر دیتے وہ ایک عذاب میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ غرضیکہ غدر میں نہ کسی کی داد نہ فریاد سنی جاتی تھی۔ عجیب بے سروسامانی کی کیفیت اور حالت تھی۔ ان کے بڑے بھائی کی درخواست پر مہاراجہ پٹیالہ نے تھوڑی سی فوج متعین کر دی تھی۔ شریف منزل کی محفوظیت کے لیے۔ اس لیے دہلی کے مظلوم باشندگان نے شریف منزل کو جائے پناہ خیال کر لیا تھا جو فرد شریف منزل کی حدود میں داخل ہو جاتا وہ اپنے کو دارالامان میں تصور کرتا تھا۔

8 جون 1857 کو دلّی پر جب باغیوں کا قبضہ ہو گیا اور پھر 14 ستمبر کو جب فرنگیوں نے دوبارہ قبضہ اور فتح پائی تو عرصہ تک دہلی کا ماحول مثل جہنم رہا اور انقلابیوں کی شکست کے بعد جب افراتفری میں دہلی چھوڑ کر بھاگے تو ہزار ہا افراد نے حکیم محمود خان کی حفاظت میں خاندان شریفی کے گڑھ شریف منزل میں اپنا مال وزر چھوڑ دیا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم محمود کے پاس اپنا قیمتی سامان زیور اور جواہرات محفوظ کرنے کے لیے لاتے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھری کی جانب اشارہ کر دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ۔ چنانچہ یہ کوٹھری ستم رسیدہ لوگوں کے پلندوں، گٹھریوں اور صندوقوں سے چھت تک بھر گئی۔ حکیم اجمل خان کے بھتیجے مسیح الملک ثانی حکیم محمد احمد خان' 'اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپے سے زیادہ کی امانتیں جمع ہو گئی تھیں۔ بعد غدر جب اس مال واسباب کے مالک اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم محمود خان نے اس کوٹھری کا دروازہ کھلوا دیا اور فرمایا جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کر لے جائے۔

اسی طرح اطراف دہلی میں عموماً اور بلی ماران محلہ میں خصوصاً روسا وشرفا کی جو جائدادیں بحق سرکار ضبط ہوئیں ان کے لیے محمود خان حکام کے پاس جاتے تھے اور ان جائدادوں کو واگزاشت کرا دیتے تھے اور جو لوگ گرفتار ہو جاتے تھے انھیں رہا کرانے کے لیے کوتوالی جایا

کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ یہ میرے عزیز ہیں ان کو رہا کرا لیتے تھے۔ حالانکہ عام طور پر عدالت اور کچہری میں جانے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ان سب کا خاص سبب خود حکیم محمود خان کا شخصی اعزاز اور عوامی اثرات تھے۔

عوامی امانتیں جو حکیم محمود خان کی جائے رہائش اور غدر کے ستائے ہوئے لوگوں کی جائے پناہ و دار الدین شریف منزل میں جمع ہو گئی تھیں۔ بعد غدر جو لوگ یہ امانتیں لینے آئے ان کو بلا تردد دے دی گئیں اور جو نہ آسکے حکیم محمود خان نے ان کو تلاش کر کے ان کا سامان ان تک پہنچایا۔ اس ہمدردی کا نتیجہ خاطر خواہ خراب نکلا اور جب حکومت وقت کو مسلسل یہ اطلاعات ملتی رہیں کہ حکیم محمود خان خود مسلمان باغیوں کو اپنی جائے پناہ میں پناہ رہے ہیں۔ حکیم وقت نے واقعہ طلبوں کی اس جھوٹی بات پر یقین کر لیا وہ دوڑ لے کر آ گیا اور ساٹھ افراد کو جو شریف منزل میں پناہ گزیں تھے پکڑ کر لے گیا۔ یہ واقعہ 2 فروری 1858 کا ہے۔ 5 فروری تک سب لوگ زیر حراست رہے۔ اسی تاریخ کو حکیم محمود خان اپنے دو عزیزوں کے ساتھ چھوڑ دیے گئے۔ دوران حراست ان کی پوری عزت کی گئی۔ مرزا غالب جو حکیم محمود خان کے پڑوسی تھے اور قریب ہی کے مکان میں مقیم تھے انھوں نے اپنی تصنیف دستنبو میں نقل کیا ہے۔

1858 کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ شہر پھر واپس آنے لگے۔ اسی اثنا میں حاکم شہر کو چغلی خوروں نے خبر دی کہ راجہ نریندر بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خان کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں۔ چنانچہ 2 فروری سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑ لے کر آ گیا اور مالک خانہ کو مع 60 آدمیوں کے پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبد الحکیم خان کو واپسی کی اجازت ہو گئی 12 فروری کو کچھ لوگ چھوڑ دیے گئے۔ 13 فروری کو تین اور نے رہائی پائی.........

اس واقعہ کا ذکر غلام رسول مہر نے جو غالب کے ہمعصر اور رفیق دوست تھے اپنی کتاب غالب میں بھی کیا ہے مگر ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

چونکہ حکومت وقت کو کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اس لیے اور خاندانی اثرات اور ذاتی شخصیت ایسے موقع پر کام آئی ورنہ اگر ثبوت بغاوت مل جاتا تو نہ صرف زندہ بچنا محال ہو جاتا بلکہ شریف منزل کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی۔

اس پر آشوب دور میں شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خان جن پر انگریزوں کی جاسوسی اور بہادر شاہ ظفر کی تباہی کا الزام تھا ان کی جانب سے عوامی بدگمانی بڑھتی جارہی تھی۔ دوسری جانب خاندان شریفی کی خدمات اور حکیم محمود خان کا زمانہ غدر میں باشندگان دہلی کے ساتھ ہمدردیاں جن کی وجہ سے حکیم محمود خان کی عوامی مقبولیت اور حذاقت ولیاقت کی بنا پر حکیم محمود خان اعظم کا مطب بہت کامیاب ہوگیا۔

حکیم محمود خان کو خدا نے حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں عطا فرمائے تھے۔

ترکمانی خون سے ان کا چہرہ روشن تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی مردانہ وجاہت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ لانبا قد، متناسب اعضا، جسم کی رنگت سرخ وسفید، بارہ مہینے گرمی اور جاڑے وہی شربتی کا انگرکھا اور سفید پگڑی۔ یہ ان کی وضع قطع تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو وضع قطع بالکل سپاہیانہ ہوتی تھی۔

وفات:

1309ھ مطابق 1900 میں بعمر چوہتر (74) سال ان کا انتقال پر ملال ہوا اور یہ راہی ملک عدم ہوئے۔ تمام ملک میں ان کی رحلت پر ماتم ہوا۔ ارباب علم و دانش خاص طور پر متاثر ہوئے۔

قطعات تاریخ وفات اور عقیدت کے نذرانے پیش کیے گئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے ان کے انتقال سے متاثر ہو کر ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کی اردو ادب میں ایک نمایاں اور منفرد حیثیت ہے۔ اس مرثیہ کے ابتدائی بند حکیم محمود خان کے متعلق تمام احساسات کے ترجمان ہیں۔

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے　　واعظان قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے سحر اپنا دکھا کر چل دیے　　کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گیا سیل فنا اس کو بھی اے دلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی   ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی   اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کی یاد تو

اس مرثیہ میں مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے حکیم محمود خان کے پیشۂ طبابت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا کتنے موثر اور دل نشین اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارا الشفا   خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اس اس کے در سے ملتی تھی دوا   فکر نذرانہ کا تھا اس کو نہ شکرانہ کا تھا
اس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول کھل جاتا تھا مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا   تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا   کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اس کے سوا
کرتے ہیں جو دعوئ ہمدردئ نوع بشر
اس نے باطل کر دیے تھے ان کے دعوے سر بسر

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں کو خاص و عام سب   پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب   اس کے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب
سوء تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم محمود خان عوامی طور پر کتنے مقبول اور معروف تھے۔ شاعر کی آواز قوم کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس سے جہاں حکیم صاحب کی قابلیت عزت اور شہرت کا پتہ لگتا ہے وہیں ارباب علم و فن و ہنر کا حکیم محمود خان سے قربت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

پسماندگان:

حکیم محمود خان نے اپنے بعد پانچ اولادیں چھوڑی تھیں۔2دختران اور3برخوردار جوان کی علمی، ادبی، فنی امانتوں کے حقیقی وارث ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنے باپ کے نام کو مزید چمکایا۔
سب سے بڑے حکیم عبدالمجید خان، منجھلے حکیم واصل خان اور سب سے چھوٹے حکیم اجمل خان۔

سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خاں نے اپنی اولاد کے لیے چھوڑی وہ صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک اخلاق انسانی اور جذبۂ خدمت خلق۔ دوسرے اپنے فن کی محبت۔ دنیا کے مال و متاع سے انھوں نے بہت کم حصہ پایا تھا۔

طبی معرکے:

حکیم محمود خان کے مطب میں مرضاء کی لائن لگتی تھی اور ہر مریض لائن میں بیٹھ جاتا تھا۔ جب اس کا نمبر آتا تو دکھاتا تھا۔ امیر غریب کی تفریق نہ تھی۔ ہاں اگر کوئی پیچیدہ یا سخت مریض آجاتا تو اس کی بات دوسری تھی۔

ایک دن حکیم صاحب کو مریض نمبر سے اپنا ہاتھ دکھا رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے رئیس نے جو باہر سے خدم و حشم کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب میں آئے تھے اور انھوں نے امارت کے گھمنڈ میں یہ جرأت کی کہ ایک غریب شخص جو اپنا ہاتھ حکیم صاحب کی جانب نبض دکھانے کے لیے بڑھا چکا تھا اس غریب کو پیچھے ہٹا کر وہ خود آگے بڑھ گئے تھے۔ پھر حکیم صاحب نے ان بڑے امیر و کبیر شخص پر ایسی خفگی ظاہر کی کہ شائد زندگی میں پہلی بار اس سرشار نشۂ دولت کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس خدا کی خدائی میں ایسی جگہ بھی ہے جہاں غریب کا حق مارنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ان حکما کے واقعتاً انداز سوچ و فکر دیانت داری اور غربا پرستی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے وہیں طب کی جادوگری کا بھی احساس ہوتا ہے۔

حکیم محمود خان کے سینکڑوں طبی معرکے اور فنی معجزے ہیں ان کا ایک واقعہ رسالہ زبان نے 1908 میں بھی شائع کیا تھا۔

ایک دفعہ رسالہ زبان کے مدیر صاحب کی والدہ کو گرمی کے موسم میں ٹھیک دوپہر کو کسی مرض کا دورہ ہوا۔ یکا یک ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ گلے میں بلغم بولنے لگا۔ منہ بند ہوگیا۔ آنکھیں پھر گئیں

اور وہ بیہوش ہوگئیں۔ مکان کے برابر ہی ایک منوہر مشر نامی ویدر ہتے تھے ان کو بلا کر دکھایا گیا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ سردی اور ہوا کی خرابی ہے مگر مرض بہت بڑھ گیا ہے۔ جانبری کی کوئی امید نہیں۔ بہر حال انھوں بھیروں کی گولی دی مگر وہ حلق سے نیچے نہیں اتری ناچار والد صاحب گھبرائے ہوئے حکیم محمود خاں کی خدمت میں پہنچے۔ حکیم صاحب مکان کی چھت پر ایک حجرہ میں تسبیح بدست بیٹھے تھے اور وظیفہ خوانی میں محو تھے۔ والد صاحب چونکہ بے تکلف تھے اس لیے وہیں جا پہنچے اور مریض کا حال بیان کیا۔ آپ نے جھڑک کر فرمایا۔ جا۔ شربت عناب پلا دے۔ ان کے والد صاحب، بہت متعجب ہوئے کہ کہاں شربت عناب اور کہاں بھیروں۔ قیمت میں زمین و آسمان کا فرق۔ مگر آ کر پھر تھوڑی دیر میں حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت شربت عناب کے دیتے ہی مریضہ کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہوگئی۔ میں نے آپ کے کہنے سے شربت پلایا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ مرگئی تو میں قیامت کے دن آپ کا دامن پکڑوں گا۔

حکیم صاحب نے فرمایا کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں دق کرنا چاہتا ہے۔ اچھا چل۔ یہ کہہ کر آپ پاپیادہ ساتھ ہوگئے۔ گھر پر آتے ہی ایک لوہے کی نالی سے منہ کھول کر شربت عناب پلوایا اور شربت کے پیتے ہی مریضہ کو آرام ہوگیا۔

حکیم ابو علی محمد جعفر 1850 مطابق 1270ھ

اعلی اللہ مقامہ 1923

حکیم حاذق

کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنی حیات میں اچھے کام کیے اور گزر گئے، کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی زندگی کا مقصد خلق خدا کی خدمت ہی رہا ہے۔ ان میں حکیم ابو علی محمد کا خاندان بھی شامل رہا ہے جن کے خاندان میں اجداد سے فن طب بندگان خدا کی خدمت کا ایک اہم مقصد حیات رہا ہے۔

خاندان:

حکیم محمد جعفر صاحب کے دادا مرحوم نے غدر سے قبل اپنے وطن مچھلی شہر ضلع جونپور سے انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لیے ترک وطن کر کے بنارس میں سکونت اختیار کر لی۔ محلہ پتر کنڈہ میں قیام کیا۔ ان کے صاحبزادے حکیم احمد علی جو حکیم محمد جعفر کے والد تھے اپنے زمانہ کے معزز اور شہرت یافتہ شخص شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے اجداد ایران سے سرزمین ہند پر وارد ہوئے تھے اور اپنے وقت کے ایران کے مشہور طبی خانوادے سے متعلق تھے۔

طبیب حاذق حکیم ابوعلی محمد جعفر صاحب مرحوم

پیدائش:

زمانہ قیام مشہور حکیم جو راجہ بنارس کے طبیب خاص کا درجہ رکھتے تھے صوبہ یوپی کے مشہور شہر بنارس میں 1270ھ مطابق 1855 میں تولد ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

حسب قاعدہ تعلیم کی ابتدا گھر کے بزرگوں سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے کتب درسیہ فارسیہ کی تعلیم کے لیے مولوی ثناءاللہ کے سامنے حاضر ہوئے اور عربی زبان کی تعلیم کے لیے مولوی عبدالحق جیسے استادفن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مولوی عبدالحق اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب حکیم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے عالم باعمل کے طبیب وقت کے شاگرد رشید تھے۔ آپ کے زمانہ میں عربی طرز تعلیم دینیات پر مبنی تھا۔ کتب حکمت یعنی علوم نقلی بہت کم پڑھائے جاتے تھے۔ آپ نے ملا نظام الدین صاحب کا سلسلۂ نظامیہ مولوی قطب الدین صاحب سے پڑھا جو شارح مسلم کے پوتے تھے۔ اس کے بعد آپ کو مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ بھیجا گیا جہاں آپ نے مولوی عبدالحق فرنگی محلی سے درس حاصل کیا اور عالم وفاضل ہوئے۔

تعلیم طب:

مولوی عبدالحق فرنگی محلی سے درسیات کی تکمیل کر کے آپ نے اپنے خاندانی پیشۂ طبابت کی جانب رجوع کیا اور کتب درسیہ طبیہ مشہور ومعروف طبیب حاذق لکھنؤ حکیم محمد علی لکھنوی سے حاصل کی۔ حکیم ابوعلی محمد جعفر نے حکیم محمد علی کے مطب میں مسلسل دس برس تک رہ کر علم طب میں استفادہ کیا۔ حکیم محمود علی جیسے صاحب فن وطبیب کامل نے آپ کو اسرار سینہ سے بخوبی اس طویل وقفہ میں واقف کرایا اور حکیم محمد علی نے سند طبابت حاصل کر کے اپنے آبائی وطن ثانی بنارس کے مشہور ومعروف محلہ دال منڈی میں اپنے اجداد کے دواخانے میں مطب شروع کیا۔

محلہ دال منڈی بنارس میں آپ کا مطب ''جعفریہ دواخانہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ تقریباً پچاس سال تک بڑے کروفر سے مطب کیا۔ اسی زمانے میں آپ کا تقرر بحیثیت معالج خاص مہاراجہ بنارس کے ہوا۔ اس عہد قدیم میں مہاراجہ بنارس سے بطور معالج 30 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا

رہا۔

اکثر رجواڑوں اور تعلقہ داروں میں معرکتہ الآرا علاج و معالجہ کرتے اور آپ کی خلعت و انعام سے عزت افزائی کی جاتی اسی طرح آپ کی شہرت درشہرت دیار بدیار بڑھتی چلی گئی۔ خاص طور پر صوبۂ بہار کے تھوا راج کی رانی صاحبہ کے جنون کا علاج اور تعلقہ داروں میں راجہ صاحب پیر پور کے یہاں کینسر کا علاج (علاج سرطان) قابل ذکر ہیں بلکہ طرۂ امتیاز ہے اور جو غایت شہرت کا باعث ہے۔

دور دور سے مختلف امراض میں مبتلا مریض آیا کرتے تھے اور خدا کے فضل سے شفایاب ہو جایا کرتے تھے۔ خدا نے آپ کو دست شفا بھی عنایت فرمائی تھی۔ مٹی بھی ہاتھ میں اٹھا کر دے دیتے تو مریض شفایاب ہو جاتا۔ چنانچہ بنارس میں ان کے ایک علاج کی بے حد شہرت ہوئی کہ یہ معرکہ علاج آج بھی زبان زدعام ہے۔

شعری وادبی ذوق:

حکیم محمد جعفر صاحب صرف میدان طب وحکمت کے ہی شہسوار نہیں تھے بلکہ دنیائے شعر وادب کے بے تاج تاجدار تھے۔ انھوں نے جہاں حکمت کے باب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہیں شعروادب میں بھی خواص کا شرف حاصل کیا ہے۔

مولانا سید ظفر الحسن صاحب ان کی اس صفت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ کی طبیعت فن شعروادب میں نہایت موزوں تھی۔ آپ جناب حکیم محمد علی حزیں لکھنوی کے شاگرد تھے اور حزیں مرحوم میر انیس جیسے باکمال شاعر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

حزیں کیونکر نہ غم ہو دل پہ اس استاد کامل کا
کہ تھا یکتا انیس خوش بیاں صاحب کمالوں میں

اس طرح بیک واسطہ مرزا انیس کے شاگرد تھے۔

تبرکاً صرف چند قطعات ایک غزل اور ایک قصیدے کے کچھ اشعار بطور نمونۂ کلام پیش ہے۔

’’قطاعت نوروزی‘‘

حمد خدا کہ فیصل حسرت نشاں رسید یاد بہار عطر فشاں در جہاں رسید
خند و چرانہ غنچہ دلہا کے مومنین امروز حق ز فضل خدا بر مکاں رسید

دیگر

امروز چشم حق رضا مستقیر شد محکم بنائے دیں خدائے خبیر شد
جعفر چرانہ بازوے ایماں قوی شود پشت و پناہ او چو شد دستگیر شد

غزل

نشانم را نہ بود آنجا نشاں جائیکہ من بودم
ہمہ راز نہاں بودہ عیاں جائیکہ من بودم
بیک خردل نمی گیرند اسباب مسرت را
متاع درد باشد بس گراں جائیکہ من بودم
زخود ہا سر بکف ایند عشاق اندراں مقتل
نہ جلد است نہ تیغ و سناں جائیکہ من بودم
مثال درد دلہا از صفا آئینہ می، گیرد
بابا شد حاجت آہ و فغاں جائیکہ من بودم
ز تسلیم جنوں و بے خودی کارش بکار آئند
نہ باشد کار عقل نکتہ داں جائیکہ من بودم
حجابات خودی بودہ ز نور بے خودی مائل
فنا گشتہ رسیدم در ہمان جائیکہ من بودم
بیاز ارش نہ آرز خبر بعشق مصطفیٰ جعفر
گراں قدر ست این گوہراں جائیکہ من بودم

قصیدہ

اے کہ ذاتت موردِ من عندہٗ ام الکتاب
و بے کمالت مصدر من اوتی فصل الخطاب

قاسم تسنیم و کوثر ساقی خم غدیر
رافع درجات جنت شافع یوم الحساب

مطلع مہر امامت منبع انہارِ فیض
موضع علم لدنی مجمع ام الکتاب

پردۂ عصمت سرایت چادر تطہیر گشت
بارگاہت را خدائے عرش کردہ مستطاب

بارک اللہ رتبہ راہ نجف گردونِ وقار
بیں کہ از کملش فزوں شد کہکشان آب وتاب

چوں نہ باشد سرمۂ چشم بصیرت آن غبار
صبحدم روید ز جاروب شعاعی آفتاب

از علی علم نبوت را اگر خواہی بخواہ
بتوانِ داخل شدن در شہر گرامی زباب

گر شود از فیض دریائے عطایت آبگیر
گوہر شہوار بارد جائے باران از سحاب

چوں نہ باشد حق تو روشن تراز مہر منیر
شاہد حق تو گشتہ وقت رجعت آفتاب

از تجلائے جمالت عشق شد آمد بہ ہوش

چوں گل رخسار تو باشید بر موئی گلاب

نعمت جاوید بر خوان علی یغما دہند

حصہ از باغ رضواں گر تو میخواہی شتاب

دشمنت راز طواف کعبہ و سنگش چہ سود

بے تولائے تو بہ گردد چوں عمل نقش بر آب

مطلب جعفر بر آید گر نجف گردد مقام

مشت خاکش چوں شود خاک حریم بو تراب

آپ کے اوصاف حمیدہ اور صفات پسندیدہ کے تذکرے بڑے بوڑھوں کی زبان پر اب بھی جاری ہیں۔ مریضوں میں طبیب مہرباں، دین داروں میں واعظ خوش بیاں، احباب میں تواضع کی جان غرضیکہ وہ ہمہ رخ انسان تھے۔ آپ نے چند رسائل بھی لکھے ہیں جن میں سے علم کلام میں دو رسالے ''الہام ربانی'' ''ارشاد المفید الہدایہ الرشید'' چھپ چکے ہیں۔

وفات:

آپ کی انتقال 31 مارچ 1933 کو ہوا اور روضۂ فاطمان میں علامہ شیخ علی حزیں اعلی اللہ مقامہ کے مزار کے متصل آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

آپ کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شہر بنارس کی کارپوریشن نے نئی سڑک سے جو راستہ دال منڈی کے لیے مڑتا ہے اور جو دیلو گلی قاضی پورہ کلاں ریشم کٹرہ چاہ مہمان اور دال منڈی ہوتی ہوئی چوک تھانے تک جاتے ہے وہ آپ کے نام سے بطور یادگار منسوب کر دی گئی ہے۔ حکیم محمد جعفر روڈ کی ابتدا نئی سڑک سے ہوتی ہے جہاں کارپوریشن کی طرف سے اس نام کا پتھر نصب ہے اور یہ آج نہیں تقسیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ اسی روڈ کے وسط میں حکیم محمد جعفر اعلی اللہ تعالی کا رہائشی مکان واقع ہے۔

شاگرد و پسماندگان:

آپ کے کئی شاگرد تھے جن میں اکثر صاحب مطب ہوئے۔ حکیم عبدالرحمن خان اور حکیم محمد حسین نے کافی شہرت حاصل کی۔

حکیم ابوعلی محمد جعفر کے تین لڑکے اور نو بیٹیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے حکیم ابوالحسن محمد باقر صاحب ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ ہی مطب کرتے تھے۔ حکیم محمد جعفر کے انتقال کے بعد 1923 سے خود مطب چلا رہے تھے۔ 1932 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ ان کے صاحبزادے جن کا نام محمد اطہر ہے، وہ آج بھی کلکتہ میں اپنا مطب کر رہے ہیں وہ حکیموں میں مشہور و معروف شخصیت کے حامل بھی ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے دوسرے صاحب زادے حکیم ابوالقاسم محمد طاہر چھپرہ صوبہ بہار میں اپنا مطب کر رہے تھے۔ پچاس سال سے زائد ہی مطب کرنے کے بعد پھر 75 سال انتقال کیا۔ چونکہ لاولد تھے اس لیے مطب کا سلسلہ بند ہوگیا آپ کا مطب اور تین قطعہ پختہ مکانات موجود ہیں وقف فی سبیل اللہ ہیں۔

حکیم محمد جعفر صاحب کے تیسرے صاحب زادے حکیم محمد کاظم سے اپنے والد بزرگوار کے مطب کو بہت ہی حسن وخوبی کے ساتھ چلا رہے تھے اور قابل قدر ترقی کی تھی۔ فن طبابت وحکمت میں آپ نے دور حاضرہ میں بہت ہی قابل قدر خدمتیں انجام دی تھیں۔ جسے یو پی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی بہت سراہا گیا۔

ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

1- خیراتی یونانی اسپتال قائم کیا۔ جو ابھی بھی قائم ہے۔

2- آنکھوں کے آپریشن کا اسپتال کھولا۔ جو ابھی بھی جاری ہے۔

3- بنارس میں ایک طبیہ کالج سلفیہ طبیہ کالج کے نام سے جاری کیا تھا۔

4- بورڈ آف انڈین میڈیسن کے ممبر ہوئے۔

5- بورڈ آف میڈیسن کے وائس چیئرمین ہوئے۔

6- دسمبر 1961 میں اطبا ہند کی آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کرائی۔

مندرجہ بالا کارہائے نمایاں نے ان کی عزت وحکمت کو چار چاند لگا دیے۔

حکیم محمد جعفر کو قدرت نے عزت و دولت اور شہرت کے ساتھ ساتھ کثرت نسل کی نعمت بھی عطا کی تھی۔ آج ان کی دختران کی اولادیں امریکہ، مغربی جرمنی، سعودی عربیہ، کویت اور پاکستان

میں پھیلی ہوئی ہیں۔

موصوف کا عزاخانہ جعفریہ آپ کی رہائش گاہ پر قائم ہے۔ایک مسجد بھی درگاہ فاطمان میں تعمیر کرائی۔ جہاں ایک پتھر میں تاریخ کندہ ہے۔

آں محمد جعفر عینین نفس بانی مسجد شہر از لطف کرم
مصرعہ تاریخ ما بی حسب حال حکمت میکر است ایں فعل از حکیم

ایک وقف بھی قائم کیا تا کہ عشرہ محرم میں مجالس اور رمضان المبارک میں افطار وغیرہ کا اہتمام بغیر کسی دقت کے کیا جا سکے۔اس کے لیے آج سے 70 سال قبل 20000 روپے اس وقف کے لیے بینک میں محفوظ کر دیا تھا جو بڑھتے بڑھتے بفضل خدا پچاس ہزار روپے ہو چکے ہیں۔

معرکے:

بنارس کی ایک مشہور ومعروف شخصیت کی نکسیر پھوٹی اور انتہا سے زیادہ خون جارہا تھا کسی حال بند نہ ہوتا تھا۔ حالت بگڑتی جارہی تھی۔صبح کے وقت لوگ آپ کے پاس آئے۔آپ منہ دھو رہے تھے اور لوگ نکسیر کے مریض کی دوا کے لیے عجلت کر رہے تھے۔آپ نے انھیں اپنے منجن سے دو چٹکی راکھ دے دی اور کہا کہ ناک میں کسی صورت سے ڈال دیں۔ایسا ہی کیا گیا۔خون بند ہو گیا اور وہ اس صورت سے شفا پا گئے اور پھر کبھی یہ شکایت انھیں پیدا ہی نہیں ہوئی۔شاگردان رشید کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ منجن میں جابشات (خون بند کرنے والی) دوائیں خاصی تعداد اور مقدار میں تھیں۔

آپ کی حذاقت کا چرچا بنگال، بہار اور مشرقی یوپی میں بے حد تھا۔

1217ھ مطابق1855

حکیم حاجی محمد عبدالعزیز 1911

تاج الاطبا　　　　　　بانی ادارہ طب، فخر الاطبا

سرزمین ہند میں تاریخ طب یونانی کے باب میں فن کو بچانے سنوارنے اور آبیاری کرنے میں جہاں چیدہ چیدہ اطبا کا کردار نمایاں رہا ہے وہاں چند خاندان ایسے بھی گزرے ہیں جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت طب یونانی ہندی طب کے ساتھ مل کر آج موجودہ شکل میں موجود ہے جبکہ طب یونانی کی جائے پیدائش یونان تک میں اُس طب قدیم کا وجود نہیں ملتا ہے۔

حکیم محمد یعقوب کے خاندان میں ویسے تو لاتعداد قابل اور حاذق اطبا ہوئے ہیں لیکن جو ملکہ حکیم محمد عبدالعزیز کو ملا وہ کسی دوسرے طبیب کے حصے میں نہیں آیا۔ بقول علامہ اقبال بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ حکیم عبدالعزیز کے کارناموں کی بنا پر ان کو وہ عزت وشہرت ملی کہ ان کا خاندان۔ خاندانِ یعقوبی نہ کہلا کر خاندان عزیزی کے نام سے منسوب ہوا۔

خاندان:

خاندان عزیزی کے اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ کشمیر پر جب احمد شاہ درانی نے جبر واختیار کے بعد تباہی مچائی تو بہت سے خاندان اپنا وطن کشمیر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان پناہ گزیں خاندانوں میں حکیم عبدالعزیز کا خاندان بھی تھا۔ لیکن خاندان

حکیم مولوی حاجی محمد عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ طب ورئیس لکھنوی

عزیزی کے بانی حقیقی حکیم محمد یعقوب ہیں۔ جن کی پیدائش لکھنؤ میں 1790 بعہد نواب آصف الدولہ ہوئی تھی۔

پیدائش:

محمد عبدالعزیز کی پیدائش یکم محرم 1271ھ مطابق 13 مارچ 1855 کو لکھنؤ کے ایک علمی ادبی نیز طبی خانوادے میں ہوئی ان کے والد خاندان عزیزی کے بانی حکیم محمد یعقوب کے فرزند حکیم محمد اسمٰعیل تھے۔

تعلیم وتربیت:

تعلیم کی ابتدا حسب دستور پانچ برسوں کی عمر میں والد اور دادا کی پر خلوص دعاؤں کے ساتھ گھر سے شروع ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق شروع ہی سے ذہانت وذکاوت نمایاں تھی۔ ابتدائی درسی کتابوں کی تعلیم کے بعد فرنگی محل کے متعدد علما وفضلا کے ساتھ ساتھ مشہور عالم شمس العلما مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور فارسی وعربی کی تعلیم کی تکمیل کی۔

تعلیم طب:

سب سے پہلے ان کے دادا حکیم یعقوب نے قانونچہ پڑھایا بعد ازاں طب کی بقیہ کتابیں اپنے چچا حکیم محمد ابراہیم سے پڑھیں۔

1294ھ مطابق 1877 میں ان کے والد محترم نے ان کے مطب کے لیے ایک خوب صورت عمارت تعمیر کرائی جہاں پر حکیم محمد عبدالعزیز دوا خانہ کر سکیں۔ آج یہ عمارت تکمیل الطب طبیہ کالج کے نام سے جانی جاتی ہے۔ عمارت پر حسب ذیل اشعار تحریر تھے۔

مسیحائے ثانی ہیں عبدالعزیز اب   مطب کے لیے ان کے یہ گھر بنا ہے
لکھی کلک اشرف نے تاریخ ہجری   یہ دار الشفا ہے یہ دارالشفا ہے

بچپن سے ہی علمی ادبی نیز طبی شوق حد درجہ تھا۔ درس وتدریس کے شوق ورغبت کے ساتھ مطب کی شروعات چونکہ کر ہی چکے تھے اس لیے بہت جلد مقبول ہو گئے۔

خاندانی طبیب اور وہ بھی عالم وفاضل ایسے کہ یکتائے دوران وزماں۔ دور دور سے مرضا

بشمول رؤسا و نوابین مریض بن کر اگر ایک جانب آنے لگے تو دوسری جانب ان کے درس علمی و طبی کا شہرہ سن کر صوبہ، سرحد، افغانستان، بخارا، سمرقند، ہرات اور حجاز وغیرہ سے طلبا طب بغرض تعلیم حاضر ہوتے تھے۔

حکیم محمد عبدالعزیز اپنے ہم عصر اطبا میں کلیات قانون کے پڑھانے والوں میں ممتاز حیثیت سے مشہور تھے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے اپنی تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' میں لکھا ہے کہ ''حکیم محمد عبدالعزیز کو اپنے ہم عصر اطبا میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی خدمت میں جوق در جوق اطبا، کلیات قانون پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ان میں زیادہ تر ایسے اطبا ہوتے تھے جو اپنے علم و فن کے ماہر ہوتے تھے۔

مولانا ابو الحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی اور مجتہد العصر مولانا سید بچھن حکیم عبدالعزیز کو استاد الہند کے نام سے یاد کرتے تھے۔

حکیم عبدالعزیز اپنے وقت کے صرف طبیب حاذق ہی نہ تھے بلکہ ان کو علوم ظاہری و باطنی پر بھی عبور تھا اور ان کو ان کی علمی قابلیت کی بنا پر رئیس الحکما و شیخ الحکما کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ دور اخیر کے حکما میں ان کے ثانی کوئی دوسرا فلسفی طبیب نظر نہیں آتا ہے کیونکہ ان کو طب یونانی کے نظریاتی و اختلافی مسائل کے علاوہ طب یونانی کے عامی فلسفیانہ مسائل میں عبور حاصل تھا۔

لکھنؤ میں قدیم زمانے سے یہ دستور رہا تھا کہ فرنگی محل کے علما اپنے مدرسہ کے طالب علموں کو اہل تشیع علما کے پاس ان کے ادب و ذوق کی تسکین کے لیے اور اہل شیعہ علما اپنے شاگردوں کو معقولات کی تعظیم کے لیے فرنگی محل کے مدرسے میں بھیجتے تھے۔ لیکن حکیم صاحب کے حلقۂ درس میں دونوں مکتبۂ فکر کے علما و طلبا شریک درس ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کے علم کا شہرہ دونوں مکتبۂ فکر کے حلقوں میں مقبول تھا۔ یہی نہیں ان کے حلقۂ درس میں منتہی طلبا کے ساتھ ساتھ علما بھی شریک ہوتے تھے اور مستفید ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

مشہور عالم اور بزرگ مولانا لطف اللہ علی گڑھ ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے امراض کا علاج حکیم عبدالعزیز سے شروع کیا جب مولانا کو علاج سے افاقہ ہو گیا تو مولانا نے ایک دن حکیم صاحب سے کہا میں نے آپ کے درس کی بہت تعریف سنی ہے کسی وقت خود بھی شرکت کی

خواہش ہے۔حکیم صاحب نے جواب دیا آپ جب چاہیں تشریف لائیں لیکن علما کے سامنے میرا درس کیا حیثیت رکھتا ہے۔لکھنؤ سے روانگی سے ایک یوم قبل بغیر اطلاع کے مولانا درس میں خاموشی سے شریک ہو گئے اور کافی دیر تک سنتے رہے درس کے بعد فرمایا حکیم صاحب جیسا میں نے سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر آپ کو پایا۔ میں نے دہلی میں حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کا درس بھی سنا ہے لیکن آپ کے درس کا عالم ہی جداگانہ ہے۔ یہ طب اور فلسفے کا گنجینہ ہے۔

اسی طرح ایک دیگر بزرگ مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی اپنے وقت کے مایہ ناز عالم تھے۔لکھنؤ کے قیام میں اکثر حکیم صاحب کا درس سننے تشریف لاتے تھے ان کا کہنا تھا کہ حکیم صاحب حکمت و فلسفہ کے بحر ذخار ہیں۔مشہور عالم اور اپنے وقت کے مایہ ناز جید فاضل مولانا عبدالحق خیرآبادی جن کے شاگرد رشید متعدد اہل کمال اطبا ہوئے ہیں۔لکھنؤ تشریف لائے اور حکیم عبدالعزیز کے درس میں شرکت کی۔ درس سننے کے بعد فرمایا۔آپ کتابوں کی مشکلات اس طرز سے بیان کر کے حل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معقولات میں آپ کا علم کس قدر وسیع ہے۔ میں کسی اہل علم کی تصنع کے ساتھ تعریف نہیں کرتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت ہندوستان میں فخر الحکما اور تاج الاطبا ہیں آپ کا نظیر آئندہ یہاں مشکل سے ہوگا۔

لکھنؤ اور ہندوستان میں خاندان جھوائی ٹولہ کو جو مرکز و اہمیت حاصل ہے۔ وہ صرف علاج و معالجہ میں مقام خصوصی کی اہلیت ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس خاندان نے اپنے وقت میں طب کی تعلیم کے لیے جدید طبی تقاضوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے لیے عملی جدوجہد بھی کی۔

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں اگر خاندان شریفی کے مایہ ناز طبیب حکیم عبدالمجید کے ہاتھوں مدرسہ طبیہ کا قیام عمل میں آیا تھا جو دہلی کے طریقۂ علاج کا نمائندہ کالج تھا تو حکیم محمد یعقوب بانی خاندان عزیزی کے ہردل عزیز طبیب حکیم محمد عبدالعزیز کے ہاتھوں لکھنؤ کے طریقۂ علاج کی ترقی و سربلندی کے لیے طبی درسگاہ تکمیل الطب کا وجود عمل میں لایا گیا۔

اس طور پر مندرجہ بالا درسگاہوں میں فن طب کو ایک سائنٹیفک فن کے طور پر پیش کیا گیا۔
شیخ الہند حضرت مولوی حاجی حکیم محمد عبدالعزیز نے پوری دیانت داری سے اس بات کو

محسوس کیا تھا کہ "جدید طب" کے رواج کے ساتھ قدیم طب مذاق بن کر رہ گئی ہے اور اگر اصلاح و تحفظ کی فوری تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو یہ نافع خلاق فن ختم ہو جائے گا۔ اس کے اسباب کی تحقیق ان کی نظر میں یہ تھی کہ اس فن کے کئی اہم اور ضروری بنیادی شعبے ترک کر دیے گئے ہیں۔ مرض کی تشخیص یہ کی تھی کہ فن عملاً ناقص ہو گیا ہے اور علاج یہ تجویز کیا تھا کہ اس نقص کو دور کیا جائے۔

وہ صرف مریضوں کے ہی معالج نہ تھے فن کے بھی مسیحا تھے انھوں نے دوسروں کو مشورہ دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ عملی معالجہ شروع کر دیا انھوں نے محسوس کیا کہ طب یونانی کے نصاب میں علم الادویہ اور علم تشریح کی تعلیم ناقص ہے۔ اس کی عملی تعلیم نہ ہونے کی بنا پر اطبا علم جراحت اور عمل بالید سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اطبا کے ہاتھوں عمل جراحی اور عمل بالید نکل جانے کا جس کے موجد اطبا ہی تھے حکیم عبدالعزیز کو بہت ملال تھا اور جس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دونوں بڑے فرزندوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو لفٹننٹ کرنل جی ایڈریسن سول سرجن لکھنؤ کی خدمت میں بھیج کر تشریح اور عمل بالید کی تعلیم دلائی۔

انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ یونانی علاج و معالجہ میں اطبا کی کامیابی کا راز صرف مطب و نسخہ نویسی کی عملی مشق میں مضمر ہے۔ آئندہ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے گا۔ علم الادویہ کی تعلیم و تحقیق ناقص ہے اگر اس کی تکمیل کی جانب توجہ نہ دی گئی تو آنے والے وقتوں میں ایسے اطبا پیدا نہ ہو سکیں گے جو امراض کی تشخیص اور علاج علیٰ وجہ البصیرت کر سکیں۔

2 جون 1902 کو انھوں نے اعمال بالید (سرجری) کی اہمیت و افادیت پر 8 صفحات کا ایک مضمون سپرد قلم کر کے شائع کیا جس کا مقصد اطبا، طب یونانی کو ان کے ماضی کے روشن کارناموں کو طب کی مختصر تاریخ کے ساتھ اعمال بالید گی کی جانب متوجہ کرنا تھا۔

مجھ کو بھی بعض بڑی بیماریوں میں لائق ڈاکٹروں کی شرکت با مشورت کرنے سے اور اپنے خاص زیر علاج بیماروں میں اعمال بالید کی ضرورت داعی ہونے سے بہ کرات و مرات ایک ایسی کمی محسوس ہوئی جس سے غیرت وحمیت فن نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اس نقصان کی تلافی کروں اور اس فن شریف کو جیسا ہوتا آیا ہے اس کی حالت اصلی کی طرف پلٹا دینے کی کوشش کروں۔ تب میں نے اپنے دونوں بڑے صاحبزادوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو لفٹیننٹ

کرنل بی انڈرسن سول سرجن کی خدمت میں بھیج کر تشریح و سرجری کی تعلیم دلائی۔ لیکن دو طبیب عامل بالید پورے ملک کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی طب یونانی کے ناقص المعیار ہونے کا الزام رفع کر سکتے تھے اور نہ ہی اطبائے یونانی کے پورے گروہ سے بے کمالی کا داغ مٹا سکتے تھے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے پاس حاضر باش شاگرد پیشہ اطبا کو بھی عمل بالید کی تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر طب کا نام روشن کریں اور ارسطو و جالینوس کی گود میں پرورش پائی یہ طب تحقیر کا نشانہ نہ بنے۔

حکیم عبدالعزیز کے پاس اپنے آبائی اجداد کا ایک قدیم نادر کتب کا نجی کتب خانہ بھی تھا جو آگے چل کر انھوں نے طبی درسگاہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔

حکیم عبدالعزیز چند سالوں سے برابر غور کر رہے تھے کہ جھوائی ٹولہ کی طبی مرکزیت اور تدریسی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر باقاعدہ ایک طبی درسگاہ قائم کریں۔ یہ کام تن تنہا انجام نہیں دیا جا سکتا تھا اس لیے خاص احباب سے مشورہ کر کے 2 مارچ 1902 کو ایک جلسۂ شوریٰ منعقد کیا جس میں عمومی تعاون حاصل کر کے سرمایہ کی فراہمی آلات جراحیہ کی خریداری، مرضا کے لیے جگہ کا انتظام، غیر مستطیع طلبا کے لیے بے فکر ہو کر عمل بالید کی مشق کرانے کا انتظام کرنے پر اتفاق ہوا۔ لیکن اسی وقفہ میں انھوں نے اپنے پیر و مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ ''عبدالعزیز مدرسہ قائم کر دو اور میری جانب سے یہ چندہ جو ایک اشرفی پر مشتمل تھا اس میں شامل کر دو۔ آنکھ کھلتے ہی انھوں نے اپنے برادر خورد حکیم عبدالحفیظ دونوں صاحبزادوں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید اور دو برادر زادوں حکیم حافظ عبدالمجید اور حکیم عبدالمعید کو جمع کیا اور خواب کے تذکرے کے بعد فرمایا کہ اب میں اپنے طبی درس گاہ کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تا ہوں اس کے بعد مذکورہ جلسۂ احباب بلایا تھا۔ جن میں ان کے ساتھ احباب و رفیق شریک ہوئے تھے۔

اس مشورہ سے قبل حکیم عبدالعزیز متعدد بار اس طرح کے بیانات جاری کر چکے تھے جن میں طب میں علم تشریح، علم جراحت اور علم الادویہ کی ناقص تعلیم کو طب کی کسمپرسی کا سبب سمجھ کر اس کی اصلاح کے لیے فکر مندی کا اظہار کر چکے تھے۔ یہی احساس تکمیل الطب کے قیام کا مقصد بن گیا۔

جس کے تحت جولائی 1902 میں حکیم عبدالمجید دہلوی کی طرح انھوں نے بھی ہمت کر کے ایک طبی درس گاہ "تکمیل الطب" کی بنیاد ڈالی اور تین سال کا نصاب تعلیم مقرر کیا۔ جس میں طب نظری کے ساتھ عملی تربیت کو اہمیت دی گئی ہے۔ مدرسہ میں معیار تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے بیرونی ممتحن مقرر کیے گئے۔ حکیم عبدالعزیز نے کلیات قانون کا درس دینے کی ذمہ داری خود لی۔ حمیات قانون حکیم عبدالحفیظ کے سپرد ہوئی۔ شرح اسباب اول حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالمجید کے ذمہ ثانی، نفیسی کامل الصناعۃ تشریح و جراحت حکیم عبدالحمید کے ذمہ سپرد کیا گیا۔ قانونچہ موجز اقرائی حکیم عبد المعید کو پڑھانے کے لیے قرار دیا گیا تعلیم قدیم رواج کے مطابق سبقاً سبقاً ہوتی تھی۔ کتب درسیہ طبیہ کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی اور حکیم عبدالعزیز کے رفیق خاص منشی پراگ نرائن مطبع نولکشور نے کتب درسیہ کی طباعت کا خاص اہتمام کیا اور مطبع نامی نے بھی طب کی کتب طبع کیں جن میں زہراوی کی کتاب التصریف (سرجری) خاص اہتمام سے شائع کی۔

1903 میں ملک میں طاعون کی وبا پھیلی جس کے اثرات سے لکھنؤ بھی محفوظ نہ رہا۔ اس موقع پر یونانی اطبا کی حذاقت اور مسیحائی نے بڑا کام کیا۔ مدرسہ طب "تکمیل الطب" میں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالمجید کے زیر نگرانی جدید شاخ عمل بالید کے کھل جانے سے طبی علاج کے سوا طاعونی گلٹیوں کے چاک کرنے میں بہت مدد ملی۔

تکمیل الطب کے ایک سالانہ جلسہ کے موقع پر جبکہ عمائدین ملک موجود تھے مرزا محمد عباس ہوش لکھنوی نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے بعض اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

مگر اس گم شدہ دولت کو جس نے پھر نکالا ہے — وہ ہے حکمت کا پتلا اور مجسم عقل یونانی
وہی ہے سر برآوردہ زمانے کے طبیبوں میں — وہی ہے فخر زہراوی وہی ہے رشک گیلانی

وہ ہے استاد کامل نام ہے عبدالعزیز اس کا
نہ سمجھ شیخ ثانی بلکہ وہ ہے شیخ لاثانی

لفٹیننٹ کرنل جی انڈرسن سول سرجن لکھنؤ جو تکمیل الطب کالج کے خاص سرپرستوں میں تھے جن کے ذریعہ سے آلات جراحی منگائے گئے تھے اور جن کی مہربانی سے عمل بالید میں تکمیل الطب کو ترقی ملی۔ 1909 میں جب وہ ریٹائرڈ ہو کر اپنے ملک واپس ہو رہے

تھے 26اپریل کوان کے اعزاز رخصتی میں جوتقریب ہوئی اس تقریب میں مولانا شبلی، سرراجہ محمود آبادعلی محمد خان اور سرراجہ تصدق رسول بھی شہر کے دیگر رؤساوعمائدین شہر کے ساتھ حکیم حنیف علی رعب جو حکیم عبدالعزیز کے شاگرد تھے انھوں نے بطور مدح ایک نظم کہی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

جلوہ گر اس انجمن میں ہے وہ صاحب احترام
جس کے ہیں رہین منت کیا خاص اور کیا عام
جس کے ہیں وصف آشنا پیر و جواں ہر روز و شب
جس کے ہیں مدحت سرا چھوٹے بڑے ہر صبح و شام
کون یعنی وہ یگانہ جس وحید عصر کا
آئی ایم۔ ایس ڈاکٹر کرنل جی انڈرسن ہے نام

1905 میں حکیم حنیف علی رعب نے 144اشعار پر مشتمل ترکیب بند پیش کیا تھا۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آج جس کی ذات والا پر ہے طب کو افتخار
کون؟ یعنی حضرت عبد العزیز نامدار
اس کو بقراط وارسطو پر نہ کیوں ترجیح دوں
نور کے مد مقابل ہو نہیں سکتی ہے نار
عہد کا اپنے ہے لقمان اور افلاطون عصر
قرشی اپنے وقت کا اور بو علی روز گار
زندہ ہوتے آج بطلیموس و جالینوس اگر
اس کے خوان فیض کے ادنیٰ سے ہوتے زلہ خوار
غازہ خسار ہے میرا ہو باشوکت جواں
نام نامی جس کا ہے عبد الرشید نکتہ داں
اک ذکی الطبع جس کا نام ہے عبد الحمید
نور ہے میرے رخ روشن کا وہ روشن رواں

لکھنؤ ملک اودھ کا شہر ہے میر مقام
اور جھوائی ٹولہ ہے اس شہر میں جائے قیام

ایک دوسرے جلسہ 1906 میں حکیم حنیف علی رعب نے یہ اشعار پیش کیے تھے۔

جھوائی ٹولہ میں جس باغ نے نشو و نما پائی
نہ کیوں ہر غنچہ وگل میں ہو اس کی حکمت آرائی

حکیم عبدالعزیز کو کتب بینی کا ذوق حد درجہ تھا۔ نماز ظہر کے بعد عصر کی نماز تک کتب بینی میں مصروف ومشغول رہتے تھے۔ مطالعہ کے کمرے میں تختوں کے چوکے پر صرف ایک دری بچھی ہوتی تھی اور چہار جانب کتابوں کا ڈھیر رہتا تھا۔ قلمی اور نادر کتب منہ مانگی قیمت پر خریدتے تھے۔ یہ کتب خانہ حکیم صاحب نے ''تکمیل الطب'' کے لیے وقف کر دیا تھا۔

تصانیف:

1-رسالہ تحفۂ عزیزی فارسی۔ ادویہ مرکبہ کا مزاج نکالنے اور دوا کی کمیت بڑھنے سے کیفیت میں تبدیلی۔ تفصیلی بحث۔

2-رسالہ فی الطال جز جوہر الدماغ

3-حواشی بر قانون شیخ غیر مطبوعہ

4-ذاتی تجربات

پسماندگان:

حکیم صاحب کی پہلی شادی 19 سال کی عمر میں 31 دسمبر 1873 مطابق 10 ذیقعدہ 1290ھ بروز سنیچر پھوپا حکیم حاجی رضا کی صاحبزادی زینب خانم سے ہوئی۔

ان سے شفاء الملک حکیم عبدالرشید۔ شفا الملک حکیم عبدالحمید کے علاوہ ایک صاحبزادی خدیجہ بیگم تولد ہوئے۔ شادی کے بیس سال بعد زینب خانم داغ مفارقت دے گئیں۔

دوسرا عقد زینب خانم کی چھوٹی بہن یعنی حکیم عبدالعزیز کی سالی سے ہوا۔ ان سے چار صاحبزادے حکیم عبدالحکیم، حکیم عبدالحمید، عبدالعلیم اور حکیم عبدالعظیم اور دوسرے صاحبزادیاں اکبری خانم اور اصغری خانم تولد ہوئے۔

مذہبی شغف:

حکیم صاحب کواس وقت کے ماحول اورطریقۂ تعلیم نے بچپن ہی سے مذہب کا دلدادہ بنادیا تھا۔مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔حکیم صاحب فلسفیانہ ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے جھاڑ پھونک کے قائل نہیں تھے۔

طبیہ کالج کی بنیاد پر مولانا نے خواب میں آ کر مدرسہ طب کی بنیاد ڈالنے اور ایک اشرفی سے امداد دینے کی بات کہی تھی اسی طرح اپنی صاحبزادی خدیجہ بیگم کی شادی میں روپیہ کی وجہ سے تامل فرمارہے تھے تو مولانا کوخواب میں فرماتے دیکھا کہ تاریخ مقرر کرو روپیہ کا انتظام ہوجائے گا۔

دوسرے ہی دن ریاست بڑودہ سے ایک ہزار روپے پر طلبی آئی اورمہارانی کے اصرار پر بیس یوم قیام رہا جس سے شادی کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا اور حکیم عبدالمجید صاحب سے عقد ہوگیا۔ان خوارق نے حکیم صاحب کو اولیاء اللہ خاص کر مولانا کا معتقد بنادیا تھا۔چنانچہ اپنے صاحبزادے حکیم عبدالحمید کی بچپن میں علالت اور علاج سے مایوسی کے بعد اپنے ایک رفیق خاص منشی احتشام علی رئیس کاکوری کے مشورے سے مولانا کی خدمت میں لے گئے۔بوقت طعام حکیم صاحب کو یاد کیا گیا تو تنہا تشریف لے گئے مولانا نے دریافت کیا صاحبزادے کو کیوں نہیں لائے وہ بھی ہمارے ساتھ کھائے گا۔حکیم صاحب نے معذرت کی کہ اسے یخنی تک ہضم نہیں ہوتی ہے معمول کی غذا تو مدتوں سے بند ہے۔فرمایا سب ہضم ہوگا۔پھراپنے پاس بٹھا کر ماش کی کھچڑی اور پوری کچوری وغیرہ تمام ثقیل اور بادی اشیا جوطبی نقطۂ نظر سے مضرتھیں کھلوائیں اور پانی میں اپنی سبز تسبیح ڈبوکر پلوائی۔اسی روز سے موارضات میں افاقہ شروع ہوگیا۔

حکیم عبدالعزیز نے 1910 میں انتقال سے ایک سال قبل حج کا ارادہ فرمایا اور عید کے بعد پہلے جہاز سے روانہ ہوگئے۔مکہ مکرمہ میں آپ کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا اورخود شریف مکہ نے آپ سے ملاقات کی حج اور مدینہ منورہ کی حاضری کے بعد آپ نے دیگر مقامات مقدسہ اور مصر کی مشہور درسگاہ جامع ازہر کو بھی دیکھا۔واپسی میں بمبئی سے لکھنؤ تک عقیدت مندوں نے جس شاندار اور پرخلوص طریقے سے ان کا خیرمقدم کیا اس سے ان کی مقبولیت اور ہردل عزیزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کسی شاعر نے حکیم عبدالعزیز کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل شعر کہا ہے۔

دامن مقصود رنجوروں کا جس نے بھر دیا
جس نے یونان کے فن مردہ کو زندہ کر دیا

وفات:

حکیم صاحب کی صحت قابل رشک تھی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ورزش کرلیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں مگدر چلا رہے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے حکیم عبدالحفیظ صاحب کے علاج سے افاقہ ہوا۔ چھڑی کے سہارے چلنے لگے تھے پیشین گوئی کی تھی کہ چار ماہ دس دن پر مرض فالج کا بحران ہوگا۔ پیشین گوئی درست ہوئی جمعہ کی شب 19 شوال 1329ھ مطابق 13 اکتوبر 1911 کو تقریباً 57 سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہ معمولی حادثہ نہ تھا۔ آپ کی وفات پر نہ صرف اندرون ملک بلکہ غیر ممالک میں بھی اظہار رنج وغم کیا گیا۔ اخبارات ورسائل نے اداریے اور متعدد شعرا نے طویل مرثیے اور قطعات لکھے۔

دوارکا پرشاد افق نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا۔

تھا مسیحائی کا شہرہ عالم ارواح تک
اس لیے جنت میں روح پاک بلوائی گئی
ہو گیا لقمان کے طبی علم وفن کا خاتمہ
بوعلی کی فطرت افلاطوں کی دانائی گئی
لکھنؤ میں غل ہے دنیا سے مسیحا اٹھ گیا
زندگی تھا نام جس کا ہو گئی آئی گئی
حضرت عیسیٰ پہ تاریخ بولے اے افق
ہائے دل کو آج یہ غم ہے مسیحائی گئی
1329ھ

طبی معرکے:

مہاراجہ گائیکواڑ بڑودہ نے ان کو اپنے بڑے صاحبزادے جو کثرت شراب نوشی کی بنا پر علیل تھے۔عقد ہو چکا تھا مگر کوئی اولا نہیں تھی۔مہارانی بیٹے کی صحت کی جانب سے سخت پریشان تھیں حکیم صاحب کو حسب دستور ایک ہزار یومیہ پر بلوایا اس وقت بڑودہ کے مہاراجہ کی آمدنی 3 کروڑ روپے ماہانہ تھی اور انگریزی حکومت میں نظام حیدر آباد کے بعد ان ہی کی حیثیت تھی۔حکیم عبدالعزیز دو ملازم چند دوائیں اور کتابیں ساتھ لے کر نہایت سادگی سے بڑودہ پہنچے۔راج محل کے ایک پُر فضا گوشے میں حکیم صاحب بحیثیت مہمان مقیم ہوئے۔صبح کو رانی کی نبض دیکھی اور دوائیں تجویز کیں۔ چند نسوانی شکایات تھیں۔ دو ہی دن میں افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر صاحبزادہ کو دکھایا گیا حالات بتائے اور علاج شروع کیا۔تھوڑے دنوں کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ اب میں اجازت چاہتا ہوں جو دوا تجویز کر دی ہے اس سے مکمل فائدہ ہو جائے گا۔ مہارانی نے فرمایا کہ حکیم صاحب اتنی جلدی کیا ہے۔کم از کم ایک ماہ تو قیام کریں۔مہاراج کی نبض بھی تو دیکھیے۔دوسرے دن حکیم صاحب نے مہاراج کی نبض دیکھی اور کہا کہ آپ کو شروع زندگی میں یہ امراض تھے جن کا خفیف اثر اب بھی ہے اور نسخہ لکھ دیا۔مہاراج بہت ہوشیار و مدبر تھے۔انھوں نے مہارانی سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے میرے حالات پہلے ہی بیان کر دیے تھے حکیم صاحب سے؟ مہارانی کے انکار پر مہاراج صاحب سخت متعجب ہوئے اور حکیم صاحب کی خوب ضیافت کی۔حکیم صاحب قیام بڑودہ میں اس درمیان کسی سے نہ ملے۔صرف کتب بینی ہی کرتے رہے۔

غرضیکہ بڑودہ میں حکیم صاحب نے اٹھارہ یوم قیام کیا۔ اپنے دواخانے کی مصروفیات درس وتدریس وافکار کی بنا پر لکھنؤ روانہ ہوئے گئے۔یہ دور وہی تھا جب حکیم صاحب اپنی دختر کے عقد میں اخراجات کے لیے متفکر تھے۔اس کے قبل مہارانی بڑودہ خود قریب قریب دو ماہ لکھنؤ رہ کر علاج کرا چکی تھیں۔

حکیم عبدالعزیز صاحب کا مطب مرجع خلائق تھا خلفا ورؤسا سبھی فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ مطب میں کسی مریض سے کسی طرح کی فیس نہ لیتے تھے۔شہر لکھنؤ میں اگر کوئی مریض اس زمانے

میں گھر پر جا کر حکیم صاحب کو دکھانا چاہے تو سولہ روپے اور اگر صوبہ میں کسی مقام پر بلانا چاہے تو پانچ سو روپے اور صوبہ سے باہر ایک ہزار روپے یومیہ فیس تھی۔ ایک بار حکیم عبدالعزیز نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ان کے علاج کے لیے بھوپال بھی تشریف لے گئے اور تین دن بھوپال میں حکیم صاحب کا قیام رہا تھا۔

ایسے تھے پہلے دور کے حاذق کامل و ماہرفن طبیب

صوفی صاحب درویش و نیک اندیش

حکیم سید برکات احمد ٹونکی

1280ھ مطابق 1863   1347ھ مطابق 1928

ہندوستانی طب کی ترقی و تعمیر میں ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کا بھی بہت تعاون رہا ہے۔ گرچہ اپنے مفاد کے تحت اس ملک میں جدید طریقۂ علاج یعنی ایلوپیتھی طریقۂ علاج کو فروغ دینے کے لیے انگریزوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ پھر بھی آج جو دیسی طریقۂ علاج رائج ہیں وہ سب نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کی رہین منت ہیں۔ ان ریاستوں میں حاذق، کامل صاحب فن کامل اطبا کا تقرر ہوتا تھا اور ان کی حیثیت معالج خصوصی کی ہوا کرتی تھی۔ آج بھی ریاستوں کے اندر جابجا جو مفت شفاخانے یا اسپتال و دواخانے نظر آتے ہیں یہ سب اطبا اور ریاستوں کی دین ہیں۔

انھیں ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست ٹونک بھی تھی۔ جہاں طبی علاج و معالجہ بہت مقبول تھا عام و خاص میں۔ اسی ریاست ٹونک میں ایک ماہر فن طبیب حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی نے اپنی ذہانت و فراست اور قابلیت کی بناپر علاج و معالجہ میں ایک بلند مقام اور مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ آج بھی نہ صرف اس ریاست میں بلکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کے فیض یافتہ موجود ہیں۔

حکیم مولوی سید برکات احمد صاحب ٹونک

خاندان:

حکیم سید برکات احمد کے والد محترم حکیم سید دائم علی جن کا آبائی وطن میر نگر ضلع پٹنہ صوبہ بہار تھا۔ آپ کے اجداد ایک عرصہ سے نسل در نسل یہاں مقیم تھے۔ ذوق علم میں وطن کو خیر باد کہا اور اُس دور کے اساتذۂ علم و فن مولانا احسن گیلانی علامہ فضل حق خیر آبادی مولانا عالم علی نگینوی اور حکیم احسن اللہ خاں دہلوی جیسے یگانۂ روزگار علما اور اہل فن نے ان کے جوہر قابل کو نکھارا اور ان بزرگوں کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد ٹونک میں متوطن ہو گئے۔ نواب ٹونک کے مزاج میں وہ رسوخ حاصل کیا کہ طبیب خاص اور دیوان خزانہ مقرر ہوئے روحانی فیوض و برکات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل کیں اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر خلافت سے سرفراز ہوئے حکیم مولانا میر سید دائم علی نے 1325ھ (1878) میں وفات پائی۔

حکیم برکات احمد کے نانا شیخ ولی محمد صاحب کامل ولی تھے جو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے رشتے کے بھتیجے تھے۔

ولادت یا پیدائش:

ٹونک ہی میں 1280ھ (1863) کو حکیم سید برکات احمد کی ولادت باسعادت ہوئی آپ نسلاً اہل سادات میں ہیں۔

تعلیم تربیت:

حسب قاعدہ ان کی تعلیم کی ابتدا طبیب خاص ان کے والد کے ہونے کی وجہ سے شاہی طور طریقہ پر شروع ہوئی۔ پھر اس کے بعد ابتدائی تعلیم ٹونک کے شاہی مدرسہ میں ہوئی اور بالیہ درسیہ نظامیہ کے متوسط کتابوں کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ والد محترم کے علاوہ جن اساتذہ فن و علم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ان میں مولانا لطف علی بہاری مولانا محمد حسن تلمیذ مولانا آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پھر اس کے بعد مزید تکمیل تعلیم کے لیے علامہ عبدالحق خیر آبادی کی درسگاہ علمی میں داخل ہوئے۔ علامہ کی نگاہ انتخاب نے حکیم برکات احمد کو چن لیا اور علامہ انھیں تعلیم کے لیے ٹونک سے

اپنے ساتھ رام پور لے گئے۔ حکیم برکات احمد نے ایک در پکڑ کر مضبوطی سے پکڑا۔ 15 سال وہ علامہ عبدالحق خیرآبادی کی خدمت با سعادت میں رہے اور مختلف علوم وفنون مثلاً ادب، منطق، فلسفہ، بدیعات، طبعیات الہینات کلام، اصول وفقہ، تفسیر اصول، تفسیر اصول حدیث میں علامہ کی شاگردی میں رہ کر حاصل کیے۔ علامہ کو معقولات میں غیر معمولی شغف اور کمال حاصل تھا۔ جنوب ایشیا ان کے فلسفہ اور منطق کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ علامہ عبدالحق کے شاگردوں میں اس ہونہار شاگرد کے جوہر قابل کی چمک دمک علاحدہ تھی۔ اس لیے علامہ فضل حق خیرآبادی اس ہونہار شاگرد کو بڑی محنت اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے۔ علامہ کے زیر اثر حکیم برکات احمد کا ذہن ترقی کرتا گیا۔ انھوں نے علامہ سے وہ تمام کتب پڑھیں جو درس نظامیہ میں شامل ہیں اور وہ کتب بھی دیکھیں جو خیرآبادی سلسلہ درس میں داخل ہیں۔ مثلاً ہدایہ سعیدیہ، ہدایہ الہدایہ، جواہر الغالیہ، شرح ہدایۃ الحکمت، حواشی خون ساری اور قوشجی کے قولات وغیرہ۔

دینی علوم

دینی علوم کا ذوق ان کو بھوپال کھینچ کر لے گیا اور قاضی محمد ایوب قاضی القضا کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علوم دینیہ اور حدیث کی تعلیم حاصل اور علاج و معالجہ کا پیشہ کا اپنائے رہے جس کی تکمیل پہلے ہی کر چکے تھے۔ بھوپال میں اپنے چند نہایت معرکۃ الآرا علاج کیے۔

طبی تعلیم:

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی سے درس کی تکمیل کے بعد پہلے تو تکمیل طب کے لیے مشاہیر اطبا لکھنؤ جو اپنے وقت کے معروف وذکی اطبا تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن بوجہ کمال علمی وذہانت طبعی آپ کے کوئی طبیب ان کی تشفی نہ کر سکا۔ بالآخر مجبوراً دہلی کا سفر کیا اور عضدولہ جناب حکیم غلام نجف خاں برادر خورشاگرد وارشد احترام الدولہ جناب حکیم محمد احسن خاں صاحب طبیب خاص وزیر سلطنت شاہ ظفر مرحوم کے پاس خدمت میں حاضر ہو کر طب کی ابتدا کی حکیم محمد احسن خاں حکیم مومن خاں مومن کے قریبی رفقا واعزا میں تھے۔

حکیم غلام نجف خاں نے ایسے لائق اور قابل طالب علم کو دیکھ کر اپنی تمام قابلیت سے رموز واسرار طب کی ان کو تعلیم دی۔ اسی زمانہ تعلیم میں جناب عضدولہ مرحوم نے اپنے پوتے

شفاء الملک عالی جناب حکیم رضی الدین کو آپ کے سپرد واسطے تعلیم کے کیا۔ چنانچہ جب تک آپ دہلی رہے حکیم رضی الدین کو درس دیتے رہے اور دولت علم و عمل طب و علوم دیگر سے فراغت کر کے بھوپال کا سفر کیا۔

ان کے والد بزرگوار حکیم سید دائم علی جو خود بھی حکیم احسن اللہ خاں عزیز حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد تھے اور معالج خاص حضور انور امین الدولہ وزیر الملک عالی جناب نواب حافظ محمد ابراہیم خاں بہادر صولت جنگ جی۔سی۔آئی۔ای۔ والی ریاست ٹونک دام اقبالہم کے وہاں تھے۔

31 سال کی عمر میں حکیم مولوی سید برکات احمد علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے والد ماجد دیوان خزانہ اور منصب طبیب خاص سے دست کش ہو چکے تھے۔ والیِ ٹونک نے ان کے والد کی طرح ان کی بھی پوری قدر افزائی فرمائی اور انھیں اپنی ریاست کے لیے باعث عزت و شہرت سمجھ کر ان کو ان کے بڑے بھائی کی جگہ جو بوجہ پیری استعفیٰ داخل کر چکے تھے مقرر کر کے طبیب خاص کا درجہ و مرتبہ عطا کیا اور حکیم برکات اور اپنے فرائض ملازمت نہایت ہی تندہی سے انجام دینے لگے۔

حکیم برکات احمد نے 1331ھ (13-1912) میں حج و زیارت حرمین شریف کی سعادت حاصل کی اور ممالک اسلامیہ بشمول مصر، شام و فلسطین کے مزارات متبرکہ پر حاضری دے کر وطن واپس ہوئے۔

علمی وادبی خدمات:

حکیم سید برکات احمد صاحب کو درس و تدریس سے فطری مناسبت تھی وہ جہاں بھی رہے طلبا کا ایک حلقہ ان کے ساتھ رہا لیکن جب ملازمت کے فرائض آپ کے ذمہ آن پڑے تو فرائض ملازمت اور مطب کے علاوہ جتنا بھی وقت ان کو ملتا وہ درس و تدریس میں صرف کرتے ان کے ذوق درس و تدریس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پندرہ پندرہ گھنٹوں تک مسلسل درس دیا ہے۔ ان کے علم و فضل درس و تدریس کی مقبولیت و شہرت کی خبر مشک بن کر اطراف و اکناف میں پھیلی۔ تشنگان علم اس سرچشمۂ علم کے گرد اپنی تشنگی علم کو دور کرنے کے لیے جوق در جوق جمع

ہونے لگے۔طلبا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ابتدا میں طلبا کے خورد ونوش اور رہائش کا بھی انتظام حکیم صاحب کے ذمہ تھا.................. حکیم صاحب نے اپنے مکان کا ایک وسیع حصہ طلبا کی رہائش کے لیے وقف کر دیا تھا۔لیکن طلبا کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔آخر معززین شہر کے اصرار پر حکیم صاحب کی اس ذاتی درسگاہ کو ایک مدرسہ کی شکل دی گئی۔ اس سرچشمۂ علم سے جو لوگ سیراب ہو کر نکلے وہ صاحب علم بن کر نکلے۔ان میں حکیم صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد احمد شفاء الملک، حکیم رضی الدین خاں دہلوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مولانا عبدالقدیر بدایونی (مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔یہ مدرسہ آج بھی ٹونک میں مدرسہ خلیلیہ کے نام سے آباد ہے۔

ان کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانی نے حکیم صاحب کی حیات طیبہ کا خلاصہ بلیغ انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ یعنی حکیم صاحب مدرس تھے۔پھر مصنف ہوئے اور اخیر میں وہ صرف ایک صوفی درویش نیک اندیش تھے۔

حکیم صاحب اپنی سیرت واخلاق میں قناعت واستغنیٰ کے جوہر میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ریاست حیدرآباد دکن کی پُرشکوہ زندگی کی دعوت، مہاراجہ اندور کا بیش بہا مشاہرہ ٹونک کی قانع زندگی پر کوئی شے ان کے دل کو نہ لبھا سکی۔انھوں نے پوری زندگی اس چھوٹی سی ریاست ٹونک میں گزار دی۔مولانا شبلی کی دعوت قیام لکھنؤ اور حکیم اجمل خان کی دعوت قیام دہلی کا جواب حکیم صاحب نے صرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ دیا،عقل و دانش میں ابن سینائے وقت ہونے کے باوجود سادگی کا یہ عالم کہ ایک روپیہ کے پیسے گننا نہیں جانتے تھے۔ان کی شخصیت اور ان کا فن دونوں عظیم تھے۔ان کی نظر علم وفن کی اشاعت پر تھی۔فن اور شخصیت کے بھر پور چاؤ نے ان کو علامہ عبدالحق خیرآبادی کے بعد معقولات کا امام بنا دیا تھا لیکن انھوں نے اپنے دانش کدہ کو شریعت کے جمال سے منور رکھا اور کبھی عقل کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔

نور معارفت:

حکیم سید برکات احمد کے قلب کو جن بزرگوں کے نور بصیرت اور معرفت نے منور کیا اور ان پر تصوف کی راہیں کھولیں وہ رام پور کے ایک صاحب دل بزرگ جن کا تعلق سلسلۂ صابریہ سے

تھا۔ شاہ رکن عالم تھے۔ جن سے ابتدا بیعت ہو کر حکیم صاحب نے روحانی استفادہ کیا۔ اخیر میں حیدر آباد دکن کے ایک اور مشہور و معروف بزرگ مچھلی والے شاہ صاحب سے بھی روحانی استفادہ کیا۔

عشق رسولؐ:

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حکیم صاحب کا قلب سرشار تھا۔ زندگی کے آخری دور میں بارہا مرتبہ سعی کی کہ مدینہ طیبہ ہجرت کر جائیں لیکن باوجود کوششوں کے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مدینہ طیبہ کے رہنے والوں سے خصوصاً اور عرب کے رہنے والوں سے عموماً بے حد محبت کرتے تھے۔ اپنے والد کی تعمیر کی ہوئی مسجد کے قریب ایک مہمان نواز سرائے تعمیر کرائی تھی تا کہ عام مسافروں اور خصوصاً عربوں کو قیام میں سہولت ہو۔

یہ رباط (سرائے) رباط الحکیم کے نام سے آج بھی مسافروں کے قیام کے لیے وقف ہے اور وسط شہر میں پانچ بتی چوراہے کے قریب واقع ہے۔

استاد سے محبت وعقیدت:

اپنے استادِ محترم مولانا فضل حق خیر آبادی سے غیر معمولی عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ جس زمانہ میں بغرض تعلیم خیر آباد میں مقیم تھے حکیم صاحب کو معلوم ہوا کہ مولانا کو سیتاپور کی فلاں دکان کے کباب بہت پسند ہیں۔ حکیم سید برکات احمد بلا ناغہ ریل سے سیتاپور جاتے اور علامہ کے لیے کباب لے کر آتے۔ چند دن تک تو علامہ نے اپنے عزیز شاگرد کی یہ زحمت گوارا کی۔ آخر علامہ نے منع فرما دیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہر سال اپنے استاد کی قدم بوسی کے لیے پابندی سے خیر آباد حاضر ہوتے تھے۔ علامہ خیر آبادی کی وفات پر ایک رسالہ حسرت العما بر وفات شمس العلما کے نام سے لکھا۔

وفات:

حکیم سید برکات احمد کے ایک صاحبزادے مولانا حکیم سید محمد احمد صاحب تھے جو علم و عمل کے اعتبار سے ان کے حقیقی جانشین تھے۔ معنوی اور مناصب سرکار سے وہی حکیم صاحب کے صحیح قائم مقام ہوئے۔ انھوں نے بھی کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

حکیم سید محمد احمد کی اولاد میں ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے حکیم مولانا محمود احمد برکاتی اور سید مسعود احمد برکاتی ہیں۔ سید مسعود احمد برکاتی کراچی میں مطب کرتے ہیں اور جو وقت بچتا ہے تصنیف وتالیف میں گزارتے ہیں۔ ان کی کئی ٹھوس اور اہم تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ کراچی کے ان دانش وروں میں ہیں جو نام ونمود سے بے نیاز ہو کر ریسرچ اور علمی وتحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور غالب کے اس مصرعہ کے بقول ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

ان کے چھوٹے بھائی سید مسعود احمد برکاتی ہمدرد کراچی کے شعبہ تالیف وتصنیف وترجمے میں ناظم ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب کی دوررس نگاہ نے ان کے جوہر قابل کو پرکھا اور اپنے دفتر کی زینت بنالیا۔

مختصر یہ کہ دونوں برادر پیکر شرافت ونجابت ہیں اور ان کو دیکھ کر بے اختیار جوش کا یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا ہے۔

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

تصانیف:

حکیم مولانا برکات احمد صاحب کی جو فلسفیانہ تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں سے بعض کتب کے نام حسب ذیل ہیں:-

1-انہار اربعہ تصور میں۔
2-القول القابط فی تحقیق۔
3-الوجود الرابط۔
4-امام الکلام فی تحقیق الاجسام۔
5-فلسفہ میں حاشیہ بر حاشیہ خیر آبادی۔
6-حاشیہ شرح موافقت کلام میں۔
7-حاشیہ بر جامع ترمذی (حدیث شریف میں)
8-عشرہ کاملہ۔ (طبیعیات میں)

9-حقیقت الاسلام (//)

10-رسالہ وجود رابطی (منطق میں)

11-المعارف الدعیہ (الہایات میں)

12-تنویر المنار (اصول فقہ میں)

علامہ اقبال کو حکیم برکات احمد صاحب کا ایک رسالہ بعنوان "تحقیق زبان پورا نام رسالہ اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان" کو عرصہ تک تلاش رہی۔ ان کی تصانیف بڑے پایہ کی ہیں۔

طبی معرکے:

حکیم صاحب ایک مستند اور متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فن طب پر بھی گہرا عبور رکھتے تھے۔ ان کی تجویز و تشخیص اور معالجانہ نظر بڑی گہری تھی۔ مرض کتنا ہی پیچیدہ اور پرانا کیوں نہ ہو وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتے تھے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ طبیب کے دل میں اگر خوف خدا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک وصاف نہ ہو تو اس کے ہاتھ سے شفا بھی اٹھ جاتی ہے۔ طبیب صحت وعزت کا امین ہوتا ہے اسے امانت میں کبھی بھی خیانت نہ کرنا چاہیے۔

ایک مریض جس کو دستوں کی پرانی شکایت تھی اور بہت دور دراز تک کے ڈاکٹروں کا علاج کر لیا تھا لیکن افاقہ کی کوئی شکل نہیں ہو رہی تھی اس لیے حکیم صاحب کا نام سن کر علاج کے لیے حاضر ہوا تھا اور اپنے اس مرض کی وجہ سے لب مرگ تھا۔ آپ نے جوارش مصطگی وغیرہ پہلے دی لیکن افاقہ نہ ہونے پر اپنے مجربات سے ایک گولی تیار کرائی جس کا نسخہ حسب ذیل ہے۔

نسخہ:

کچلہ عمدہ وتازہ رات کو پانی میں بھگودیں۔ پانی کچلوں سے دو انگل اوپر رہے صبح ان کچلوں کو اتنا پکائیں کہ پانی جل جائے اور کچلے (اذاراقی) سیاہ رنگ کے ہو جائیں۔ پھر انھیں کوٹ کر رکھ لیں۔ کچلوں کا یہ سفوف فلفل سیاہ (کالی مرچ) گل ازمی افیون ہر ایک ایک تولہ لے کر باریک پیس کر مونگ کے دانہ کے برابر گولیاں بنا کر رکھ لے۔ روزانہ تین گولیاں عرق بادیان وعرق پودینہ کے ہمراہ استعمال کریں۔ چند دنوں تک یہ گولیاں مریض کو استعمال کرائی گئیں جس سے مریض کی بہت پرانی شکایت دور ہو گئی۔

ایک شخص کو ٹونک میں سکتہ ہو گیا اور دو یوم گزر گئے ۔ تمام اطبائے عصر نے متفقہ طور پر تشخیص کیا کہ مر گیا ہے۔ مریض کو مردہ سمجھ کر تجہیز و تکفین کا سامان کیا جا رہا تھا کہ اسی دوران آپ کو مریض کے دیکھنے کا موقع ملا۔ مریض کا بغور مطالعہ اور معائنہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ مردہ نہیں ہے ابھی اس میں زندگی کی علامات موجود ہیں اور اس کو کل صبح ہوش آجائے گا۔ بطور دوا تریاق کبیر ماء میں حل کر کے حلق کے اندر ڈال دینے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر صبح کو بالکل ہوش آ گیا۔ پورے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ حکیم برکات احمد صاحب کی کرامت سے مردہ زندہ ہو گیا۔

اسی طرح نواب صاحب ٹونک کے محل میں ایک بیگم صاحبہ کی بینائی کمزور ہو گئی اور انھیں زیادہ نمبروں کا چشمہ لگنے لگا۔ انھوں نے حکیم صاحب سے خواہش کی ۔ آپ کوئی ایسا نسخہ لکھ دیں کہ عینک کی عادت چھوٹ جائے ۔ حکیم برکات احمد صاحب نے مریضہ کے لیے مندرجہ ذیل نسخہ ترتیب دیا۔

چینی دس تولہ، شورہ پانچ تولہ، سبز چوڑی کا کانچ ڈھائی تولہ، کباب چینی ڈھائی تولہ سب کو نہایت باریک پیس کر آب بادیان میں ایک ماہ کھرل کیا جائے ۔ اب اس میں مروارید ناسفتہ 2 تولہ ڈال کر خوب کھرل کیا جائے ۔ جب یہ سب مثل سرمہ ہو جائے چھان کر شیشی میں محفوظ کر لیں۔

مہینہ دو مہینہ یہ سرمہ بیگم صاحبہ نے استعمال کیا اور اس کے نتیجہ میں ان کی عینک (چشمہ) لگانے کی عادت چھوٹ گئی۔

مسیح الملک حاذق الملک

حکیم حافظ اجمل خاں شیدا

1284ھ/1864ء تا 1927

مسیحائے ہند

تاریخ طب میں ایسی بے شمار نادر روزگار ہستیاں ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے کارناموں سے نہ صرف اپنا نام روشن کیا بلکہ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے اس فن کو اور اپنے سلسلۂ نسب کو بھی حیات جاودانی عطا کر دی۔ ایسی ہستیوں اور شخصیتوں میں حکیم اجمل خاں کا نام نامی واسم گرامی بھی صف اول میں آتا ہے۔

میدان طب کی ایسی ہستی کو جتنی بے شمار انعامات، اعزازات خلعتیں ملی ہیں اتنی شاید طب کی کسی دیگر ہستی کو آج تک نہیں ملی ہیں۔

خاندان شریفی کا یہ چراغ جب تک جلتا رہا روشنی دیتا رہا اور اپنے بعد روشنی کا وہ عظیم مینارہ قائم کر گیا کہ جب تک دنیا ہے اس مینارۂ روشنی سے فیض یاب ہوتی رہے گی۔

خاندان:

حکیم اجمل خاں کا خاندان وہی مشہور خاندان ہے جو تاریخ میں خاندان شریفی کے نام سے منسوب ہے اور جس کے جد امجد طب حکیم فاضل خان تھے لیکن ان کی چوتھی پشت میں جو طبیب ہوئے۔ ان کے ہی نام پر خاندان شریفی منسوب ہوا۔

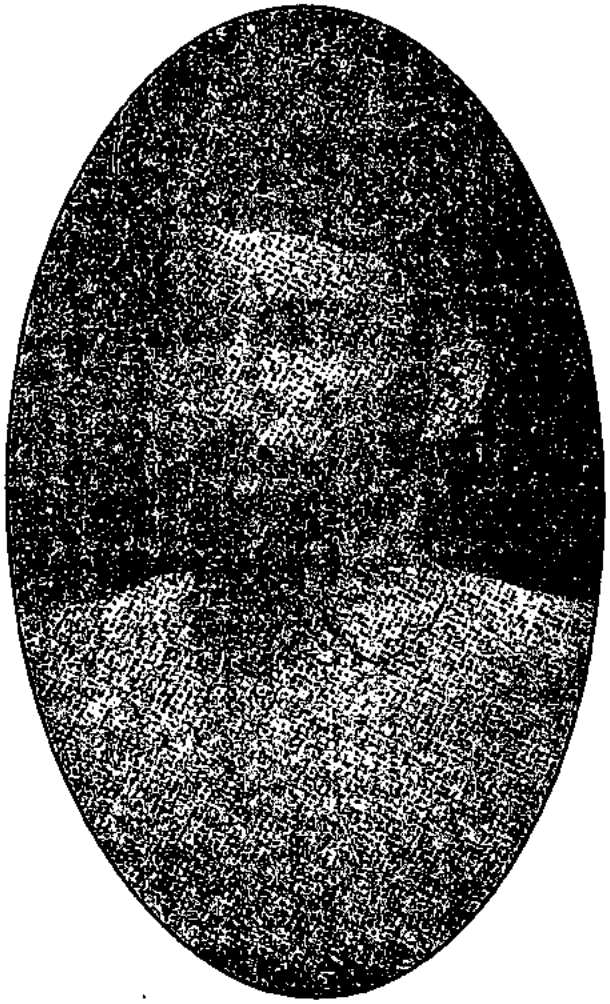

حاذق الملک بہادر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم رئیس اعظم دہلی

حکیم محمد شریف خان مرحوم اپنے زمانے کے بے نظیر طبیب تھے۔ علم وعمل کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ صاحب تالیف وتصنیف تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں اور متعدد درسی کتب پر حاشیے لکھ کر ان کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو سلجھایا۔ آپ کے بعد حکیم صادق علی خاں اور پھر حکیم محمود خاں نہایت بلند پایہ طبیب ہوئے ہیں۔ حکیم محمود خاں مسیح الملک کے والد ماجد تھے اور بہت سی خوبیوں کے مالک۔

حکیم محمود خاں مرحوم کے 3 فرزند تھے جنھوں نے فن طب کو فنا ہوتے دیکھ کر مدرسہ طبیہ قائم کیا اور بعد میں مسیح الملک کی انتھک کوششوں کی بدولت طبیہ کالج بنا۔

حکیم محمد واصل خاں مرحوم مجھلے فرزند تھے اور مسیح الملک حکیم اجمل خان سب سے چھوٹے فرزند تھے جن کا ذکر یہاں خصوصیت سے مقصود ہے۔

غرضیکہ حکیم اجمل خان کے آباؤ اجداد مغل عہد میں ہندوستان وارد ہوئے ان کا سلسلۂ نسب اگر باپ کی جانب سے حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے تو ماں کا شجرہ حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔

پیدائش:

حکیم محمد اجمل خان کی پیدائش 17 شوال 1284ھ مطابق 11 فروری 1864 دلی کے ایک عالی رتبہ رئیس اور فن طب کی تاریخ میں معروف شریف منزل میں ایک ایسا آفتاب طلوع سحر ہوا جس کی روشنی کی کرنیں سرزمین ہند سے نکل کر عرب وعجم، مصر وحبش اور یورپ تک جا پہنچی۔

وضع قطع ۔یعنی لباس:

ابتدا میں حکیم صاحب قبلہ وہی طرز لباس پسند فرماتے تھے جو ان کا خاندانی لباس تھا یعنی دو کلیہ ٹوپی، کچی ململ کا انگرکھا، چست پاجامہ، دہلی کی زری کی جوتی، سردی کی شدت کے وقت ایک نیمہ آستین ۔ایک ہلکی اونی چادر کا سردی میں اضافہ۔

یہ ان کا خاندانی لباس تھا جو خاندان شریفی کے بزرگ اور اطبا عموماً پہنتے تھے۔ لیکن رام پور سے واپسی کے بعد خاندانی رسم ورواج کے خلاف خدمت پسندی کی وجہ سے اور تحریک علی گڑھ سے متاثر ہو کر علی گڑھ فیشن اختیار کر لیا تھا۔ خاندانی لباس کے بعد ترکی ٹوپی اوڑھنے اور شیروانی وقمیص پہننے لگے تھے۔ پاجامہ گو چست نہ ہوتا تھا مگر آری تراش کا سیدھا پاجامہ بغیر چوڑی کا استعمال

کرنے لگے تے۔ وہ بلا تکلف اونی گرم کپڑے اعلیٰ قسم کی سرج جامہ دار اور عمدہ کشمیرے کے بنے ہوئے پہنتے تھے۔

تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کے بعد ترک موالاتی کی شکل میں کھدر میں ملبوس رہنے لگے تھے اس پر طرہ یہ کہ پہلے تو ترکی وضع کی کھدر کی عنابی رنگ کی ٹوپی اس کے بعد کھدر ہی کی کشتی نما ٹوپی پہننے لگے تھے۔ وسط سال 1925 میں جب وہ شام، فرانس اور یورپ کی سیاحت پر گئے تھے تو انگریزی وضع قطع کا لباس یعنی انگریزی سوٹ اور ہیٹ بھی استعمال کرنے لگے تھے۔

تعلیم تربیت:

چونکہ گھرانہ علمی ادبی ماحول سے پر تھا لہٰذا یہ ماحول حکیم صاحب کو بھی ملا اور حسب دستور ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے ہی شروع کی۔ ان دنوں شریف خانی خاندان کے مخصوص وقار اور حکیم محمود خاں کی بلند مرتبہ شخصیت کی وجہ سے شریف منزل میں علما کا مجمع رہا کرتا تھا اور یوں بھی اُس زمانے میں رؤسا اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی کرتے تھے۔ اس لیے حکیم اجمل خاں کی تربیت اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مگر ان کے ذوق علم نے ان کو کسی قیود کا پابند نہیں رکھا اور وہ اپنی علمی تشنگی کو فرو کرنے کے لیے دہلی کے ارباب علم ہنر و کمال کی خدمت میں جانے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے 18 سال کی عمر تک منطق، فلسفہ، طبعیات ادب حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کی تکمیل کر لی تھی۔

صرف ونحو میں ان کے استاد پیر جی صدیق احمد صاحب دہلوی تھے منطق اور فلسفہ شمس العلما مولوی عبدالحق مرحوم مفسر تفسیر حقانی اور مولوی عبدالرشید صاحب رامپوری سے حاصل کی اور دیگر علوم مرزا عبیداللہ بیگ حکیم مولوی جمیل الدین اور دیگر اساتذہ سے پڑھے۔

مندرجہ بالا علوم کے علاوہ خوش نویسی کی تعلیم خلیفہ محمد امیر پنجہ کش اور مولوی رضی الدین سے حاصل کی۔

معقول و منقول کی تعلیم کے ساتھ خاندانی رسم ورواج کے مطابق تعلیم طب کی جانب خصوصی توجہ دی۔

طب کی تعلیم:

طب کی ابتدائی کتب اپنے والد گرامی حکیم محمود خاں صاحب سے اور انتہائی کتب اپنے برادر بزرگ حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے پڑھیں۔ خاندان شریفی کے ایک مشہور بزرگ حکیم غلام رضا خان تھے۔ ان کو قانون پر ملکہ تھا۔ حکیم اجمل خان نے اپنے والد گرامی اور برادر کلاں کے علاوہ ان سے بھی طب میں فیض حاصل کیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ فن نباضی مطب اور نسخہ نویسی جو ایک حکیم کے لیے لازمی تعلیم ہے اپنے والد قبلہ کے ساتھ اور بعد میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مطب میں بیٹھ کر حاصل کی۔ قرآن مجید پہلے ہی حفظ کر چکے تھے۔

چونکہ حکیم اجمل خان کو مطالعہ کا بچپن سے ہی حد درجہ شغف تھا۔ جب کچھ تعلیم اچھی ہوگئی تو انھوں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ مطالعۂ کتب پر صرف کرنا شروع کردیا۔

شاہان مغلیہ کے عہد میں علم دوست خاندان قلمی کتابوں کو عموماً جمع کرتے رہتے تھے اور غدر سے پہلے دہلی میں متعدد خاندانوں میں گراں قدر کتب خانہ تھے۔ مگر جب غدر میں دہلی برباد ہوئی اور شرفا کو اپنی عزت اور جان کا بچانا مشکل ہوگیا تو ایسے حالات میں یہ کتب خانے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہ علمی و ادبی خزائن بھی لٹ پھنک اور ضائع ہوگئے۔ حسن اتفاق سے مرزا غالب کی طرح حکیم محمود خان کا یہ مکان ''شریف منزل'' بھی راجہ نریندر اور مہاراجہ پٹیالہ کی سعی سے لٹنے سے محفوظ رہا اور خاندان شریفی کا یہ علمی خزانہ تلف ہونے سے محفوظ رہ گیا۔

حکیم اجمل خان کے لیے یہ علمی خزانہ ایک نعمت خداداد ثابت ہوا اور انھوں نے مستقل طور پر اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ اس کے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا چونکہ شریف منزل میں مرضا و شرفا کی آمد کی بنا پر وہ گوشۂ تنہائی میسر نہیں آسکتا تھا جو لیلائے علم کے طلب گاروں کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے شریف خاں کی مسجد کے ساتھ والا کوٹھا اپنے لیے مخصوص کرلیا جو اس مکان کے قریب ہے جس میں مرزا غالب اخیر میں منتقل ہوگئے تھے اور جس کے متعلق غالب نے فرمایا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

حکیم اجمل خاں کے اس شوق مطالعہ وذوق علم کی وجہ سے حکیم محمود خاں یعنی اُن کے والد اُن کو مُلّا کہا کرتے تے اور بعض اوقات ان کے غیر معمولی انہاک پر تعریف بھی فرمایا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کا مطالعہ صرف طب کی کتابوں تک محدود نہ تھا بلکہ ادب، تفسیر، منطق اور فلسفہ کی کتابوں کا بھی وہ گہری نظر سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مطالعہ کے بعد دقت طلب مسائل کے حل کے لیے حکیم عبدالمجید، حکیم غلام رضا اور حکیم عبدالرشید خاں صاحب جیسے اساتذۂ فن سے مشکلات کے حل میں مدد بھی لیا کرتے تھے۔

جس دقت نظر کے ساتھ انھوں نے طبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد کتابوں پر ان کے تحریر کردہ حواشی پائے جاتے ہیں۔

اس مطالعہ ونظر نے ان کی آئندہ زندگی پر انقلاب انگیز اثر پیدا کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ متاخرین نے تقلید محض کا راستہ اختیار کر کے طب کی ترقی کو روک دیا ہے اور اسی لیے وہ زیادہ تر لفظی بحثوں میں الجھ گئے ہیں انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ طب میں فلسفہ اور طبیعیات کی آمیزش شیخ کے مسلک کے خلاف ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ انھیں دوران مطالعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جالینوس اور بوعلی سینا کے بہت سے نظریات قابل تنقیح ہیں اور اگر ان کی جلد تنقیح نہ کی گئی تو طب قدیم کا یہ قلعہ کسی دن منہدم ہو جائے گا۔

یہ تمام خیالات دل ودماغ میں موجزن مگر ان خیالات کی تکمیل کسی صورت سے ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اسی دوران ایک تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے ان کے خیالات کو مزید تقویت ہوگئی۔

طب کی تعلیم کا اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاندان کے مختلف بزرگ اپنے اپنے مطب میں طلبائے طب کو درس دیتے تھے۔ کوئی باقاعدہ درسگاہ نہ تھی۔ اسی دوران سرسید احمد خان نے مدرستہ العلوم کی تحریک شروع کی۔ اگرچہ ابتدا میں سرسید کی سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید کے پختہ عزم واستقلال اور خلوص وایثار نے اس تحریک کو کامیاب کر دیا۔ اس طرح مختلف علوم کے مدارس

کے قیام کی جانب عوامی توجہ مبذول ہوگئی۔ شریف خانی خاندان بھی اس سے متاثر ہوا اور ایک طبی مدرسے کے اجرا کے مشورے ہونے لگے اور آخر حکیم عبدالمجید نے 1882 میں مدرسہ طبیہ کا افتتاح کر دیا۔ ایسے موقع پر حکیم اجمل خاں کی عمر 19 سال تھی تاہم انھوں نے مدرسہ میں پوری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اسی زمانے میں ان کو طب یونانی کے متعلق بحث ونظر کا موقع ملا اور وہ اپنے استاد طب حکیم مولوی عبدالرشید خاں اور مولوی حکیم جمیل الدین سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے رہے کیونکہ اساتذہ سے استفادہ میں کوئی جھجک مانع نہیں تھی۔

مدرسہ کے قیام کے کچھ عرصہ کے بعد نصاب تعلیم میں جدید تشریح وجراحت کا اضافہ کیا گیا درحقیقت یہ اضافہ حکیم صاحب کی کوشش سے طب یونانی کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لیے کیا گیا تھا کیونکہ حکیم صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ حکما قدیم مثلاً التصریف زہرادی اور انکانی ہارون موافق اللہ کے مطابق تشریف الاعضا اور عمل بالید میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔

1892 میں حکیم صاحب کو ریاست رام پور میں طبیب خاص اور میڈیکل آفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ ریاست رام پور کے شریف خانی خاندان سے دیرینہ مراسم اور تعلقات تھے۔ ریاست کی جانب سے اس خاندان کا وظیفہ بھی مقرر تھا اور وقت ضرورت حکیم عبدالمجید خاں خود ریاست میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ریاست کے نواب صاحب کی اس خواہش پر کہ حکیم عبدالمجید اپنے ایک بھائی کے قیام کی رام پور میں اجازت مرحمت فرمائیں حکیم اجمل خاں کا تقرر میڈیکل آفیسر کے طور پر عمل میں آیا تھا۔

دوران قیام رام پور حکیم صاحب کا تقرر 400 روپے ماہوار ہوا تھا لیکن ان کی علمی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر 400 سے 600 اور 600 سے 800 اور بعد میں 1000 روپے ماہانہ ہوگیا۔ یہاں حکیم صاحب نے رام پور کے کتب خانے جس کے بعد میں وہ انچارج بھی ہوگئے تھے ایک ایک کتب کا بغور مطالعہ کیا اور ان نایاب کتابوں کی نقل کی اور کرائی جو خاندان شریفی کے کتب خانے میں موجود نہ تھیں۔ کتب خانہ رام پور اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا جہاں دنیا کی نایاب ونایاب کتب جمع تھیں۔ چنانچہ شریف خانی کتب خانہ کی بعض اہم کتابیں مثلاً جالینوس کا لکھا ہوا رسالہ نبض اور تلخیص المفتاح (جو جالینوس نے بقراط کے

احوال کی شرح میں لکھی ہے) اور المنقذ من المہلکہ فی دفع مضار السمائم المہلکہ ۔ التصریف لمن عجز عن التالیف بصہء جراحت ترویج الدرر واح فہندی وغیرہ رام پور کے کتب خانہ سے ہی نقل کی گئی ہیں۔

قیام رام پور میں حکیم صاحب نے ادبیات عرب کی بھی تکمیل کی فی الحقیقت حکیم اجمل خاں دنیا کے بڑے آدمیوں کی طرح خود بھی ادب کی جانب طبعی رجحان رکھتے تھے لیکن طب کے خاندانی شغل ہونے کی بنا پر وہ ادب کو منتہائے مقصود نہیں بنا سکتے تھے دہلی میں دیگر علوم کی طرح عربی و فارسی کی تکمیل ضرور کی تھی مگر ایک طالب علم کی طرح تشنگی ابھی باقی تھی۔ اس وقت عربی کے مشہور عالم مولانا محمد طیب عرب وہاں موجود تھے جو عربی کے صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ایسے موقع پر بلا تکلف مولانا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ حکیم صاحب کو عربی میں تحریر و تقریر کی جو بے نظیر مہارت تھی جس کی بنا پر اکثر لوگ متحیر رہ جاتے تھے وہ در حقیقت مولانا کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا۔ حکیم صاحب کے اس ادبی کمال کی وجہ سے علما بہت متاثر ہوتے تھے چنانچہ جب عراق میں علما سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا تو وہ سب کے سب حکیم صاحب کی سلیس و شگفتہ تحریر و تقریر سے متحیر ہو گئے تھے۔ اسی طرح مصر اور پیرس میں سعد زغلول پاشا اور دوسرے مشہور خطیب حکیم صاحب کی اس عربی دانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی جو عربی ادب کے مشہور نقاد اور صاحب علم تھے انھوں نے حکیم صاحب کے متعلق فرمایا تھا کہ "میری نظر میں ہندوستان بھر میں حکیم اجمل خان سے زیادہ کوئی شخص قابل عزت نہیں ہے کیونکہ علم و امارت کا ان سے بہتر پیکر ملنا مشکل ہے۔"

قیام رام پور میں حکیم صاحب کے اس فارسی ذوق کی بھی نشو و نما اور جلا ہوئی۔ حکیم صاحب کا مکان مرزا غالب کے مکان کے قریب ہی تھا اور مرزا غالب فارسی کے بہترین شاعر اور ماہر تھے اور ریاست رام پور نے غالب کو افکار معیشت سے آزاد کر کے تاجدار سخن بننے میں اگر مدد کی تھی تو حکیم اجمل خاں کو فارسی و عربی کا بہترین ادیب اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے میں بھی مدد دی۔

حکیم صاحب کے قیام رام پور کے زمانہ میں دربار رام پور میں اردو فارسی اور عربی کے بہترین ادیب جمع تھے اور شعر و سخن کی مختلف نشستیں، مذاکرے مجالس اور صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں نواب صاحب اور حکیم صاحب دونوں شریک ہوا کرتے تھے۔

حکیم صاحب رام پور میں مطب بھی کیا کرتے تھے رام پور میں اس وقت متعدد معروف طبیب بھی موجود تھے۔ حکیم صاحب کا مطب تھوڑے ہی عرصہ میں مرجع خلائق بن گیا تھا لیکن حکیم صاحب مقامی طبیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح حکیم صاحب کے نواب صاحب اتنے گرویدہ ہو گئے تھے کہ صرف علاج و معالجہ ہی میں نہیں بلکہ ریاست کے تمام امور مہمہ میں نواب صاحب کے مشیر خاص سے ہو گئے تھے بعض اوقات ریاست کے معاملات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں مگر حکیم صاحب کا ناخن تدبیر ان گتھیوں کو آسانی سے سلجھا لیتا تھا۔

ریاست میں اثر و رسوخ میں حکیم صاحب کی شخصیت نواب رام پور ہز ہائی نس سر سید حامد علی خاں کے بعد سب سے زیادہ نمایاں تھی اگر حکیم صاحب دربار میں اس قدر اثر انداز تھے کہ ان کے مشورے سے اہم امور طے پاتے تھے تو دوسری جانب جمہور میں اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ رام پور کے باشندے ان کا دلی احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ شرفا کی اعانت اور غربا کی دستگیری کرتے رہتے تھے۔

اس کے باوجود حکیم صاحب نے اپنے ذاتی مفاد یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی حالانکہ اس درجہ ریاستی امور میں غلبہ رکھنے کے بعد وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے لیکن ان کا مزاج بالکل نواب وقار الملک کی طرح تھا اور وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ کوئی امر ان کے خاندانی وقار کے خلاف سرزد نہ ہو۔

قیام رام پور کے زمانہ میں حکیم صاحب کی تحریک پر نواب محسن الملک مرحوم علی گڑھ کالج کی جانب سے ایک ڈیپوٹیشن لے کر گئے جس میں نواب صاحب رام پور نے پچاس ہزار کا گراں قدر عطیہ عنایت کیا تھا۔ حکیم صاحب ہی کی وجہ سے رام پور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کامیاب جلسہ بھی ہوا اور اسی زمانے میں حکیم صاحب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی بھی مقرر ہوئے تھے۔

ہز ہائی نس نواب صاحب پر حکیم صاحب کے غیر معمولی اثر و رسوخ کی بنا پر دربار میں بعض مخالفین بھی پیدا ہو گئے تھے لیکن نواب صاحب نے غیر معمولی اعتماد اور حکیم صاحب کی محتاط روش کی بنا پر یہ حاسدین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ پھر بھی ایک بار نواب صاحب اور حکیم

صاحب میں غلط فہمی پیدا ہوگئی لیکن نواب صاحب لوہارو کی مداخلت اور مساعی جمیلہ سے یہ آپسی غلط فہمی دور ہوگئی اور اس قدر تعلقات استوار ہو گئے کہ صرف موت کا زبردست پنجہ ہی ان دونوں کو آپس میں دور کر سکا۔ اس غلط فہمی کی تفصیل آگے درج ہے۔

نواب صاحب رام پور صبح 6 بجے سے شام کے 4 بجے تک سوتے تھے اس لیے دن کا یہ حصہ حکیم صاحب کے لیے اکثر و بیشتر فرصت کا ہوتا تھا۔ حکیم اجمل خاں قیام رام پور میں صبح 6 بجے سو کر اٹھتے تھے اور ضروریات و حوائج ضروریہ سے فراغت کر کے صبح کے 7 بجے سے 10 بجے تک مطب میں مریضوں کو دیکھتے تھے اور 10 بجے کے بعد شام 4 بجے یعنی نواب صاحب کے سو کر اٹھنے تک عبدالصمد خاں چیف سکریٹری ریاست رام پور کے ساتھ گزرتا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا جو انگریزی طرز کا ہوتا تھا۔

اس دوران ملاقاتی اور اسٹاف کے لوگ بھی وابستہ رہتے تھے۔ شام 4 بجے سے قبل جملہ متعلقہ احباب و اسٹاف کے ساتھ چائے ہوتی تھی۔ 4 بجے نواب صاحب کے بیدار ہوتے ہی سارا اسٹاف کمر بستہ اور مصروف عمل کاروبار ریاست ہو جاتا تھا اور 2 گھنٹے تک نواب صاحب ریاست کے کاروبار اور کاغذات دیکھنے کے بعد پھر حکیم صاحب کو اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ جو رات کے 2 بجے تک ساتھ رہتے تھے۔ اس بیچ رات کے کھانے 8 بجے سے قبل نواب صاحب اندرون محل بیگمات کے پاس جاتے تھے تو حکیم صاحب اس درمیانی وقفے میں بلیرڈ کے کھیل سے محظوظ ہوتے تھے۔ ٹھیک 8 بجے نواب صاحب اور لواحقین مع حکیم صاحب کے کھانے کی میز پر موجود ہو جاتے تھے جن کی تعداد قریب 21 ہوتی تھی اور کبھی کبھی کسی خاص مہمان کے آموجود ہونے پر ان 21 شرکا میں سے کسی کو قطع کر دیا جاتا تھا۔ اگر کبھی شب 2 بجے سے پہلے حکیم صاحب کو نواب کی خدمت میں چھٹی مل جاتی تو یہ وقفہ حکیم صاحب کا مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دن میں بھی دواخانہ سے فرصت کے بعد حکیم صاحب ان کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔

ایام محرم میں اوقات شب میں نواب صاحب کے ساتھ حکیم صاحب شریک مجالس ضرور ہوتے تھے مگر نواب صاحب یا دیگر شرکا و رفقا کی طرح کبھی ماتم یا نوحہ خوانی کبھی نہ کرتے تھے جیسا کہ دیگر درباری اور خوشامدی لوگ کرتے تھے۔

نواب صاحب کی سالگرہ کے موقع پر عوام وخواص کی نظریں نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی جاتیں اور نواب صرف ان پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب نے قبول کر لی ہیں مگر حکیم صاحب کا جو تحفہ پیش ہوتا تھا وہ نواب صاحب نہ صرف قبول ہی کرتے تھے بلکہ احتیاط خاص سے اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے حکیم صاحب کا یہ تحفہ عام طور پر 2 اشرفیاں اور ایک خوب صورت سی شیشی ہوتی تھی جو حکیم صاحب کے لیے خاص طور پر تیار کی جاتی تھیں ان شیشیوں میں ایک خاص گولیاں ہوتی تھیں جو صرف نواب صاحب کے لیے مخصوص تھیں۔ اگر گورنر اودھ (یوپی) کبھی رام پور تشریف لاتے تو حکیم صاحب قبلہ کو بھی دہلی سے نواب صاحب ضرور بلاتے تھے رام پور سے ہی حکیم صاحب کے تعلقات سر جیمس سٹن اور سر ہار کورٹ ٹیلر نیز دیگر ذمہ دار انگریزوں سے وسیع ہوئے تھے۔

نواب رام پور اور حکیم صاحب کے تعلقات اتنے زیادہ وسیع ہو گئے تھے کہ حکیم صاحب یا نواب رام پور کو ایک دوسرے کے بغیر سکون نہ رہتا تھا۔

حسب ذیل واقعات سے ان تعلقات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

(1) نواب رام پور کو جب کبھی حکیم صاحب کو بلانا اور ملنا مقصود ہوتا تو ابن میاں یا پرائیوٹ سکریٹری کو حکم دیتے کہ فوراً حکیم صاحب کو تار دو کہ براہ مہربانی پہلی ٹرین سے رام پور تشریف لائیں۔ وہ فوراً حکیم کی تعمیل کرتے تھے اس کے گھنٹہ یا دو گھنٹہ کے بعد پھر دریافت فرماتے کہ حکیم صاحب کو کسی نے بلایا کہ نہیں جواب دیا جاتا کہ حضور تار دیا ہے۔ حکیم ہوتا کہ مجھے انتظار ہے ایک تار اور اس کی بھی تکمیل کی جاتی۔ اس طرح ہر گھنٹہ میں بار بار دریافت فرماتے اور تار بھجواتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حکیم صاحب کا جواب پہنچ جاتا کہ میں فلاں گاڑی سے رام پور پہنچتا ہوں۔ بس اطمینان ہو جاتا اور اب اس گاڑی کا انتظار شروع ہوتا وہ حکیم صاحب کی آمد کی گھڑیاں گنتے تھے اور بے چین رہتے تھے۔ یہ حال تھا نواب صاحب کی حکیم صاحب کے ساتھ گرویدگی کا۔ خدا جانے حکیم صاحب نے کیا جادو کر دیا تھا کہ نواب صاحب کو حکیم اجمل خاں کے بغیر چین نہ ہوتا تھا۔ جب وہ رام پور میں رہتے تھے اور حد درجہ انتظار رہتا تھا جب وہ دہلی یا دیگر کسی مقام پر رہتے تھے اور اگر بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوتی تھی تو بہت بے تابی کے ساتھ بغل گیر ہو جاتے تھے۔

(2) چنانچہ 25 ستمبر 1925 کو حکیم اجمل خاں جب اپنے اسفار یورپ و فرانس سے واپس آئے تو بے شمار دوست احباب اور مداحوں نے ان کو گھیر لیا اور ہار پھول پہنائے۔ اسی دوران حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی کہ نواب صاحب رام پور بندرگاہ کے باہر ایک طویل وقفہ سے اپنی موٹر میں آپ کے منتظر ہیں۔ یہ سنتے ہی حکیم صاحب فوراً باہر کی جانب چلے جب بندرگاہ کے باہر حکیم صاحب آئے تو نواب صاحب کو موٹر میں منتظر بیٹھا پایا۔ حکیم اجمل خاں کو پھولوں اور ہاروں سے لدا پھندا دیکھ کر نواب صاحب موٹر سے اتر کر حکیم اجمل خاں سے بغل گیر ہو گئے اور نواب صاحب کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ ''حکیم صاحب آپ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔'' اور آپ نے جس مقصد کے لیے یہ سفر اور میں نے فراق گوارا کیا اس میں بہت کامیابی تو نظر نہیں آئی۔'' آپ کی صحت اس سفر سے کچھ بہت زیادہ تو بہتر نہیں ہوئی۔'' غرضیکہ یہ عاشق و معشوق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے موٹر میں سوار ہوئے اور مہاراجہ اندور کے بنگلہ میں جہاں نواب صاحب قیام رکھتے تھے روانہ ہو گئے۔

(3) ایک بار نواب صاحب ہز ہائی نس رام پور بہادر کو پیچش کی شکایت ہوئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو بلایا گیا جنھوں نے نواب صاحب کے لیے روغن بید انجیر اور دودھ تجویز فرما کر اپنے سامنے پلوا دیا اور تمام دن غذا میں سوائے دودھ کے دیگر کوئی غذا ان کو نہ دی گئی۔ شب کو آٹھ بجے جو عموماً نواب صاحب کے کھانے کا وقت ہوتا تھا خاصہ پر اس وقت حکیم اجمل خاں مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد اور دیگر رؤسا و اراکین ریاست تھے۔ حسب ارشاد معالج خاص حکیم اجمل خاں کے مونگ کی دال کی کھچڑی پتلی پتلی نواب صاحب کے لیے اور حکیم صاحب و دیگر اراکین کے لیے مختلف انواع و اقسام کے کھانے پیش کیے گئے۔ نواب صاحب کو اس دن پورے دن کا فاقہ تھا اور تیل انڈی اور دودھ کا جلاب پہلے ہی دیے جا چکے تھے اور بالعموم شب کو وہ ایک ہی وقت کھانے کے عادی تھے کیونکہ تمام دن شام تک سوتے تھے مگر اس دن جلاب کی وجہ سے تمام دن جاگتے رہے تھے اس لیے بھوک کا غلبہ شدت سے تھا۔ روزہ داروں کی طرح چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ جب کھچڑی سامنے آئی تو نواب صاحب نے مولوی مقبول احمد صاحب مجتہد سے دریافت کیا کہ ''مولوی صاحب حکم ہے۔ ذرا استخارہ دیکھ کر مجھ سے فرمائیے۔ مولوی صاحب نے اپنی تسبیح پر کچھ پڑھا اور

پھر کچھ شمار کیا اور کہا حضور ممانعت ہے۔'' مجبوراً سب لوگ بیٹھے رہے۔ پندرہ منٹ بعد نواب صاحب نے پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کی خواہش کی پھر مولوی صاحب نے اسی طرح عرض کیا'' کہ حضور اب کی مرتبہ بھی ممانعت آئی۔'' اب نواب صاحب کو بیتابی شروع ہوگئی چہرہ پر گاہے ضعف کی زردی اور گاہے غصہ کی وجہ سے سرخی جھلک جاتی تھی۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد پھر مولوی صاحب سے استخارہ دیکھنے کے لیے ارشاد ہوا۔ مولوی صاحب نے بدستور پھر حکم ممانعت فرمایا۔ اب تو حکیم صاحب سے برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ سرکار! میں بحیثیت آپ کا معالج ہونے کے حکم دیتا ہوں کہ آپ فوراً بلا تاخیر کھانا شروع کر دیں۔ نواب رامپور نے اسی وقت کھانا شروع کر دیا اور پھر مجتہد صاحب کے مقدر میں جتنی مغلظات لکھی تھیں وہ ان کو اسی وقت نقد وصول ہو گئیں۔ پھر نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور وہ دہلی آ گئے۔

اور اس طرح حکیم صاحب 1902 میں اپنے وطن دہلی کو رامپور سے تشریف لے آئے اور 1904 تک حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے دو اہم کام کیے۔ ایک تو مدرسہ طبیہ دہلی کا ترجمان مجلّہ طبیہ کے نام سے شائع کیا مجلّہ طبیہ ماہوار رسالہ تھا جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین ہوتے تھے۔ یہ رسالہ عرصہ تک بہترین خدمات انجام دیتا رہا اور اس کی ادارت کے فرائض زیادہ تر پیرجی حکیم سید عبدالرزاق معلم تشریح الاعضا کے ذمہ رہی۔ حکیم سید عبدالرزاق اس کو نہایت محنت اور کاوش سے مرتب کرتے تھے۔ اس رسالے کے پہلے سرپرست حکیم واصل خان تھے مگر حقیقتاً پالیسی ڈائرکٹر حکیم اجمل خان ہی تھے۔ حکیم صاحب وقتاً فوقتاً اس میں مضامین میں بھی لکھتے رہتے تھے جو عام طور پر مقبول ہوتے رہتے تھے۔ ان مضامین میں سب سے پہلا مضمون پانی پر تھا اس مضمون میں حکیم صاحب نے نہایت سیر حاصل بحث کی تھی اور اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ مضمون کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا اہم کام مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کے لیے ایک مرکز کے قیام کا تھا۔

حقیقتاً دور آخر کے مجدد طب اجمل خاں اعظم کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے چونکہ مدرسہ طبیہ تو قائم ہو چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے اور مطب کر لینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو جاتا

تھا۔ جب تک طلبا کو دواؤں کے وسیع علم کے ذاتی مشاہدے کی بنا پر واقفیت نہ ہوتا کہ وہ اصلی۔ نقلی دوا کو شناخت کر سکیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اطبا شناخت ادویہ سے قاصر تھے کیونکہ درس وتدریس کے بعد مطب سے سابقہ پڑ جاتا تھا ان حالات میں ضرورت تھی کہ ایک ایسا دواخانہ قائم ہو جو

1- مدرسہ طبیہ کے طلبا کو شناخت ادویہ اور دوا سازی کا علم سکھائے۔

2- مفردات اصلی اور خالص مہیا کرے۔

3- مرکبات اصلی اور اعلیٰ تیار کرے۔

4- ملک کے سامنے تجارت ادویہ کا صحیح طریقہ پیش کرے جس میں تجارتی لوٹ مار نہ ہو۔ بلکہ معتدل تجارتی منفعت کے ساتھ مریضوں اور غریبوں کی ہمدردی کا عنصر غالب ہو۔

5- ہندوستان میں پیدا ہونے والی ہزار ہا جڑی بوٹیوں پر تحقیق کی جائے ریسرچ کی جائے اور اطبا کے ذریعہ ان پر تجربہ کے بعد ان دواؤں کو عوامی خدمت کے لیے عام کیا جائے۔

اس کام کے لیے یونانی اینڈ ویدک میڈیسنز لمٹیڈ یہ کمپنی کا اجرا تھا یہ کمپنی مشترک سرمایہ سے قائم کی گئی تھی اور اس کا منشا صحیح اور عمدہ مفرد و مرکب دواؤں کی فراہمی تھا۔ کمپنی مشترک سرمایے سے جن میں حکیم صاحب کے ذاتی دوستوں نے حصہ لیا جن میں مرزا اکبر علی خان مرحوم رئیس۔ نواب فیض احمد خاں رئیس، لالہ جنگل کشور وکیل، لالہ ہزاری مل جوہری، مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی، شمس العلما ہند سید احمد، امام جامع مسجد، دہلی، میر جمال الدین وغیرہ دہلی کے اکابرین اور کچھ باہر کے رؤسا اور معززین شامل تھے۔ شروع میں سرمایہ چند ہزار پر مشتمل تھا اور جوائنٹ اسٹاک کمپنیز ایکٹ کے ماتحت کمپنی قائم کرائی گئی تھی۔

یہ کمپنی فی الحقیقت اس عظیم الشان پروگرام کا ایک جز تھی جو حکیم صاحب نے فن کی ترقی و اصلاح کے لیے تیار کیا تھا۔

اس کمپنی نے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت ترقی کر لی۔ خاندان شریفی کی سرپرستی کی وجہ سے جمہور کو بہت جلد کمپنی کے دواخانہ کی طرف توجہ ہوگئی اور اس کی آمدنی ماہانہ ڈیڑھ دو ہزار تک ہوگئی۔

1903 اور 1904 میں حکیم صاحب قولنج اور ضعف قلب کے دوروں کی وجہ سے عرصہ تک علیل رہے جس کا سبب منجھلے بھائی حکیم واصل خان کا عین عالم جوانی میں دنیا سے رحلت ہونا اور بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خان کے انتقال کے وقت غش کھا کر گر پڑے تھے اور عمر بھر اختلاج قلب کا جو عارضہ رہا یہ ہی حادثہ اور پھر منجھلے بھائی کے حادثہ نے مل کر ایک عجیب مریض بنا دیا تھا جس سے حکیم صاحب چھٹکارہ نہ پا سکے تھے اس وقت ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا کہ یہ عصب راجع دنیو گسٹر یز کا درد ہے ان دوروں کی وجہ سے حکیم اجمل خاں بہت کمزور ہو گئے اور کئی ماہ تک مہرولی لاہور منٹگمری، ملتان کا سفر کیا۔

اسی بیچ قریب 1905 میں حکیم واصل خان کا انتقال ہوا اور خاندان کے دستور کے مطابق حکیم اجمل خاں ان کے جانشین ہوئے اس وقت بھی حکیم صاحب پر نقاہت مرض کا اثر تھا اس لیے جانشینی سے چند روز بعد حکیم اجمل خاں صاحب نے حصول صحت کے لیے سفر بغداد کا عزم کیا۔ چنانچہ 11 مارچ 1905 کو حکیم صاحب اپنے دیگر رفقا حکیم مولوی امجد علی آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر دہلی اور سید حامد صاحب جو (شمس العلما مولوی سید احمد امام جامع مسجد دہلی کے بھائی تھے) کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں حکیم صاحب نے مسقط، بصرہ، قسط العمارہ بغداد کوفہ کربلائے معلیٰ نجف اشرف کے علاوہ عراق کے دوسرے قبات عالیات کی زیارات مقابر کی زیارات اور اکابرین عراق سے ذاتی تعلق وارتباط کا رشتہ قائم ہوا جس سے آپ کی حذاقت اور علمی قابلیت کی بہت شہرت ہوئی بغداد میں متعدد طبی و مذہبی اختلافی مسائل پر حکیم صاحب اور بغداد کے مشہور علما میں مذاکرہ ہوا اور سب ان کے تبحر اور قادر الکلامی کے قائل ہو گئے اور 9 جون 1905 کو حکیم صاحب بخیریت دہلی آ گئے اور اہل دہلی نے ان کا استقبال کیا۔

اُدھر حکیم اجمل خان کے سفر عراق و بغداد اسلامیہ کے دوران بنگال میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا انقلابیوں کے ذہن میں تانا بانا بنا جا رہا تھا اور 1857 کے بعد اس وقت تک سیاسی غلامی کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر کوئی اتنا بڑا مظاہرہ نہ ہوا تھا چنانچہ 7 اگست 1905 کو جبکہ ہندوستان پر لارڈ کرزن کی حکومت تھی یہ حکومت کی چال چلی گئی کہ ہندو مسلم تفریق کر کے سیاسی سورش کا رخ فرقہ وارانہ کشمکش کی جانب پھیر دیا جائے تاریخ مذکورہ بالا کو

تقسیم متحدہ بنگال کا اعلان شائع ہوا۔

یہ ایک چنگاری تھی جو بنگال کے بارود خانے میں گری

ادھر حکیم صاحب نے ممالک غیر کے اسفار سے آتے ہی سب سے پہلے مطب کی ترقی کی جانب توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصے میں مطب کو نہایت کامیاب بنا دیا ان کے مطب میں رجوعات کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سے 1 بجے تک اور شام کو دو تین گھنٹے بیٹھتے تھے اور بمشکل مریضوں کا ہجوم ختم ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں وہ کئی کئی سو مریضوں کو دیکھتے تھے۔ مریض نہ صرف مدراس بمبئی اور برما جیسے دور دراز مقامات سے آنے لگ گئے بلکہ ایران، عراق، افغانستان اور ترکستان وغیرہ ممالک غیر کے مریض بھی ان کے مطب کا طواف کرنے لگے۔

حکیم صاحب کے مطب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے یہاں مطب میں امیر غریب ہندو مسلمان غرضیکہ سب کے ساتھ مساوی حیثیت کا برتاؤ ہوتا تھا۔ سی۔ ایف۔ انڈریوز مشہور پادری نے حکیم صاحب اور ان کے مطب کے لیے حسب ذیل الفاظ کہے تھے۔

''حکیم صاحب کی سب سے پہلی ملاقات میرے لیے ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اس سے ہندوستان اور اہل ہند کے متعلق ایک نئی روشنی میرے دماغ پر پڑی میری پرورش اینگلو انڈین کے قدیم گھرانے میں ہوئی تھی اور میرے دماغ میں یہ خیال ٹھونس دیا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان مذہب اور ذات پات کی وجہ سے ایک ایسی خلیج حائل ہے جو کسی طرح پاٹی نہیں جا سکتی۔ مجھے یہ بتلایا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد پانی اور تیل کے اتحاد سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ انگلستان سے دہلی آنے پر میرے اس اعتقاد کو کئی مرتبہ صدمہ پہنچ چکا تھا۔ مگر حکیم صاحب کے مطب کو دیکھ کر تو وہ بالکل پاش پاش ہو گیا۔ میرے ساتھ کے پادری نے مجھے بتایا کہ حکیم صاحب کے مطب میں ہر مذہب و ملت کے اشخاص آتے ہیں اور حکیم صاحب ہر امیر و غریب ہندو مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ میں نے ان غریب ہندو مریضوں کو خصوصیت سے دیکھا جو حکیم صاحب سے بلا معاوضہ مشورہ حاصل کر رہے تھے۔''

اسی طرح ایک مرتبہ لارڈ ہارڈنگ سابق وائسرائے ہند کے پرائیوٹ سکریٹری حکیم صاحب سے مشورہ لینے کے لیے آئے۔ وہ حکیم صاحب کے مطب کا منظر دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور

انھوں نے لا رڈ ہارڈ نگ سے اس کا ذکر کیا۔ لارڈ ہارڈ نگ اس کے بعد حکیم صاحب کو میگنیٹ آف انڈیا (ہندوستان کا مقناطیس) کہا کرتے تھے۔

مطب کی مصروفیات اور مشغولیات کے باوجود حکیم صاحب خاموش نہ بیٹھتے تھے اور طب کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے فروری 1906 میں طبی تحریک کے لیے ایک قدم آگے بڑھا کر اطبا اور طب یونان کی بازگشت ایوان قصر میں پہنچانے کے لیے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حکیم صاحب طب یونانی اور برادران وطن کی طب ویدک کی متحدہ اور مشترکہ ترقی کے لیے روز اول سے ہی کوشاں تھے حالانکہ اس وقت سیاسی نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان اتحاد کا سوال زیادہ نمایاں نہ ہوا تھا۔ پھر بھی حکیم صاحب کی دور اندیشی وقت کے تقاضوں کو بہت پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔

اس کے قبل حکیم صاحب بعض مذہبی تحریکات میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ ریواڑی کے ایک پادری نے اسلام کے خلاف متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں اس نے نہایت دل آزار پیرائے میں حضور پاک کی سیرت پر سخت حملے کیے اور مختلف یتیم مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو عیسائی بنالیا تھا۔ ان میں سے ایک دہلی کی تھی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوگیا۔ حکیم صاحب بھی اس واقعہ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے دہلی کے ایک صاحب دل کی معیت میں محلہ چتلی قبر میں ایک یتیم خانہ قائم کیا جو ان کے دور میں بہترین انتظامات کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا چنانچہ ڈھاکہ میں ہی نواب سر سلیم اللہ حکیم حبیب الرحمٰن خان نواب وقار الملک نے ایک سیاسی جماعت بنانے کے لیے جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلے جلسۂ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا سنگ بنیاد پڑ گیا، لہٰذا پہلا ہی بنیادی ریزولیشن جس میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا گیا جو نواب ڈھاکہ نے پیش کیا تھا حکیم صاحب ہی نے اس کی تائید کی تھی۔ یہاں لیگ کے جو ممبران پنجاب کی نمائندگی کے لیے نامزد کیے گئے ان میں حکیم صاحب کا نام بھی تھا اس طرح حکیم صاحب مسلم لیگ کے اولین معماروں میں سے ایک تھے اور آخر تک وہ مسلم لیگ کی پالیسی کو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتے رہے تب تک جب تک کہ وہ کانگریس کے برابر نہ ہوگئی۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کی پہلی

سیڑھی اور آغاز تھا۔

1907 میں حکیم صاحب نے ''یونانی'' اینڈ ویدک میڈیسنز'' لمٹیڈ کمپنی کے شرکا کو اس پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے حصص مدرسہ طبیہ کے حق میں فروخت کردیں۔ کمپنی کے حصہ داروں نے بلا تامل حکیم صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی بلکہ بعض نے اپنا حصہ بھی چھوڑ دیا چونکہ ہندستانی دواخانہ بنانے کا مقصد اعلیٰ اور معیاری دواؤں کی فراہمی تھی وہ سال تک دواخانہ نے عوام کی خدمت کی اس کا اعتراف کیا گیا اور اسی درمیان حکیم صاحب نے دواخانہ میں شعبۂ ادویہ کی تدوین واصلاح کی ایک زبردست اسکیم تیار کی اور اسی غرض سے تمام مروجہ نسخوں کی جانچ پڑتال دواؤں کے تحفظ اور تیاری کو جدید علمی تقاضوں کے مطابق بنایا گیا اور کاروباری نظام پر نظر ثانی کی گئی۔ بعض قابل افراد کا تقرر اس کی انتظامیہ میں کیا۔ اس طرح دواخانہ ترقی کرنے لگا۔

1907 تک حکیم صاحب کی زندگی کے بیشتر اوقات اپنے مطب یا رام پور اور علی گڑھ کے حالات میں اور سیاسی طور پر مسلم لیگ کی تحریک میں صرف ہو رہے تھے کانگریس کی تحریک میں عملی طور پر شریک نہ تھے لیکن ذہنی طور پر وہ کانگریس کی تحریک سے ہم آہنگ تھے کیونکہ ان کے خاندان کا قدیمی اخبار اکمل الاخبار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دلچسپی کانگریس سے ہوگئی تھی۔

جون اور جولائی 1907 کے مہینوں میں کام کی کثرت کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت گرگئی تھی لہٰذا عرصہ تک صحت کی خاطر کوئٹہ میں مقیم رہے۔ سال کے آخری چند ماہ زیادہ تر خیر پور اور فرید کوٹ میں بسلسلہ علاج گزرے اور دسمبر میں حکیم اجمل خان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کراچی تشریف لے گئے۔

ہندستانی دواخانہ کی جانب سے مطمئن ہوکر ایک اور اہم ضرورت کی جانب توجہ مبذول کی۔ ہندوستان میں جاہل و ناقابل دائیوں کی وجہ سے عورتوں اور نومولود بچوں پر کیا کیا ظلم ہوتا ہے اس دردانگیز داستان سے ہر کوئی واقف ہے۔ حکیم اجمل خان کا درد آشنا دل بھلا اس ہلاکت آفرینی کو کب تک برداشت کرتا۔ چنانچہ انھوں نے اس مصیبت عظمیٰ سے اہل ہند کو بچانے کے لیے ایک زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کردی اور ایک قلیل عرصہ میں چالیس ہزار روپے جمع کرلیا اور اس سرمایہ سے اس مدرسہ کا افتتاح دہلی کے محلّہ چوڑی والان میں ایک وسیع مکان کرایہ پر لے کر زنانہ

طبی مدرسہ اور زنانہ طبی شفا خانے کا انتظام کرنا شروع کر دیا اور پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر یوٹی ڈین کی اہلیہ سے اس ادارہ کا افتتاح کرانے کی درخواست کی اور وقت مقررہ پر ڈین صاحب مع اپنی اہلیہ اور مسٹر ہمفری ڈپٹی کمشنر کے تشریف لائے۔ اس موقع پر رؤسا دہلی اور عمائدین و خواص حکیم صاحب کے موجود تھے۔ رسم افتتاح کے قبل کرنل اسماعیل خان نے (جو حکیم صاحب کے دوستوں میں تھے اور ایران میں سفیر تھے) ایک تقریر فارسی زبان میں کی۔ جس میں کرنل اسماعیل نے لفٹیننٹ گورنر اور ان کی لیڈی صاحبہ کا خیر مقدم کیا تھا اور زنانہ طبی ادارہ کی اہمیت وافادیت کے ذکر کے ساتھ 4000 روپے کی امداد کا اعلان بھی کیا تھا۔

لفٹیننٹ گورنر بہادر نے انگریزی میں ایک ہمدردانہ تقریر کے ساتھ حاذق الملک کے اس کام کی تعریف کی اور کہا۔

> ''میری حاذق الملک کے خاندان سے بہت دیرینہ واقفیت ہے جب موجود حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبد المجید خان کے لیے کسی موزوں و مناسب خطاب کا مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زیر غور تھا۔ میں اس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹریٹ کا ایک عہدہ دار تھا اور وہ شخص میں ہی ہوں۔ جس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو مشورہ دیا تھا کہ حکیم عبدالمجید خاں کے لیے خطاب حاذق الملک ہی مناسب و موزوں ہوگا۔ جو سابق گورنمنٹ نے حکیم عبدالمجید خان کے ایک بزرگ خاندان کے لیے تجویز کیا تھا پس بہتر نہ ہوگا کہ یہ ہی شاہی خطاب حکیم عبدالمجید خان کو دیا جائے.................
>
> آگے چل کر لفٹیننٹ گورنر بہادر نے کہا کہ مجھے خوشی یہ ہے کہ حکیم اجمل حان کو گورنمنٹ نے وہی خطاب حاذق الملک دیا ہے جو ان کے خاندان کا تاریخی خطاب ہے۔''

انگریزی حکومت نے بذریعۂ خطابت غلام قوم کو مزید غلام بنانے کے لیے عجیب وغریب طریقے اختیار کیے تھے۔ جن میں کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا بلکہ آمدنی ہی ہو جاتی تھی شاہی زمانہ میں خطابات

کے ساتھ جاگیریں بھی عطا کی جاتی تھیں تاکہ خطاب یافتہ خطاب کے وقار کو برقرار رکھے ساتھ ہی وفاداری کا بھی مظاہرہ کرتا رہے۔لیکن انگریزی حکومت دو چار حرفوں یا لفظوں پر ہی اکتفا کرتی تھی۔ ہندستانی خطابات میں بھی تفریق تھی۔ ابتدائی انگریزی عہد میں صرف دو چار ممتاز شخصیتیں انگریزی خطاب از قسم "سر" یا "سی۔آئی۔ای" سے نوازی گئیں جو براہ راست لندن سے آتا تھا۔

البتہ گورنر جنرل کو بھی "خان صاحب"، "خان بہادر"، "رائے صاحب"، "رائے بہادر"، "راؤ صاحب"، "راؤ بہادر" کو بھی عطا کرنے کا اختیار تھا۔

اور اس طرح 1908 میں مدرسہ طبیہ زنانہ کا قیام عمل میں آیا۔شفاء الملک کے خطاب یافتہ طبیب تو پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے لیکن "حاذق الملک" کا خطاب صرف حکیم اجمل خاں کے گھرانہ کے لیے مخصوص تھا۔دہلی میں حکیم رضی الدین خاں بہادر شفاء الملک تھے اور حکیم حافظ محمد اجمل خان حاذق الملک،حکیم اجمل خان نے حکومت کا یہ خطاب 1920 میں حکومت کو واپس کر دیا جس کا تاریخی پس منظر یہ ہے۔

پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر اور ڈائر اور فوجی افسر جنرل ڈائر نے پہلی عالمی جنگ میں بھرپور مدد کا ہندوستانیوں کو یہ معاضہ دیا کہ جلیانوالہ باغ میں اپنی سفاکی سے خون کی وہ ندیاں بہائیں جس سے پورا ملک لرز گیا۔جنگ میں فتح کے غرور نے ہندوستان کو یہ خونی انعام دیا اور مسلمانان عالم کو خلافت اسلامیہ پر ضرب دے کر مشتعل کیا۔

مسلمانان ہند کو یہ دوسرا صدمہ پہنچا اور قومی تحریک حکومت کے خلاف شروع ہوگئی جس کا آغاز خطابات کی واپسی سے شروع ہوا چنانچہ حکیم محمد اجمل خاں مرحوم و مغفور نے اپنا خطاب "حاذق الملک" و تمغہ "قیصر ہند" حکومت کو یہ کہہ کر واپس کیا کہ

"عطائے تو بہ لقائے تو"

اس کے بعد ہی وہ تحریک ترک موالات کے رہنمائے اعظم بن گئے جو مہاتما گاندھی کے زیر قیادت چلی تھی۔

چونکہ اس وقت دستور تھا کہ عوام الناس کے خطابات کے علاوہ فن دانوں عالموں اور پنڈتوں کو بھی وائسرائے کی جانب سے خطابات دیے جاتے تھے مثلاً طبیبوں کو شفاء الملک اور

حاذق الملک۔ عالموں کوشمس العلما اور پنڈتوں کومہامہو پادھیائے۔

شمس العلما کے لیے 100 روپے سالانہ کا عطیہ بھی تھا تاکہ وہ معاش کی طرف سے بے نیاز ہو کر علم کی خدمت کرسکیں۔

الغرض ان خطابات کے حصول کے سلسلے میں امیدوار لوگ جدوجہد کیا کرتے تھے اور رقمیں بھی صرف کرتے تھے جو گویا صاحب ثروت ہوتے تھے وہ کامیاب ہو جاتے تھے اور مبارک و سلامت کے موقع پر وہ اور بھی صرف کیا کرتے تھے۔ بہرحال شاہی خطابات صرف کرنے کے لیے ملتے تھے اور انگریزی خطابات صرف کر کے ملتے تھے۔

خطابات کی واپسی پر حکومت ہند کو یہ غور کرنا پڑا کہ حکیم مرحوم پر کیا وار کیا جائے جس سے بزعم انگریز یا برطانیہ ممدوح مرحوم کو سبق ملے۔ سیاسیات ہند (انگریزی) نے یہ گویا مفید تدبیر سوچی کہ سردست حکیم صاحب کو مالی نقصان پہنچایا جائے جس کا واحد طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ریاستوں میں بحیثیت طبیب بلائے جانے پر پابندی لگا دی جائے تاکہ حکیم صاحب کو ایک ہزار روپے روز کا نقصان پہنچے۔ کیونکہ یہی ان کی روزانہ فیس تھی جو اس زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے ڈاکٹر یا طبیب کی نہیں تھی۔ غرضیکہ محکمۂ سیاسیات نے ایک گشتی (سرکلر) ریاستوں کو بھیجا کہ حکیم محمد اجمل خاں دہلوی کو کوئی ریاست ہماری اجازت کے بغیر نہ بلائے۔

حکیم صاحب کی طبی خدمات سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے ان کو تمغۂ "قیصر ہند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا تھا۔

چونکہ حکیم صاحب نے تحریک ترک موالات میں شامل ہونے کے بعد اپنا خطاب حاذق الملک اور تمغۂ قیصر ہند کو واپس کر دیا تھا اس لیے مسلمانان کانپور نے ان کو اپنے ایک جلسہ میں مسیح الملک کا خطاب دے کر حکیم صاحب مرحوم و مغفور کی مسیحائی کا اعلان کر دیا۔ جیسا کہ مرحوم و مغفور کی طبی اور سیاسی زندگی نے ثابت کیا۔

کانگریس کی صدارت:

1921 کا آخیر ہندوستان کے لیے بڑا انقلاب انگیز تھا اس وقت تحریک ترک موالات اس قدر ہمہ گیر تھی کہ حکومت انگریزی پریشان ہوگئی۔ حکومت برطانیہ نے اس تحریک کو غیر معمولی قوت کو

محسوس کرتے ہوئے اپنے اس بڑے مدبر کو ہندوستان بھیجا جس نے امریکہ کو محاربہ یورپ میں شریک کر کے جرمنی کو شکست دی تھی۔ لارڈ چمفورڈ ابتدا میں اس تحریک سے اغماض وتضحیک کرتے رہے مگر جب اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے گھبرانے لگے۔ لاڈر ریڈنگ نے آتے ہی مقابلہ شروع کر دیا اور 40000 ہندستانی قوم کو جیل میں بھر دیا مگر اس پر بھی یہ تحریک کم نہ ہوئی۔ ایک اور وقت یہ ہوئی کہ حکومت نے کانگریس اور خلافت کے پر جوش رضا کاروں کو خلاف قانون قرار دیا۔

1921 کے آخر میں احمد آباد میں کانگریس کا جلسہ ہوا اس جلسہ کی صدارت سی۔ آر۔ داس کو کرنی تھی مگر ان کے قید ہو جانے کی وجہ سے اجلاس کی صدارت حکیم اجمل خان کو کرنی پڑی۔ اس جلسہ میں مولانا حسرت موہانی کے آزادی کے رزولیشن کی وجہ سے سخت اختلاف تھا مگر حکیم صاحب اور مہاتما گاندھی کے اثر ورسوخ کی وجہ سے معاملہ زیادہ نہیں بڑھا۔

1922 کے شروع میں مہاتما گاندھی نے واقعہ چورا چوری کی وجہ سے باردولی میں عدم ادائے محصولات (Non-coppration) کی تحریک کو روک دیا۔ اس کے بعد ہی دہلی میں کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں اطراف ہند کے کارکن آئے ہوئے تھے۔ مہاتما کے فیصلے باردولی کی وجہ سے ایک عام مایوسی کی فضا چھا گئی تھی اور سب اسے مہلک غلطی قرار دے رہے تھے اس وقت حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کے ساتھ اس مایوسی کو دور کرنے کی سعی کی۔

باردولی کے التوا کی وجہ سے تحریک ترک موالات میں جو ضعف پیدا ہو گیا تھا اسے حکومت نے غنیمت جانا اور مہاتما گاندھی پر مقدمہ چلا کر انھیں 6 سال کے لیے جیل میں بھیج دیا اس وقت تمام تحریک کا بار حکیم صاحب کے کندھوں پر آن پڑا۔ تحریک کی قیادت ہاتھ میں لیتے ہوئے حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کو ایک یادگار خط بھیجا اور اس میں انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کی طرح ہندوستان کی کامیابی کے لیے عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ستمبر 1922 میں وہ پنجاب پروانشیل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اس میں انھوں نے اہل پنجاب کو نصیحت کی کہ وہ آپس میں نہ جھگڑیں ورنہ خلافت اور سوراج کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

اسی سال اس امر کی تحقیقات کے لیے کمیٹی بنائی گئی کہ اہل ہند پرامن قانون شکنی کے لیے

آمادہ ہیں یا نہیں۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ شریک تھے۔ حکیم اجمل خان اس کمیٹی کے صدر تھے یہ کمیٹی کئی ماہ تک ہندوستان میں دورہ کرتی رہی اور آخر میں اس نے ایک رپورٹ مرتب کی۔ اراکین مجلس میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ حکیم صاحب پنڈت نہرو اور مسٹر پٹیل نے یہ رائے دی کہ قوم پرستوں کو مسٹر داس کے پروگرام کے مطابق کونسلوں پر قبضہ کر کے حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنی چاہیے۔ ڈاکٹر انصاری اور دوسرے ممبر اس تجویز کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے تحریک ترک موالات کو نقصان پہنچے گا۔ اس رپورٹ کے بعد ہندوستان میں سخت خلفشار مچ گیا اور کانگریس کے دو گروہ ہوگئے۔ بعض تو داخلہ کونسل کے خلاف تھے اور بعض اس کے حامی تھے۔ ناگپور کانگریس میں بھی یہ کش مکش رہی۔ آخر دہلی کے خاص اجلاس میں مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے یہ قضیہ طے پایا گیا اور سوراجیوں کو داخلۂ کونسل کی اجازت مل گئی۔

تحریک ترک موالات میں غیر معمولی انہماک اور صرف وقت و دماغ کی وجہ سے حکیم صاحب کی صحت بہت خراب ہوگئی اور وہ بہت کمزور ہوگئے اور ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ مجبور ہو کر حکیم صاحب نے مسوری ایبٹ آباد وغیرہ میں کچھ وقت صرف فرمایا اور آنکھوں کا آپریشن کرایا جس سے آرام ہوگیا۔

طبیہ کالج کا افتتاح:

1916 میں لارڈ ہارڈنگ نے طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کے بعد سے ہی حکیم صاحب نے کالج کی عمارات بنوانی شروع کر دیں۔ یہ عمارات کی تعمیر پانچ چھ سال میں مکمل ہوئی اس وقت ان عمارات پر سات آٹھ لاکھ روپے صرف آچکا تھا۔ کالج کی عمارتیں نہایت وسیع شاندار اور خوش وضع تیار ہوئیں۔

دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خاندان مغلیہ کی شاندار عمارات کا وسیع سلسلہ ہے۔ کالج کی عمارت کو دیکھ کر بے اختیار حکیم صاحب کی بلند مرتبہ شخصیت کا احساس ہوتا ہے۔

اگر حکیم صاحب نے اور دیگر کوئی کام بھی نہ کیا ہوتا تو یہ طبیہ کالج ہی ان کو زندۂ جاوید رکھنے کے لیے کافی تھا۔

عمارات مکمل ہوجانے کے بعد 1921 میں گاندھی جی نے اس کالج کا شاندار افتتاح کیا۔ ہندستانی دواخانہ کو اپنے تمام خاندانی مجربات دے کر وقف کر دیا اور اس کی آمدنی سے کم و بیش تمام اخراجات پورے ہوتے رہے۔

جامعہ ملیہ دہلی کے وہ امیر (وائس چانسلر) ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے اخراجات کے کفیل بھی تھے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب اساتذہ کی تنخواہ دینے کے لیے انھیں اپنے ہیرے کی قیمتی انگوٹھی بھی فروخت کرنی پڑی۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ مسلم یونیورسٹی ندوۃ العلما، دارالمصنفین اعظم گڑھ، نظارۃ المعارف دہلی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ کے استحکام اور ترقی میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

آخری ایام میں حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ صحت کے ذرا اچھا ہونے پر وہ جامعہ کے لیے بمبئی اور رنگون وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ جس طرح طبیہ کالج کو ہندستانی دواخانہ سے مستقل آمدنی کا ذریعہ ہوگیا ہے اسی طرح جامعہ ملیہ کے لیے کوئی سبیل نکال دیں مگر افسوس ہے کہ ان کی موت نے اس اسکیم اور آرزو کو پورا نہیں ہونے دیا۔

طبی کانفرنس رام پور:

اوائل 1927 میں حکیم صاحب نے طبی کانفرنس رام پور میں عظیم الشان جلسہ کرایا۔ نواب رام پور اس جلسہ کے صدر تھے۔ حکیم صاحب نے اس جلسہ میں بھی اطبا کو اصلاح وتجدید کی جانب متوجہ کیا اور نصاب پر نظر ثانی کے لیے دہلی لکھنؤ و لاہور میں تین کمیٹیاں بنائیں۔

آخری ایام:

دسمبر 1927 کے پہلے ہفتہ میں وہ رام پور تشریف لے گئے مگر اس مرتبہ وہاں ان کو قلب کے سات شدید دورے پڑے جس سے وہ مزید ناتواں ہو گئے۔ دہلی واپس آئے تو کمر میں چک آ گئی۔ جس سے تین روز تک شدید تکلیف رہی درد کی۔ اس حال میں بھی ہمت کا یہ حال تھا کہ روزمرہ کے مشاغل انجام دیتے رہے بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی کے جلسہ میں بھی شریک ہوئے۔

انھی دنوں امیر افغانستان بمبئی تشریف لا رہے تھے۔ جامعہ ملیہ اور خلافت کمیٹی کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں ایڈریس پیش کرنے کا پروگرام پہلے ہی پاس ہو چکا تھا اور اس غرض

سے حکیم صاحب کا بمبئی جانا ضروری تھا چنانچہ سفر کی تیاری شروع ہو چکی تھی مگر شدید درد کی وجہ سے دو روز کی تاخیر ہوئی۔ تیسرے دن درد کے باوجود حکیم صاحب نے سفر کا ارادہ کیا۔ چند احباب نے سفر نہ کرنے کا بھی مشورہ دیا لیکن حکیم صاحب بمبئی تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے۔ کئی روز سے انھوں نے غذا بھی نہیں کھائی تھی۔ کمر کے درد کی وجہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے اور گاڑی میں بھی وہ دو آدمیوں کے سہارا دینے سے بیٹھ سکتے تھے۔

بمبئی میں دو روز تک قیام پذیر رہے انھوں نے جامعہ ملیہ کی طرف سے امیر صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور مختلف تقریبات میں شریک ہوئے۔ پھر وہاں سے جامعہ ملیہ کے لیے ریاست پالن پور میں تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ انھیں دو مرتبہ درد کا دورہ ہوا مگر بدستور مشاغل میں مصروف رہے اور 25 دسمبر کو دہلی لوٹ آئے۔

25 دسمبر کی صبح کو حکیم صاحب بمبئی سے دہلی تشریف لائے۔ صبح 9 بجے سے 11 بجے تک ڈاک دیکھتے رہے جو اس دوران میں بڑی تعداد میں اکٹھی ہو چکی تھی۔ پھر ان مریضوں کا معائنہ کرنے لیے تشریف لے گئے جو دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ شام کو 7 بجے واپس آئے اور مطب میں بیٹھ گئے اور شب کو 9 بجے تک آخری مطب فرمایا۔ ساڑھے گیار بجے کی گاڑی سے رام پور تشریف لے گئے۔ رام پور میں طبیعت خراب رہی۔ صرف ایک انڈے کی زردی غذا کرتے رہے۔ 28 کی شام کو حسب معمول بلیئرڈ کھیلتے رہے۔ 11 بجے تک نواب رام پور سے باتیں کرتے رہے پھر آ کر سو رہے۔ 12 بجے نواب صاحب نے یاد کیا۔ خدمت گار نے بیدار کر کے عرض کیا کہ سرکار یاد فرماتے ہیں۔ چونکہ طبیعت خراب تھی اس لیے فرمایا کہ چوب دار سے کہہ دو کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ چوب دار ابھی واپس نہیں پہنچا تھا کہ خود نواب صاحب تشریف لے آئے۔ حکیم صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک نواب صاحب بعض اہم معاملات کے متعلق مشورہ فرماتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں حکیم صاحب تکلیف محسوس کرتے رہے مگر غیر معمولی ضبط کی وجہ سے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

وفات:

پونے دو بجے نواب تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ چیف سکریٹری صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب نے ان کو کچھ ضروری باتوں کے لیے اپنے پاس ٹھہرالیا کوئی 5 منٹ گزرے ہوں گے کہ حکیم صاحب نے قلب پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور گہرا سانس لیا۔ چیف سکریٹری صاحب نے گھبرا کر کہا کہ حکیم صاحب کیا تکلیف ہے۔ فرمانے لگے کہ قلب کے مقام پر تکلیف ہے۔ سکریٹری صاحب نے کہا آپ آرام فرمائیں میں صبح حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر حکیم صاحب نے ان کو پھر روک لیا۔ پانچ سات منٹ کے بعد پھر سخت دورہ ہوا اور حکیم صاحب کے منہ سے خفیف سے چیخ نکلی اور فرمایا کہ جلد ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب کو بلایئے۔ چیف سکریٹری صاحب نے خدمت گار کو ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لیے بھیجا اور دوسرے خدمت گار کی مدد سے حکیم صاحب کو مسہری پر لٹا دیا۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر دورہ ہوا۔ فرمایا کہ گرم پانی لاؤ مگر ڈاکٹر اور گرم پانی کے آنے سے پہلے شب کو دو بجے تین ہچکیاں لیں اور دہلی کا یہ بے تاج بادشاہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

ہز ہائی نس نواب صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لائے اور بے اختیار ہو کر فرمایا کہ حکیم صاحب نہیں مرے میں مر گیا۔

صبح کو نواب صاحب رام پور کے کئی تار دہلی پہنچے کہ حکیم صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایک تہلکہ مچ گیا سارے شہر دہلی میں 3 بجے میت موٹر کے ذریعہ دہلی پہنچی۔ 4 بجے جنازہ آخری آرام گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ جنازہ کے ہمراہ مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی غرضیکہ ہر فرقہ کے لوگ موجود تھے اور ہزارہا مخلوق ساتھ تھی۔ چاندنی چوک سے شریف منزل تک اس قدر ہجوم تھا کہ گزرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی ہر آنکھ اشک بار تھی۔

دہلی کی جامع مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ بعض احباب کی رائے تھی کہ مصلح قوم سرسید کی طرح حکیم صاحب کی تدفین بھی ان کی محبوب اور عظیم طبی درسگاہ طبیہ کالج قرول باغ میں عمل میں آئے لیکن متعلقین کی منشا اور حسب دستور حکیم صاحب کے جسد خاکی کی تدفین حضرت خواجہ سید حسن رسول نما قدس سرہٗ جن کا مزار پہاڑ گنج سے آگے ہے اور جہاں حکیم صاحب کے والد۔ دونوں بھائی مدفون ہیں عمل میں آئی۔

حکیم صاحب کے انتقال کی خبر دہلی سے باہر دیگر مقامات پر پہنچی تو ہر جگہ شدید رنج وغم کا اظہار کیا گیا کلکتہ اور لاہور میں مسلم لیگ کے ایسے وقت میں اجلاس ہو رہے تھے ان اجلاس میں تعزیت کی قرارداد پاس ہو کر اجلاس ملتوی ہو گئے۔

تمام ہندوستان نے ایک عرصۂ دراز تک اپنے محبوب لیڈر کا غم منایا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں حکیم صاحب کے لیے تعزیتی جلسہ یا قرارداد نہ پاس کی گئی ہو۔

تمام انگریزی، اردو، نیز ہندی کے اخبارات نے اس حادثہ پر مضامین سپرد قلم کیے۔ اس وقت دہلی میں موجود وائسرائے لارڈ ارون اور سابقہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ حکومت افغانستان، حکومت مصر، سلطان مسقط اور متعدد والیان ریاست نے ہمدردی کے پیغامات ہندوستان نیز ہندوستان سے باہر یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایران وغیرہ کے معروف لوگوں کے تعزیت نامے ملے اور جلسے بھی بعض مقام پر ہوئے۔

اسی موقع پر مدراس میں کانگریس کا جلسہ ختم ہی ہوا تھا۔ جیسے وہاں خبر پہنچی تو صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کہا کہ۔

''اس قدر کامیابی کے بعد اس خبر نے میرے دل کو توڑ دیا ہے۔''

گاندھی جی نے اپنے مضمون میں لکھا۔

''حکیم اجمل خان کی موت نے مجھ سے صرف ایک دانش ور اور ثابت قدم شریک کار ہی کو نہیں چھین لیا بلکہ میں نے ایک ایسا دوست بھی کھو دیا ہے کہ جس پر میں ضرورت کے وقت بھرپور اعتماد کر سکتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے معاملہ میں وہ میرے مشیر اور رہنما تھے۔ وہ انسانی فطرت کو خوب پہچانتے تھے اور اسی صلاحیت نے انھیں صحیح قوت فیصلہ عطا کی تھی۔ وہ ایک خیالی قسم کے انسان نہ تھے بلکہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی پوری قوت رکھتے تھے۔''

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ:

''جو لوگ حکیم اجمل خان سے اپنے مرض کا نسخہ لینا چاہتے ہیں جو اپنی

ملازمت کی سفارش کے خواہاں ہیں جنھیں اپنے عزیز کی شادی کے لیے روپے درکار ہے۔ جن بیواؤں کی روٹی ان کی توجہ سے چلتی تھی۔ جن یتیموں اور ناداروں کی تعلیم کے لیے ان کے خزانہ سے رقم ملتی تھی ان کی تعداد سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے ان کا اجمل خاں رخصت ہو گیا مگر طب قدیم کا مجدد اور طبی تعلیم کا رہنما آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

پسماندگان:

حکیم صاحب نے اپنے انتقال کے بعد دو دختران اور ایک صاحبزادے کے ساتھ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لاکھوں عقیدت مندان چھوڑے تھے۔

تصانیف:

حکیم محمد اجمل خاں کی مصروف سیاسی وسماجی زندگی نے ان کو تصنیف و تالیف کا موقع کم دیا تاہم فن طب میں جو کچھ بھی لکھا وہ اہم ہے۔

قیام رام پور کے زمانے میں حکیم صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں چونکہ تصنیف و تالیف کا شوق ابتدا سے ہی تھا لہٰذا زمانۂ تعلیم ہی میں ایک رسالہ عربی میں القول المرغوب فی الماء المشر دب تحریر کیا جسے بعد میں کسی قدر ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلّہ طبیہ میں شائع کرا دیا تھا اور اس رسالہ میں پانی کے جزو بدن نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔

96-1895 میں جب ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلی تو اردو میں ایک محققانہ رسالہ لکھا جس میں طاعون کے تاریخی حالات، اسباب اور علامات درج کیے تھے اور آخر میں علاج کے طریقے نہایت تفصیل سے تحریر کیے تھے۔ یہ رسالہ کئی بار چھپا۔ اس کے علاوہ التحفۃ الحامدیہ فی الضاعۃ الکلیہ، الفاظ العان، فی اغالیط غایۃ الاستحسان، اوراق مظہرہ اور البیان الحسن، بشرح المعجون المسیٔ، اکیر الدین شائع کیں۔ ان میں الحذ الحامدیہ میں کشتہ جات کے استعمال کا جواز اور ان کے فوائد پر بحث کرتے ہوئے ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو کشتہ جات کے استعمال پر معترض ہیں۔ ایقاظ النعسان میں حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے ان اعتراضات کے

جوابات ہیں جوانھوں نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خان صاحب کے فتوائے عدم حسن جوہر دماغ پر کیے تھے۔ البیان الحسن میں علاج الامراض کی معجون لنا کے معمہ کو نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا ہے۔ اوراق مظہرہ میں بعض طبی استفسارات کے جوابات فصاحت کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ البیان الحسن کا ایک حصہ فارسی میں ہے۔ جس سے حکیم صاحب کی فارسی دانی پر روشنی پڑتی ہے۔

رسالہ فی ترکیب الادویہ؛ استخراج اللغات الطبیہ۔ اس میں مرکبات کی تیاری اور مفردات کی پہچان کی تفصیل موجود ہے۔ شرح اسباب کا حاشیہ بھی لکھا تھا۔

اگرچہ حکیم صاحب کی تمام تالیفات ان کے زمانۂ شباب کی ہیں تاہم ان میں حسن احتیاط، اجتہاد فکر اور اعتدال رائے کے وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو ایک بہترین تصنیف کے ضروری ارکان ہیں۔

حاذق:

حکیم صاحب کی یہ طبی تصنیف دراصل طب یونانی کا خلاصہ اور خاندان شریفی کا مکمل دستور العلاج ہے اس کتاب میں حکیم محمود خاں، حکیم عبدالمجید خان اور خود طبیب اعظم حکیم اجمل خان کے خاص الخاص نسخے اور طریقہ ہائے علاج درج کر دیے گئے ہیں حکیم صاحب کا نقطۂ نظر طب میں بہت وسیع تھا وہ شفا بخش نسخوں کو سینہ بہ سینہ پوشیدہ رکھنے کی مشرقی روایات کے خلاف تھے۔

حاذق بلاشبہ طبی تجربات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

شعروشاعری:

حکیم اجمل خان کو شعروشاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ شیدا تخلص فرماتے تھے۔ چونکہ قدرت نے شاعری کی خداداد صلاحیت بخشی تھی اس لیے کسی استاد کی ضرورت نہ پڑی۔ حکیم صاحب کی کوٹھی پر ادیبوں اور شاعروں کا ہجوم رہتا تھا۔ سائل دہلوی اور تاباں دہلوی دونوں بھائی شبانہ محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی رات گئے تک شعروسخن کی بزم آرائی رہتی۔ حکیم صاحب نے زندگی کے مختلف ادوار میں اور خاص طور پر قیام رام پور کے زمانے میں کبھی کبھی اشعار کہے ہیں۔ کبھی کبھی سفر میں بھی شعر کہتے تھے۔ جب سیاسی اور قومی سرگرمیاں زیادہ بڑھ گئیں۔ تو شعر گوئی کا

سلسلہ گویا بالکل ترک ہوگیا۔تاہم جو کچھ تھا وہ بھی محفوظ نہ رہا اور کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔

ان کے کلام کا کچھ حصہ دیوان شیدا کے نام سے 1926 میں پہلی بار ٹائپ میں جرمنی سے شائع ہوا تھا دوبارہ یہ مارچ 1966 میں ہندستانی دواخانہ کی جانب سے چھپا تھا۔جرمنی والے نسخہ کی طباعت ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوشش کا نتیجہ تھی۔اس شعری مجموعہ کا مقدمہ مشہور۔ادیب اور حکیم صاحب کے سکریٹری قاضی عبدالغفار نے یکم نومبر 1925 کو تحریر کیا ہے۔

غزل کا نمایاں پہلو عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔شاعر کا دل جب تک سوز عشق اور اندرونی شوق والتہاب کا شکار نہ ہو۔وہ ایک معیاری شاعری نہیں کرسکتا ہے۔

کہتے ہیں۔

چرچا ہمارا عشق نے کیوں جا بجا کیا   دل اس کو دے دیا تو بھلا کیا برا کیا

وہ خواب ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز   دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

گم کردہ راہ آتے ہیں وہ آج میرے گھر

آہ میری آہ نیم شبی تونے کیا کیا

اگر عرض تمنا کا کسی دن امتحان ہوگا   جبیں ہوگی کسی کی اور کسی کا آستاں ہوگا

آخر لبوں تک آہی گئی آرزوئے دل   کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم آبروئے دل

یہ دیوان چھوٹی تقطیع کے 100 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں فارسی کی (43 / 427) اشعار اور اردو کی (26 / 1267) اشعار غزلیں ہیں۔

دیوان شیدا کا انتساب خواجہ عبدالمجید شیخ الجامعہ دہلی کے نام ہے۔دیوان میں دو باب ہیں۔

معرکے:

حکیم صاحب کے لاتعداد ایسے واقعات ہیں جو تاریخی ہیں اور ان کے علاج ومعالجہ کی ویسے کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔چند واقعات درج ذیل ہیں۔

دہلی کے قریب ایک رئیس کی بیوی نے حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور حکیم صاحب سے اپنی کیفیت بیان کی۔مریضہ حاملہ تھی لیکن حکیم صاحب نے فرمایا کہ یہ حمل نہیں بلکہ رحم میں رسولی پیدا ہوگئی ہے۔لیڈی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا سب نے حمل قرار دیا۔بالآخر گیارہ ماہ کی مدت گزر جانے پر

آپریشن کرایا گیا۔ آپریشن میں رسولی برآمد ہوئی۔

نواب بلگرام ضلع ہردوئی کی رہنے والی ایک مریضہ بغرض علاج دہلی وارد ہوئیں ان کو سنگ مدارہ یعنی پتہ میں پتھری کی شکایت تھی۔ تمام بدن پر پھوڑے پیدا ہو گئے تھے اور بدن کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں تیرگی اور پیشاب سیاہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں وطبیبوں کا مدت تک علاج کرایا گیا۔ لیکن مطلق فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت علاج کی نہیں ہے۔ چونکہ مریضہ کمزور تھی اس لیے آپریشن بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مریضہ سب طرف سے مایوس ہو کر دہلی آ گئیں اور یہاں دو ماہ تک حکیم اجمل خاں کے زیر علاج رہیں اور بالکل تندرست ہو کر واپس گئیں۔ واپسی پر لکھنؤ میں سول سرجن صاحب کو پھر دکھایا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے دور ہو گیا۔

اسی طرح حکیم صاحب کے پیرس اور لندن کے کئی واقعات ہیں جو انتہائی تعجب خیز ہیں۔

حکیم صاحب غربا کا خاص طور پر علاج زیادہ دلچسپی سے کرتے تھے۔ ایک بہت ہی غریب مریض آپ کے پاس آیا جس کو کئی دنوں سے خون کا پیشاب آ رہا تھا اور وہ بہت پریشان تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو کچھ پیسے دیے اور کہا کہ بازار سے ملتانی مٹی لے کر آؤ۔ ایک تولہ روزانہ صبح وشام بھگو کر و چھان کر کر پی لیا کرو۔ اپنی معمولی دوا کے استعمال سے مریض چند ہی دنوں میں مرض سے نجات پا گیا۔

لقمان الملک شاہی طبیب حکیم نابینا

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم

1287 تا 1360ھ 1868 تا 1941

تاریخ میں ایسی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جو اپنے علم وفن۔ کمال وہنر کی بدولت ہمیشہ ہمیش کے لیے زندہ جاوید ہوگئی ہیں۔ ایسی ہی ہستیوں میں ایک مایہ ناز طبیب کی ہستی حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم کی بھی ہے۔

نظام قدرت ہے کہ انسان وجانوروں کے اندر قوت مدافعت موجود ہوتی ہے۔ جس کی بناپر وہ اپنی دیکھ ریکھ حفاظت۔ نشوونما کرتا ہے اور یہ تمام افعال اس میں موجود قوتوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی ایک قوت کمزور ہو جاتی ہے یا ختم وفنا ہو جاتی ہے تو دوسری قوتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قوت باصرہ اگر کمزور یا ختم ہوگئی ہے تو دیگر قوتیں جیسے قوت لامسہ، قوت ذائقہ، قوت شامہ، قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوت مدرکہ، قوت محرکہ، قوت مغیرہ، قوت غازیہ، قوت نامیہ یہاں تک کہ قوت حیات بڑھ جاتی ہے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم ہمارے ملک کے حد درجہ ماہر، صاحب علم، بہت بڑے نباض اور نہایت حاذق ومشہور حکیم ہوئے ہیں۔ سابق ریاست نظام آباد کے طبیب خاص یا

معالج خصوصی کی حیثیت سے اور فن طب میں اپنی حذاقت بلاغت و قابل طبیب ہونے کی بنا پر ان کو سارے ہندوستان میں شہرت اور عزت حاصل تھی۔

حکیم عبد الوہاب انصاری عرف نابینا حکیم تحریک آزادی کے اہم ستون و سپاہی با کمال سرجن ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ایم۔ڈی۔ایم۔ایس (لندن) کے برادر تھے۔

حکیم نابینا کے برادر خورد ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کی وہ مایہ ناز ہستی ہے جو ماہر سرجن ہونے کے باوجود طبی طریقۂ علاج کو بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اور جب کوئی ایسا مریض ان کے دواخانے میں آجاتا جس کے بارے میں وہ یہ سمجھتے کہ یہ مریض یونانی طبی طریقۂ علاج سے ٹھیک ہوسکتا ہے تو بلا وجہ اس کو کبھی بھی آپریشن کی میز پر نہ لٹاتے تھے اور ایسے مریضوں کو وہ اپنے بڑے بھائی حکیم عبد الوہاب انصاری عرف نابینا حکیم یا انگلستان کے ملاقاتی جنگ آزادی کے سپاہی اور ماہر طبیب حاذق مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کہا کرتے تھے کہ سرجن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنا نشتر استعمال کرے اور جب اچھے اچھے یا فزیشین بے بس ہوکر جواب دے دیں تو پھر سرجن کو دیانتداری کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے یعنی ایک باکمال معالج یا فزیشین کا قدم جہاں جاکر رک جاتا ہے۔ وہاں سے پھر ایک ماہر سرجن اپنا قدم اٹھاتا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بڑے وسیع النظر اور عالی ظرف انسان تھے۔ وہ اپنے پیشہ کی بڑائی اس بات میں سمجھتے تھے کہ دوسرے علوم و فنون کا بھی پاس و لحاظ رکھا جائے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وسعت قلبی اور بالغ نظری کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ

ہندوستان کے عروس البلاد شہر بمبئی میں آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ منعقدہ 1922 میں انھوں نے ایک تجویز منظور کرائی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ طب یونانی اور فن آیورویدپر بھرپور توجہ دے کر ان طبوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ کیونکہ یہ طریقۂ علاج اس ملک کے اہم طریقۂ علاج ہیں اور ہندوستان میں دیسی طریقۂ علاج کے لیے میدان کافی ساز گار

ہے کیونکہ دیسی طریقۂ علاج میں دیسی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جو اندرون ملک پیدا ہوتی ہیں اور ملک کی ہی بنی ہوتی ہیں اور ہمارے ملک کے باشندوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں۔ مزید برآں یہ سب سے بڑھ کر ان دیسی دواؤں کے مخالف اثرات بالکل نہیں ہوتے ہیں۔

خاندان:

حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان، علم، عزت اور دولت کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں اس خاندان کے افراد اپنے اعلیٰ کارناموں کی وجہ سے خاص امتیازات سے سرفراز ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کے جد امجد شیخ شہاب الدین احمد انصاری بعہد شاہ عالم غازی منصب ہفت ہزاری دبا گیر سے سرفراز ہوئے تھے اور یہ جاگیر آج تک ان کے خاندان کی وراثت میں چلی آرہی ہے۔

آپ کے والد ماجد الحاج حکیم عبدالرحمٰن انصاری جو بہت مشہور طبیب اور صاحب کمال عالم گزرے ہیں ساتھ میں سیاح ممالک اسلامیہ اور طبیب حاذق ہونے کے علاوہ شیخ طریقت بھی تھے جو بعد انتقال حیدرآباد ہی میں درگاہ حضرت نورالدین شاہ صاحب قدس سرہٗ میں مدفون ہیں۔

پیدائش:

حکیم نابینا بمقام یوسف پور ضلع غازی پور میں اسی ممتاز، منفرد و اعلیٰ گھرانے میں تولد ہوئے تھے۔ آپ کی دونوں چشم بعارضہ چیچک اوائل عمری میں خراب ہو گئی تھیں۔ جس کے بعد خدا نے بصارت لے کر بصیرت عطا کر دی تھی۔

تعلیم و تربیت:

ابتدائی تعلیم گھر کے ادبی و تعلیمی ماحول میں شروع ہوئی۔ ان کے والد نے بچہ کی ذہنی صلاحیت، قوت ادراک، تحصیل علم کی جستجو انہماک کو دیکھ کر محلہ کے اچھے اچھے علماء فضلا سے تعلیم دلائی۔ طالب علم کو نئے افق کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر والد قبلہ حکیم عبدالرحمٰن نے ایسے لائق و فائق بچے کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسی حالت میں دارالعلوم دیوبند میں آپ نے عربی میں مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور فارسی کی تعلیم مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے

حاصل کر کے عربی فارسی و حدیث کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اپنے مقصد حیات علم طب اپنے والد سے حاصل کرنے میں رجوع ہوئے۔

اس کو حکیم نابینا نے خود بھی بیان کیا ہے۔ اپنی گراں قدر تصنیف اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ میں لکھتے ہیں۔

اضعف العباد بعون اللہ تحریر لسان عرب میں ماہر اور تجربہ کار ہے۔ علوم درسیہ ادب میں بھی بڑے بڑے کملا اور ادبا مثل مولوی ذو الفقار علی صاحب دیو بندی و مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے فیضیاب ہے لیکن مادری زبان اہل ہند کی چونکہ اردو ہو گئی ہے لہٰذا مضامین اقرب الی الفہم ہونے کے لیے اردو میں تحریر کیا۔ جیسا کہ ہادی مطلق نے اشارہ فانہ لفی زبرالاولین میں فرمایا ہے۔ علوم مضامین ہیں نہ لسان۔

والد قبلہ سے تعلیم طب حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے مشہور خانوادہ طب وعلم خاندان شریفی کے مسلم الثبوت و ماہر طب حکیم محمود خاں و حکیم عبدالمجید خان سے تعلیم طب کی تکمیل اور آخرالذکر سے سند حاصل کی۔

خدمات:

تعلیم سے فراغت کر کے اپنے والد ماجد کے آبائی دواخانے میں مطب کرنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں چہار جانب شہرہ ہو گیا۔ والی ریاست حیدر آباد ہز ہائی نس میر محبوب علی خان (نظام دکن نے) ان کی حذاقت و حکمت کا چرچا سن کر اس جواہر پارہ کو اپنی ریاست میں مطب کرنے اور خدمت خلق کے ذریعہ عوام الناس کو فائدہ پہنچانے کے لیے دعوت نامہ اور سرکاری وظیفہ کی پیشکش کی۔ یہاں حکیم صاحب المعروف بہ حکیم نابینا۔ کافی عرصے تک شاہی طبیب کے عہدہ پر مقیم رہے۔ پہلے حیدر آباد جا کر حضرت غفران مکان کے عہد میں 40 سال تک بمقام پتھر گلی مطب کرنا شروع کیا تھا جہاں آپ کو بہت مقبولیت ملی اور جب عالی جاہ حضرت نظام حیدر آباد کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تو بحیثیت شاہی معالج ڈیوڑھی مبارک میں عوام کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے طبی خدمات انجام دیں۔

میر محبوب علی خان والئی ریاست حیدر آباد کے وہاں کوئی بچہ نہ ہوتا تھا۔ اورنواب حیدر آباد

جانشین تخت کے لیے بہت پریشان اور متفکر رہتے تھے۔نواب صاحب کے وہاں ان کے علاج و معالجہ سے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔نواب حیدر آباد کی حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا پر بہت نوازشیں تھیں۔یہاں تک کہ ریاست کے نظم ونسق میں بھی نواب صاحب حکیم صاحب سے صلاح ومشورہ لیتے رہتے تھے۔

میر محبوب علی خاں کے جانشین میر عثمان علی خان سے نظریاتی وذہنی اختلاف ہو جانے کے باعث حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا حیدر آباد چھوڑ کر ہندوستان آگئے۔سب سے پہلے پونا میں پھر عروس البلاد شہر بمبئی میں اور آخر میں دہلی میں مطب کرنا شروع کیا۔

قیام دہلی میں 1925 میں جامع مسجد کے سامنے جہاں پر اب ہوٹل تاج ہے ایک پوری بلڈنگ خرید کر دواخانہ مطب وقیام گاہ کی تعمیر کرائی۔

حکیم صاحب ماہر نباض ہونے کے ساتھ ساتھ مدفون پوشیدہ خزانوں کے بتانے میں ملکہ رکھتے تھے جس کی بنا پر ارباب علم وہنر کا اندازہ تھا کہ حکیم عبدالوہاب علم رمل وجفر کے ساتھ ساتھ علم نجوم کے ماہر تھے جبکہ عوام یہ تاثر رکھتے تھے کہ حکیم صاحب کا اتنے ماہر نباض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے قبضہ میں کوئی جن ہے اور حکیم نابینا عامل ہیں اور اسی وجہ سے ان کی نباضی کا بھرم قائم ہے۔

حکیم صاحب نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد کے سامنے والے مکان میں ایک خزانہ پوشیدہ ہے دوسرے دن حکیم نابینا صاحب نے وہ نیا تعمیر شدہ مکان کھدوانا شروع کر دیا تھا۔

ان کی نباضی کا شہرہ سن کر دور دراز سے علاج کے لیے مرضا ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔خدا نے ان کے ہاتھ میں صرف شفا ہی عطا نہ کی تھی بلکہ فن نباضی کا وہ جوہر عطا کیا تھا کہ وہ مریضوں سے کچھ پوچھے بغیر محض نبض سے ان کے امراض کی تشخیص کر لیتے تھے اور وہ تشخیص ایسی صحیح ہوتی تھی کہ مریض اپنا مرض اور واقعات سن کر حیران رہ جاتے تھے۔

اردو ادب کے درخشاں ستارے خواجہ حسن نظامی اول نے 13 ستمبر 1924 کے روز نامچے میں حکیم عبدالوہاب انصاری حکیم نابینا کا ایک واقعہ نبض تحریر کیا جس سے حکیم صاحب کی نباضی کا

معترف اور حکما کے فن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

"حکیم نابینا صاحب مہاراج سرکشن پرشاد کے بچوں کی نبض دیکھنے کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ میں (خواجہ حسن نظامی) حیران ہو گیا کہ رانیوں اور بیگمات اور بچوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا، خود ہی ہر بیمار کی مفصل کیفیت نبض پر ہاتھ رکھ کر بتادی اور ہر بیمار نے تصدیق کی کہ بے شک یہی حال ہے۔ اس وقت مہاراجہ نے ایک قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ حیدر آباد میں ان حکیم صاحب کو میں نے اپنے گھر بلایا۔ رانی صاحبہ کی نبض دکھانی تھی مگر بجائے رانی صاحبہ کے میں نے نبض دکھادی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا: "یہ نبض تو مہاراج کی ہے۔" میں نے (خواجہ حسن نظامی) اپنی زندگی میں ایسا کمال کسی طبیب میں نہیں دیکھا۔

خصوصیات دواخانہ:

اطبا اور حکما عام طور پر مریض کو مرض کے ازالہ کے لیے بالعموم پینے کے لیے قدحے دیا کرتے ہیں۔ لیکن حکیم نابینا نے طبی طریقۂ علاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کی دوائیاں مقدار میں بے حد قلیل ہوتی تھیں۔ مگر قدحوں سے زیادہ موثر۔

مشہور تاریخ داں اور مترجم ضیاء الدین برنی فرماتے ہیں کہ "ان کے صاحبزادوں کے ساتھ میرے دوستانہ روابط تھے وہ (حکیم صاحب) مجھے بھی اپنے بچوں جیسا سمجھتے تھے۔ مجھے متعدد دفعہ ان سے علاج کرانے کے مواقع ملے اور ہر دفعہ میں ان کی غیر معمولی حذاقت کا اثر لے کر آیا۔ انھوں نے مجھ سے کبھی دوا کی قیمت نہیں لی اور ہمیشہ قیمتی سے قیمتی دوائیں اپنے پاس سے عنایت فرمائیں۔ ان کی تیار کردہ ادویہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ صحیح اجزا پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ موتیوں کے بجائے ان میں سیپ ڈال دیے گئے ہوں یا ان کے اوزان میں کمی کر دی گئی ہو۔

خواجہ حسن نظامی نے انھیں "لقمان الملک" کا خطاب دے رکھا تھا۔

ان کے مطب میں کل 40 یا 50 دوائیں ہوتی تھیں اور وہ سب ان کے صندوقچہ میں بند رہتی تھیں۔ مرضا کو یقین تھا کہ اگر حکیم صاحب نے اپنے صندوقچہ سے دوا دے دی تو شفا یقینی ہے۔ عام طور پر اس صندوقچہ میں کشتہ جات رہتے تھے۔

اکثر ایسا ہوا کہ عطاروں سے کشتہ بنانے اور بنا کر دکھانے کو بتایا۔ حسب ہدایت عطار کشتہ بنا کر لایا حکیم صاحب نے ہاتھ لگایا اور ہدایت کی کہ کشتہ میں یہ کمی ہے۔ کبھی کبھی ان عطاروں نے بغرض امتحان پھر وہی کشتہ سابقہ حالات میں لا کر دے دیا اور کہا کہ تیار ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی کہا کہ ابھی سابقہ حالت پر ہے۔ حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا ہونے کے باوجود فن کشتہ سازی میں ماہر تھے اور اسی علم کی بدولت کیمیا بنانے کا شوق تھا۔ بقول شوکت علی فہمی مدیر دین دنیا دہلی اس شوق کی جلا کے لیے حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم نے سونا بنانے کے لیے جرمنی سے کوئی کیمیکل بھی منگایا تھا۔

حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا نے ایک عمارت طبیہ بلڈنگ کے نام سے ایک لاکھ روپے کے مصارف سے مدینہ فنڈ کے لیے تعمیر و وقف فرمائی جس کی رسم افتتاح 28 فروری 1932 کو حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ و سلطنت نے اپنے دست مبارک سے ادا فرمائے اور حکیم نابینا کے فرزند اکبر حکیم عبدالحئی انصاری ناشر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ نے سپاس نامہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

طریقہ علاج:

آپ اپنے مریض کو پہلے ایک ہفتہ کی دوا بلا قیمت دیتے تھے پھر فائدہ ہونے پر سابقہ اور موجودہ ہفتہ کی دوا کی قیمت لے لیتے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے عطار خصوصی بنام غالب تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم صاحب موصوف کے برادر خورد جب انگلستان سے واپس آئے تو ان کے عطار غالب صاحب کے لیے ایک جوڑا جوتا بھی لائے تھے۔ غالب صاحب وہ نیا جوتا پہن کر حکیم نابینا صاحب کے ساتھ کسی دیگر ریاست میں مریض دیکھنے گئے۔ راستہ میں جوتے نے کاٹ لیا۔ متعدد علاج ہندی یونانی و انگریزی کرنے پر بھی فائدہ نہ ہونے کی صورت میں کلکتہ بغرض علاج لے جائے گئے۔ وہاں بھی افاقہ نہ ہونے کی صورت میں غالب صاحب کی ٹانگ کاٹی گئی اور وہیں اسی عارضہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حکیم صاحب موصوف صبح 8:30 بجے سے 12:30 تک مطب کرتے تھے اور اس کے

بعد کسی بھی مریض کو کسی بھی صورت سے نہ دیکھتے تھے۔

فیس:

عام طور پر مریض سے اس کی حیثیت کے مطابق 10 روپے، 100 روپے اور 1000 روپے فیس تھی۔

انتقال سے کچھ عرصہ قبل آپ نے کناٹ پیلیس میں ایک وسیع وعریض بلڈنگ تعمیر کرائی تھی جہاں آپ کا آخری وقت گزرا۔

آپ نے مسلمان نرسوں کی تعلیم کے لیے گراں قدر 25000 ہزار روپے کا عطیہ بھی دیا تھا۔

مذہبی رجحانات:

حکیم نابینا صاحب مذہبی معاملے میں پکے تھے۔ بقول ضیاء الدین احمد برنی

''وہ بہت مذہبی آدمی تھے ان کا خالی وقت ورود و وظائف میں صرف ہوتا تھا''

1357ھ میں بغرض حج بیت اللہ شریف تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے وظائف پڑھنے کے لیے ایک ہزار تسبیح بھی لائے تھے انھوں نے کناٹ پیلیس نئی دہلی میں جو جائداد بنوائی تھی اس کی آمدنی کا ایک حصہ (مدینہ بازار کا) مدینہ کے مساکین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ 1947 کی ہندو اور سکھا گردی میں اس مکان کو بھی لوٹ لیا گیا۔ حالانکہ وہاں تحریک آزادی کے امام اور کانگریسی رہنما ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے حکیم عبدالحئی رہتے تھے اور مطب کرتے تھے۔

غرضیکہ حکیم صاحب حدر درجہ متقی اور دین دار و پرہیز گار شخص تھے اور آپ حاجی، حافظ، محدث ہونے کے علاوہ طبی دنیا میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔

تصانیف:

آپ نے موضوع ''نبض'' (جس پر آپ کو خدا نے خداداد صلاحیت ودیعت فرمائی تھی) پر اسرار شریانیہ مع مجربات انصاریہ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ جو آپ کے غیر معمولی حافظہ اور مجربات دواخانہ ومطب نیز رموز نبض اور نباضی پر مشتمل ہے۔

آپ ماہر نباض کے طور پر طبی دنیا میں خاص شہرت کے مالک ہیں اور آپ (حکیم نابینا) کی

نبض شناسی کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔

وفات:

آپ کا انتقال پر ملال بمقام دہلی 7 ربیع الثانی 1360ھ مطابق نومبر 1941 کو ہوا اور ہزار ہا اشخاص کی دعاؤں کے ساتھ انھیں سپردخاک کیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مرحوم حکیم صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ان میں خدمت الناس کی غیر معمولی لگن تھی۔ زبان پر ہمیشہ اللہ اور رسول کا ذکر رہتا تھا۔

پسماندگان:

الحاج حکیم عبدالرحمٰن صاحب انصاری کے 3 فرزند اکبر تھے۔

(1) حکیم عبدالوہاب انصاری جن کا تذکرہ درج بالا ہے۔

(2) ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ یہ حکیم صاحب مغفور کے برادر خورد۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ڈاکٹر اور کانگریس پارٹی کے روح رواں تھے۔ حکیم اجمل خاں کے تمام سیاسی، سماجی اور طبی کاموں میں شریک کار تھے۔ چنانچہ طبیہ کالج دہلی کی داغ بیل ڈالنے میں آپ کا سب سے بڑا حصہ تھا۔

(3) عبدالرزاق انصاری یہ نواب رضا جنگ مرحوم کے سررشتہ مال میں ترقی کرتے ہوئے اورنگ آباد کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری نے تین صاحبزادے اپنے بعد اپنی یادگار چھوڑے تھے۔

حکیم محمد عبدالحئ انصاری جو حکیم صاحب کے ساتھ اور بعد میں حکیم کی مسند پر بیٹھے۔

حکیم عبدالقادر جو تقسیم سے پہلے لاہور چلے گئے تھے۔

حکیم مولوی عبدالغنی المعروف خسرو شاہ نظامی جو حیدرآباد میں دواخانہ و مطب کرنے لگے تھے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری کے انتقال پر نہ صرف طبی دنیا میں بلکہ ہندوستان بھر میں افسوس کیا گیا۔

ادبا وشعرا نے نذرانہ عقیدت پیش کیے اور قطعات تاریخ وفات و مادہ تاریخ رحلت ذیل مادہ تاریخ شائع کیا۔

پیش گاہ حضرت غلل سبحانی سے اخبار صبح دکن مورخہ 8 ربیع الثانی 1360ھ کو حسب ذیل مادہ تاریخ شائع کیا۔

انتقال حکیم عبدالوہاب انصاری دہلوی۔

ماحکیم موصوف راخوب می دانستیم کہ اوفی الحقیقت درفن طب ید طولے می داشت وہم محدث وزاہد ومتقی بود خصوص درفن نباضی مشہور بود بہرحال برزبان ماست۔

مادہ تاریخ رحلت

بہ دار طب علی ابن سینا رسیدہ	ہماں جائیکہ نابینا رسیدہ
مریضاں ایں نعم گفتند عثمان	چہ ماتم بینائے دار سیدہ
1042	(درمیان ما) 1941

رائے استاد جلیل:

بیلا جواب مادہ تاریخ نکلا ہے حکیم صاحب کے خاندان کو اس پر ناز کرنا چاہیے۔

از صبح دکن مورخہ یکم تیز 135ف

طبی معرکے:

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا نے حیدرآباد، پونا، بمبئی اور دہلی میں ایسے معرکے علاج کیے ہیں کہ اگر وہ سب معرض تحریر میں آجائیں تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔ ان کی بدولت ہر جگہ یونانی طب کا نام بہت روشن ہوا حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان میں طب یونان کا آفتاب غروب ہو گیا۔

اردو شاعری کی آبرو علامہ اقبال کو بھی ایک بار حصاۃ الکلیہ (گردے کی پتھری) کا عارضہ ہو گیا۔ ہندوستان کی نامی گرامی شخصیتیں حکیم صاحب کے علاج سے مستفید ہو چکی تھیں اور حکیم صاحب موصوف کے صندوقچے کے علاج کا بڑا شہرہ تھا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں آپریشن کے سوا دوسرا کوئی طریق کار نہ تھا اور آپریشن کے لیے بھی یہ

طے پایا کہ ویانا (آسٹریا) میں ہو تو بہتر ہے۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے چند احباب کے مشوروں سے یہ طے پایا کہ حکیم صاحب کا علاج شروع کیا جائے۔

علامہ اقبال حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے اور اپنی نبض دکھائی۔ حکیم نابینا کی دوربین نظروں نے سمجھ لیا کہ کثرت سے مے نوشی اور گوشت خوری کے سبب سے گردہ میں (URIC ACID) کے جماؤ سے پتھر ہو گئے ہیں۔ دوسرے روز حکیم صاحب نے قارورہ کا بغور معائنہ فرمایا اور علاج شروع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے پتھری نکالنے والی دوائیں استعمال کرائیں اور اپنے صندوقچۂ خاص سے کشتہ حجرالیہود عقربی (بچھووالا) دینا شروع کیا۔ خدا کے فضل سے علامہ ڈاکٹر سر اقبال کی ساری پتھریاں نکل گئیں دوبارہ ایکسرے میں نظر نہ آئیں حکیم صاحب نے درج بالا پرہیز کی ہدایت کی اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ہمیشہ ہمیش کے لیے اس مرض سے نجات پائی۔

اپنی آخری بیماری میں بھی ڈاکٹر اقبال حکیم صاحب کے زیر علاج تھے۔ جبکہ ڈاکٹری علاج سے ڈاکٹروں کو ان کی حیات کی کوئی امید نہ تھی۔ علامہ اقبال کے پسماندگان بھی مایوس ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں حکیم صاحب نے اپنے صندوقچے کی خاص دوا روح الذہب اور روح الفضا (جو بتدریج سونے اور چاندی کے محلول کا مرکب ہوتا تھا) کی چند خوراک علامہ اقبال کی خدمت میں بھیجی۔

تیز اثر دوا نے اپنا کام خدا کی مرضی سے حسب امید کیا اور مریض صحت یاب ہو گیا۔

علامہ اقبال نے حکیم صاحب کی دوا روح الذہب کے بارے میں 1937 میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر روانہ کیا۔ بطور اظہار تشکر۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی مرا
رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوق طلب

ایک شعر یوں بھی ہے۔

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تن خاکی مرا
ایک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب

ایک ، جو اللہ نے بخشی ہے مجھے صبح ازل دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی روح الذہب

ایسے تھے پہلے زمانہ کے قابل ذہن اور ولی اللہ صفت حکیم اور یہ تھے ان کے کمال۔

اسی لیے اطباء قدیم کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ علم طب کے اسرار و رموزات کتابی شکل میں عام نہ کیے جائیں اور ان کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا جاتا رہے۔ تاکہ یہ علم باصلاحیت، خلیق، عمیم اور فہم مستقیم ہی کو ملے۔ اسی لیے سلف روحانی اس طرز طریقہ کو کامل طور پر حاصل کیا کرتے تھے۔

سقراط و بقراط اور افلاطون وغیرہ سب کے سب موحد اور بڑے پیمانے پر مجاہدہ باطنی کیا کرتے تھے بسا اوقات افلاطون دور آبادی سے عشق الہٰی میں غرق ہو کر گریہ و زاری اور آہ و بکا راس قدر بشدت آواز کیا کرتے تھے کہ ایک ایک میل دور تک ان کے رونے اور خدا کے حضور میں گڑگڑانے کی آواز جاتی تھی اور ان کے شاگرد رشید اس آواز کی وجہ سے ان کو تلاش کر لیا کرتے تھے۔

غرضکہ انسان کی بینائی کو ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر بصارت نہ بھی ہو تو بصیرت ضرور ہونا چاہیے۔

حکیم حاجی قاضی سید کرم حسین قادری

1870 بابت 1287ھ   جون 1935

تصوف وسلسلۂ عالیہ وقادریہ کا نقیب

خاندان:

مسلمانوں کے عہد عروج واقتدار میں ایک نئے اُفق کی تلاش شوق تبلیغ اور اس خطۂ ارض کی مخصوص کشش کی وجہ سے وسط ایشیاء اور اس کے قریبی علاقوں سے جوق در جوق قافلے ہندوستان آئے۔ ان واردان ہندوستان میں حکیم سید کرم کے اجداد بھی تھے جنھوں نے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں چنگیز خاں کے کشت وخون نیز غارت گری سے گھبرا کر لٹ پھنک کر سرزمین ہند کا رخ صرف اس لیے کیا تھا کہ یہاں ایک وسیع اور پائیدار نہ صرف اسلامی حکومت قائم تھی بلکہ ہر چہار جانب امن وامان تھا بلکہ زرخیزی بھی تھی۔

ان کے اجداد ہمیشہ سے دار القضاء، افتا اور محتسب کے عہدوں پر فائز رہے تھے اس لیے قاضی کے خطاب سے عوامی طور پر پہچانے جانے لگے۔ ان کے والد قاضی سید امداد علی 1809 کو قصبہ ساکرس میں پیدا ہوئے۔ جب حکیم سید کرم علی کے دادا کی عمر 6 سال تھی تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اسی بنا پر حکیم کرم علی کے والد نے ساکرس ضلع گڑگاؤں کو (جواب ہریانہ میں ہے) چھوڑ کر تجارہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حکیم کرم علی کے والد قاضی امداد علی نے ناگپور

میں مہاراجہ بھونسلے کے وہاں فوجی خدمات انجام دیں۔ وہاں ان کو عزیزوں کا رسالہ مع نقارہ 100 سواروں پر مشتمل تھا۔ حاکم وقت کے ساتھ تنازعہ ہو جانے پر حکیم کرم علی کے والد اپنے احباب وعیال کے ساتھ تجارہ واپس آگئے۔

پیدائش:

1287ھ/1870 میں تجارہ جو ریاست الور راجستھان کا ایک حصہ تھا۔ وہاں سادات گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کا اصل نام سید محمد سلیم الدین تھا لیکن گھریلو نام جو ان کی عمہ محترم صدیق النسا بنت غلام عسکری نے (آقائے نامدار کے بھانجے حضرت حسینؓ کے کے نام پر رکھا تھا کیونکہ حضور کو اپنی آل سے جتنی محبت تھی وہ اظہر من الشمس ہے) کرم حسین رکھا۔ بھوپال سے حافظ غلام احمد فروغی نے جن سے ان کے خاندان کے قریبی مراسم تھے انھوں نے ایک تاریخی نام بلند اختر تجویز کیا تھا اور واقعی خدا کا کرم ایسا ہوا کہ یہ مانند ستارہ دنیا میں چمکے۔

حکیم سید کرم کی پیدائش کے وقت غدر کا پر آشوب دور دورہ گزر چکا تھا جس کی بنا پر عظیم تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے ذہنوں میں ان دنوں میں عظیم انقلاب کے دوررس اثرات مرتب ہونے لگے تھے۔ ان کے والد کی پیرانہ سالی اور نومولود کی صغرسنی، گردش دوراں، وقت کی نزاکت احساس۔ ان تمام عناصر نے مل کر کرم حسین کی خصوصی تعلیم وتربیت پر ان کے والدین کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خاندان کے واحد چراغ کو تعلیم کے زیور سے مزین کریں۔

تعلیم وتربیت:

دستور زمانہ کے مطابق سید کرم حسین کی تعلیم وتربیت کا آغاز بھی گھر سے ہی ہوا اور بعمر 4 سال 4 ماہ 4 دن رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔ چونکہ ان کے والد ماجد خود بھی عربی وفارسی کے استاد کامل تھے اور درس وتدریس سے سابقہ تھا۔ جس کی بنا پر فارسی کے ابتدائی اسباق والد گرامی سے پڑھے۔ اس کے بعد تجارہ کے دوسرے اساتذہ سے فارسی وعربی کی مزید تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے شفیق استاد مولوی حسین الدین مدرس راج مدرسہ تجارہ تھے۔ جن کی تربیت اور حسن اخلاق سے سید کرم حسین نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ تجارہ کے سرکاری مدرسہ میں درسی کتب کی تکمیل کی۔

دوران تعلیم جب ان کی عمر بمشکل 9 سال کی تھی کہ ان کے والد قاضی سید امداد علی داغ

مفارقت دے گئے۔ ایسے مشکل دور میں شفیق ماں فیاض النسا نے جس طرح ان کی تعلیم و تربیت اور تعلیم دلائی، وہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ انھیں کا حصہ تھا۔

ان کی والدہ ماجدہ فیاض النسا کو شادی کے صرف دس سال بعد شوہر کی جدائی کا حادثہ جانکاہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس غم واندوہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی بصارت جاتی رہی۔ بصارت سے ضرور محروم ہوگئی تھیں لیکن بصیرت کی دولت سے مالا مال تھیں۔ فہم وفراست، سلیقہ مندی نیز حسن اخلاق کا نمونہ تھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔ انھوں نے کرم حسین کی شادی کے کچھ عرصہ بعد بہو کو سینے کے لیے کپڑا دیا۔ کپڑا سی کر جب وہ خوش دامن صاحبہ کے پاس لے گئیں تو انھوں نے سیون اور تر پن کی تعریف کی لیکن کہا کہ۔ بہو تم الٹا کپڑا سی لائی ہو۔ بہو (حکیم النسا) نے بیان کیا ہے کہ وہ کپڑا ایسا تھا جس کے الٹے سیدھے کی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں جانب سے کپڑا ایک سا معلوم ہوتا تھا۔ خوش دامن صاحبہ کے کہنے پر جب غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ انھوں نے بجا فرمایا ہے۔

بچوں کی تربیت جس اخلاق سے ماں نے کی وہ لائق تعریف ہے۔ حکیم کرم حسین اپنی اوج ورفعت کو دیکھ کر کہتے تھے کہ آج ان کو جو قدر ومنزلت اور بام عروج حاصل ہوا ہے وہ سب ان کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

1897 میں جب حکیم کرم حسین مطب کرنے لگے تھے تو ایک صاحب حیثیت مریض ان کے دواخانے میں ہاتھی پر سوار آیا تو انھوں نے اپنی والدہ سے اس مریض کا ذکر کیا تو انھوں نے دعا دیتے ہوئے فرمایا۔ ''بیٹا خدا نے چاہا تو خود تمھارے یہاں ہاتھی ہوں گے۔'' باری تعالیٰ نے ماں کی یہ دعا قبول کی اور واقعی کرم حسین کے یہاں ہاتھی جھولے۔ اسی طرح جب کرم حسین اپنی والدہ سے مطب میں آنے والے مریضوں اور حاکم وقت کے بارے میں بتاتے تو والدہ عرض کرتیں کہ یہ کیا ہے۔ اس سے بھی بڑے آئیں گے۔ خدا نے فیاض النسا جیسی صابرہ وشاکرہ ماں کی یہ دعا بھی قبول کی اور بڑے سے بڑے حاکم مریض بن کر دواخانے میں آئے۔ جن میں انگریز وزیر اعظم اور والیٔ ریاست ہز ہائی نس مہاراج جے سنگھ کا نام نامی اسم گرامی قابل ذکر ہے اور یہ سب مادر گرامی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

طبی تعلیم:

6سال کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد بعمر 14 سال ان کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا مسئلہ ماں کے پیش نظر تھا۔ ایسے وقت میں ایک جانب سرسید اپنے رفقا کے ساتھ قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے تھے تو دوسری جانب قدیمی اخبارات کے مسلمان انگریزی تعلیم و تربیت کے خلاف محاذ آرائی کیے ہوئے تھے۔ ایسے پرآشوب دور میں ماں نے کرم حسین کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے طب کی تعلیم دلانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ ان کے اس فیصلہ میں خاندان کے دیگر بزرگوں کا مشورہ تو داخل ہی تھا، کرم حسین کے نانا حکیم غلام حسین کا مشورہ بھی پیش پیش تھا جو ایک کامل و حاذق طبیب تھے۔ یہ فیصلہ ایسے وقت میں ماں نے کیا تھا جبکہ شوہر کے انتقال کو صرف پانچ سال کا وقفہ گزرا تھا۔ کرم حسین اپنے خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ گھر میں گزر بسر کے لیے بفضل تعالیٰ اتنا کچھ تھا کہ آسانی سے فکر معاش کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن ماں نے عزم و حوصلہ اور دور اندیشی کو بروئے کار لاتے ہوئے تیزی سے بدلتی ہوئی انقلابی تبدیلیاں کے پیش نظر سیکڑوں سال سے ورثہ میں مل رہی قصبہ سا کرس کی قضاۃ پر قناعت نہ کرتے ہوئے بیٹے کو طبی تعلیم کے لیے میرٹھ عازم سفر کیا۔ جہاں یہ مشہور و معروف طبیب حکیم محمد حسن حاذق کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ قیافہ شناس اور لائق و فائق استاد نے شاگرد کے چہرے پر ذکاوت و ذہانت کے آثار نمایاں پائے۔ کمال ہمدردی سے گلے لگایا اور ان کی ذہنی و فنی تربیت میں پورے انہاک سے اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ حکیم محمد حسن سے طبی درسیات کی تکمیل اور فنی رموز و نکات کے علاوہ مطب اور نسخہ نویسی کی تعلیم حکیم بلدیو سہائے سے حاصل کی۔ میرٹھ اس زمانے میں، طبی و علمی اعتبار سے حکیم محمد حسن حاذق اور عملی و معالجاتی اعتبار سے حکیم بلدیو سہائے کو خاص امتیاز اور ملکہ حاصل تھا۔ جن کے مطب میں دور دور سے طلبا نسخہ نویسی کی مشق کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

ایک باکمال شاگرد کی طرح حکیم سید کرم نے بھی اپنے استاد اعلیٰ حکیم بلدیو سہائے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے۔

حکیم علو قدر بلدیو سنگھ سر چرخ پر ان کا ذہن رسا
ند میں سے ثریا تک خلق میں نہیں ان کا ہمر کوئی دوسرا

تجارہ میں فن خطاطی کا علم چونکہ سیکھ چکے تھے۔ جس کی جلا میرٹھ میں ہوئی۔ وہاں پر نستعلیق اور نسخ دونوں میں کمال حاصل کیا جو ان کی آئندہ زندگی کے لیے ترقی کا زینہ ثابت ہوئی۔ ان کی تحریریں خطاطی کا بیش قیمت ۔ رثہ معلوم ہوتی ہیں۔ میرٹھ میں ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق جو ایک کثیر کتب کے مصنف تھے ان کی بیشتر کتب کی کتابت فرط تعلق اور عقیدت کی بنا پر خود حکیم کرم حسین نے کی۔ یہ بڑے شغف ایثار اور ذوق علم کی علامت تھی۔ حکیم کرم حسین نے اپنے استاد طب کی جن کتب کی کتابت کی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) معجون حیات مطبوعہ 1308ھ مطابق 1891

(2) ترجمہ افسرائی // شعبان 1309ھ مطابق مارچ 1892

(3) توضیع الادویہ // 1311ھ مطابق 1893

(4) ترجمہ قرابادین اعظم مطبوعہ 1894

ان کی کتابت شدہ کتاب معجون حیات میں آپ کی کتابت کی شان میں مشہور شاعر گوہر علی میرٹھی نے مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

ہیں رئیس تجارہ قاضی جی کاتب اس کے بشان و باشوکت

نام نامی کرم حسین اُن کا نیک خو خوب رو و خوب صفت

رشک یوسف لکھوں اگر اُن کو تو زلیخا کو آئے گی غیرت

کیا ہی خوشخط لکھا ہے اور واضح

آپ نے نسخہ یہ بصد صحت

توضیع الادویہ جس کی کتابت بھی کرم حسین نے کی تھی ان کی کتابت کی شان میں درج ذیل الفاظ تحریر کیے گئے ہیں جو کتاب میں شامل ہیں۔

از سرمایۂ بلاغت پیرایۂ فصاحت گوہر درج فضل و کمال فرخندہ سیرت حمیدہ خصال مقبول دارین قاضی حکیم سید کرم حسین صاحب ناطق رئیس تجارہ متعلقہ ریاست الور سلمہ اللہ تعالیٰ

اسی طرح قرابادین کے ترجمہ میں جو ان کے استاد محترم کی تحریر کردہ تھی۔ اس کتاب میں بھی اسی طرح ان کی کتابت کی تعریف کی گئی ہے۔

میرٹھ میں حکیم سید کرم حسین کا 1884 سے 1894 تک یعنی دس سال قیام رہا۔ درسیات طب کی تعلیم کے علاوہ وہاں انھوں نے چند سال طبیب کے فرائض بھی انجام دیے۔ خصوصاً منشی اعجاز علی کے دواخانے میں کچھ عرصہ انھوں نے مریضوں کی بھی دیکھ ریکھ کی۔

میرٹھ میں 10 سال قیام اور مطب کے نتیجہ میں وہاں ان کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا جس میں بے تکلف احباب کے علاوہ مرضا کی بھی ایک خاصی تعداد تھی۔ طبی محافل اور علمی وادبی مجالس میں ان کی شرکت برابر رہتی تھی۔ عام شاعروں سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن مخصوص شعری نشستوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ نہ صرف کلام سنتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ سیرت اور دیگر موضوعات پر مذہبی تقریروں کی وجہ سے انھیں مذہبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کے میرٹھ کے خاص دوستوں میں منشی احتشام علی قابل ذکر ہیں۔

میرٹھ میں حکیم صاحب سے مستقل قیام کا اصرار رہا خود ان کا ایسا ہی ارادہ تھا لیکن والد نیز دیگر اعزا کی فرمائش کے آگے یہ خیال ترک کر کے 1894 میں وطن واپس آگئے اور تجارہ میں مطب شروع کیا۔ تشخیص وتجویز پر ملکہ اور دست شفا کی وجہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شہرت آس پاس کے علاقوں تک پھیل گئی اور بہت جلد ان کا مطب مرجع مرضا بن گیا۔

حکیم کرم حسین کے مزاج میں نفاست اور پاکیزگی حد درجہ تھی ملازمت کی بندشیں انھیں کہاں گوارہ ہوسکتی تھیں۔ لہٰذا ملازمت کی جو بھی پیشکش انھیں ملیں وہ انھوں نے قبول نہیں کیں۔ حافظ غلام احمد فرونی جنھوں نے ان کا نام بھوپال سے بلند اختر تجویز کر کے روانہ کیا تھا۔ انھوں نے بھوپال کے صفیہ طبابت میں بحیثیت سرکاری طبیب کی پیش کش کی۔ حکیم سید کرم علی 1895 میں بھوپال گئے ضرور لیکن چند یوم قیام کر کے حافظ غلام احمد سے معذرت کر کے واپس آگئے کیونکہ ان کو اپنے فن پر بھرپور اعتماد اور ان کے بلند حوصلہ کا یہی تقاضا تھا جسے انھوں نے طبی تعلیم کے دوران منتہائے نظر بنا رکھا تھا۔

تجارہ میں مطب میں نمایاں کامیابی ملنے کے بعد 1896 میں انھوں نے پہلے دواخانہ حکیم کرم حسین پھر دواخانہ شفاالامراض کے نام سے دواخانہ کھولا۔ یہ دواخانہ انھوں نے تازہ معیاری اور عمدہ دوائیں مریضوں کو فراہم کرنے کی غرض سے کھولا تھا۔ اس دواخانہ کی تیار کردہ دوائیں۔

آسام، بنگال، بہار، پورٹ بلیر، سیلون عدن، ہانگ کانگ، نیپال، کلکتہ، حیدرآباد، سندھ و دکن کراچی سکھر بلوچستان میں کوئٹہ چمن۔ افغانستان میں بنوں، کوہاٹ، پیشاور، دردش، مالاکنڈ، چترال اور ریاستوں میں جموں وکشمیر، پونچھ، پٹیالہ، بہاول پور، گوالیر، بنارس، جے پور قرولی، جادرہ، بڑودہ، بھوپال، کوچین وغیرہ جایا کرتی تھیں۔

کھیر یل ریلوے اسٹیشن جو تجارہ سے سترہ میل دور تھا پھر بھی مریض کافی تعداد میں آتے تھے۔ قصبہ تجارہ میں حالانکہ ایک ڈاکخانہ پہلے بھی تھا لیکن چونکہ حکیم سید کرم حسن کے دواخانہ کا کام اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ مزید ایک ڈاکخانہ کی ضرورت ہوئی۔ مسٹر بولرڈ سپرنٹنڈنٹ جو بعد میں سرکل پوسٹ ماسٹر جنرل ہوئے دواخانہ آئے اور ان حضرات کی سفارش پر ایک نیا ڈاک خانہ دواخانہ کے کام کے لیے دواخانہ میں 1920 میں قائم ہوا جو آزادی کے وقت تک رہا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے وقت کے نامور اطبا ہند سے جیسے شفاء الملک حکیم حافظ اجمل خان۔ شفاء الملک حکیم عبدالرشید۔ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی، حکیم حافظ عبدالولی، لکھنؤ کے حکیم مولوی احمد حسین، الہ آباد کے حکیم امیر سنگھ، دہلی کے بابائے طب حکیم فرید احمد عباسی، شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں پٹیالہ، حکیم احمد الدین، حکیم فیروز الدین، حکیم غلام محی الدین لاہور کے، حکیم عبدالقادر خان افسر الاطبا بھوپال اور حکیم سید عبدالحمید (مرجع البحرین) بھوپال کے شفاء الملک حکم حبیب اللہ خان اجمیر، شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریا آبادی، حکیم فقیر محمد چشتی لاہور حکیم ہادی رضا لکھنؤ، حکیم وہاج الحق، حکیم خواجہ کمال الدین لکھنؤ، حکیم محمد حسن قرشی، حکیم محمد شریف لاہور، حکیم غلام کبریا خان، حکیم محمد الیاس خان، حکیم محمد فضل الرحمٰن، حکیم محمد کبیر الدین، حکیم مصطفیٰ خان، میرٹھ، حکیم حبیب الرحمٰن خاں ڈھاکہ (طبیب نواب صاحب ڈھاکہ) سے قریبی و دیرینہ مراسم تھے۔

بوقت انتقال حکیم اجمل خان سے خصوصی تعلق کی بنا پر 1927 میں حکیم صاحب کے انتقال پر ملال پر جو وفات کی تاریخ نکالی وہ مندرجہ ذیل ہے اور اس قطعہ کو انھوں نے اپنے رسالے ''مسیحائے زماں'' کی اشاعت میں مضمون کے ساتھ درج کیا تھا۔

ناطق سے تاریخ ہوا غلطاں و پیچاں
ہاتف کی ندا آئی کہو الغفر لہٗ ۔ 1346ھ

ان کو جتنا کتب کی خریداری کا شوق تھا اتنا ہی کتب بینی کا۔ان کے ذاتی کتب خانے میں دس ہزار نادر کتب کا ذخیرہ تھا اور اس ذخیرے میں کئی سوقیمتی مخطوطات کے علاوہ تصوف، مذہبیات، تاریخ، تذکرہ، فرامین شاہی، علماومشائخ کی بعض نادر تحریریں، پرانے جرائد، نیز رسائل وغیرہ کے فائل تھے۔

شعری وادبی ذوق:

اطبا کا تعلق نہ صرف شعروادب سے بلکہ سیاست، سماج، مذہب نیز ادب کے ساتھ قریبی رہا ہے۔ یہ روایت ہر دور کے اطبا کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے یا پھر ہند کے۔

حکیم سید کرم حسین جو اطبا قدیم کی طبی، تہذیبی اور ادبی روایات کے امین تھے۔شعروادب کا بڑا نکھرا ذوق رکھتے تھے اور ناطق تخلص فرماتے تھے۔اشارت علی خان صدق میرٹھی ان کے استاد سخن تھے۔حکیم سید کرم حسین نے استاد کی شاعرانہ خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

کہ اس فن میں شاگرد ہوں، ہوں صدق کا

قیام میرٹھ میں جہاں علمی وادبی نہ صرف ماحول تھا بلکہ شعروادب کا مرکز تھا۔حکیم سید کرم حسین نے وہاں خاصی تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہیں۔لیکن تجارہ واپسی پر تصوف کی جانب رجحان۔تصنیف وتالیف کا شوق نیز مصروفیات دواخانہ اس شوق میں مانع ہوتے گئے۔

حکیم کرم حسین نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں بڑی شعریت، سادگی روانگی اور صناعی موجود ہے۔اگر ان کی نظموں کا صوری ومعنوی محاسن کا تجزیہ کیا جائے تو بآسانی ان کے مرتبے کا تعین کیا جاسکتا ہے وہ سیدھے سادے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر کمال قدرت کے ساتھ ادا کردیتے ہیں۔نظمیں پورے حسین، التزام کے ساتھ کہی گئی ہیں اور ایک اچھی نظم کے لیے جتنی چیزیں درکار ہوتی ہیں، کلام ناطق میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ایک طویل نظم میں فضائل حج کا بیان جس طرح کیا ہے وہ کتنا خوش کن ہے۔

ہو اگر مقدور زاد راہ کا　　فرض تم پر حج ہے بیت اللہ کا
یوں ہیں ارشاد رسولؐ کردگار　　حج نہیں کرتے جو مومن مال دار

مال داری کچھ نہ پہنچائے گی سود — حشر میں ہوں گے نصاریٰ و یہود
زور و زر جب دے دیا اللہ نے — پھر رہیں محروم جو اس فرض سے
کافروں میں ان کا ہوتا ہے شمول — ڈال ایسی زندگی پر خاک و دھول
زندگی دو روز کی ہے دوستو! — موت سر پر ہے کھڑی غافل نہ ہو
یوں کہاں حضرت عمرؓ نے تین بار — حج ادا کرتے نہیں جو مال دار
چاہتا ہوں حکم دوں ان کے لیے — جزیہ دیں وہ کافروں کے طور سے
ایسے لوگوں کو اگر دیکھوں ابھی — گھر جلا دوں ہے قسم اللہ کی
بعض اصحاب رسولؐ کبریا — سخت نفرت ان سے رکھتے تھے سدا
بعض بے زر مفلسوں کا ہے یہ حال — چل دیے کرکے توکل کا خیال
نہ سواری ہے نہ زاد راہ ہے — کہتے ہیں رزاق بس اللہ ہے
منع قرآن میں خدا نے کر دیا — منع کرتے ہیں حبیب کبریا

مت رکھو ایسے توکل پر قدم
دوسروں پر بار بننا ہے ستم

غرض زبان و بیان اور لب ولہجہ کے اعتبار سے ان کے ادب پارے اپنے دور کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو حسین سانچہ میں ڈھالنے اور ادب وشاعری کے گلشن کو بھونڈے اور بھدے الفاظ سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف مواقع پر قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔

ہیں میرے استاد مسیحائے زماں — وصف میں جن کے زبان نطق لال
نام سے ان کے شفا کو ہے فروغ — ایسے دیکھے ہی نہیں صاحب کمال
اگر محمد ہو سرتاج حسن — نام روشن ان کا ہو بے قیل و قال
ایسی کچھ ادویہ کی توضیح کی — تھا بہت مشکل اگر کیجیے خیال

سن اگر تاریخ کا پوچھے کوئی
کہیے ناطق نسخہ لا مثل و مثال 1893

مصرعہ کی چستی اور کلام کی پختگی ایک ایک شعر سے نمایاں ہے۔ تیسرے شعر میں مصنف کا نام (محمد حسن) اور چوتھے شعر میں کتاب کا نام (توضیح الادویہ) کس خوب صورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

حکیم صاحب نے صوفیانہ اور مذہبی خیالات کے علاوہ طبی مسائل کو بھی نظم کی زبان میں قلمبند کیا ہے۔

یہ نسخہ پرانا جو اعظم کا ہے　　قرابا دین ہے نام اس کا بڑا
زبان عجم میں تھا جلوہ فگن　　پڑا رہتا تھا بیچ میں مدعا
خیال آ گیا بیٹھے بیٹھے جو کچھ　　کیا اردو کر کے پھر اوس کو بتا
فصاحت ٹپکتی ہے ہر لفظ سے　　ہر اک فقرہ آئینہ پر ضیا
کیا سخت مشکل کو کیا سہل تر　　مترجم کے حق میں کریں سب دعا
خیال آیا تاریخ اس کی لکھوں　　کہ اس فن میں شاگرد ہوں صدق کا

ندا آئی ناطق سرچرخ سے
مسیحائے اعظم کو زندہ کیا

1312ھ

ایک منظوم طبی رسالہ نصاب الطب جوان کی اور ان کے استاد طب کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اس میں ادویہ مفردہ کے مترادف نام اور طبی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں۔

گوکھرو ہندی تازی ہے خسک　　فارسی خار خسک بے شبہ وشک
کہتے ہیں آلو بخارا جس کو سب　　بولتے اجاص ہیں اس کو عرب
عشر تازی۔ ہندی ہے آکھ اور مدار　　فارسی میں جان خرک اے ہوشیار
ہے انگن ابخرہ اے رشک ماہ　　دیسی اجوئن سمجھ تو نانخواں
ہے میاں جو ہی، چنبیلی یاسمین　　ورد احمر ہے گل سرخ اے حسیں
سیوتی نسرین ہے اے باخبر　　کیوڑہ کو جان کاذی اور کدر

اسی طرح کتاب اصول صحت میں امراض کا علاج نظم کیا گیا ہے۔

پوست خشخاش رکھ لے پیس کر — ہے تپ لرزہ کو نافع بیشتر
نیم ماشہ نیم ماشہ تین بار — فاصلہ سے تو کھلا قبل از بخار
پھر تپ لرزہ نہ آئے گی کبھی — دے پلا تھوڑا سا آب گرم بھی

شاگرد:

یوں تو حکیم سید کرم حسین کے شاگردان رشید کی فہرست طویل ہے لیکن شعر وادب کے میدان میں فرحت علی فرحت نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔

مذہبی رجحانات:

مخصوص دینی ماحول میں پرورش کا حکیم صاحب کی نشو ونما پر گہرا اثر پڑا۔ اوائل عمری میں عام طور پر مذہبی اعمال کی جانب زیادہ توجہ نہیں ہوتی اور اکثر کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ حکیم سید کرم حسین عمر کے اس ابتدائی دور میں بھی فرائض کی انجام دہی سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اعمال صالحہ اور نماز کی پابندی کا خاص اہتمام فرماتے۔ اس کی ادائیگی میں انھیں ایک خاص سرور حاصل ہوتا تھا۔ وقت سے پہلے اس کی تیاری کرنے اور بڑے خشوع وخضوع سے اس میں مصروف رہتے۔ یاد الٰہی ان کے نزدیک ہزار بادشاہی سے بہتر تھی۔ اٹھاون سال کی عمر میں بھی ان معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ سب والدین کی پرورش و پرداخت نیز گھر کے علمی ادبی نیز مذہبی ماحول کے نمایاں اثر کی بنا پر تھا۔

حکیم سید کرم حسین اپنے صوفی مسلک اور مذہبی رجحانات کی حامل ایک ایسی شخصیت تھی جس کے سب مداح تھے۔ حکیم صاحب اپنے مشرب میں صلح کل وصلح عام کے قائل تھے اور خدا کی رحمت عام کا تصور ان کے دل میں شدت سے موجزن تھا۔ علما کے باہمی قضایا اور اختلافات سے ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "مسلمانوں کی بڑی صلاحتیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے میں صرف ہوتی ہیں باہمی اتحاد و اتفاق کی اس قدر کمی ہے کہ جگہ جگہ اس اختلاف کے مظاہرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ والصلح خیرا اور رتخلو ا باالله پر کوئی عمل نہیں کرتا۔"

پھر ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ "کیسے علما ہیں کہ اپنے آپ کو وارث الانبیا کہتے ہیں۔ کیا انبیا کرام ایسے ہی تھے کہ خدا کے ارشادات کے خلاف اپنے بیان اور اپنے اقوال کو ترجیح دیں۔"

مناظرہ بازی اور ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور علما کے باہم جھگڑوں پر وہ کڑھتے تھے۔ مزاج میں شدت اور غلو نہیں تھا۔ قادری نسبت اور صوفیانہ نظریات سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ جہاں محفل سماع میں شریک ہوتے تھے وہاں علمادیو بند سے بھی نہ صرف ذاتی مراسم تھے بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبدالشکور وغیرہ کی تصانیف ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

حضرت شاہ عبدالرزاق، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی عزیز مرزا، فرنگی محل کے مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی، حضرت مولانا الیاس بانی تبلیغ، مولانا سعید احمد دہلوی، مفتی کفایت اللہ اور شاہ محمد یعقوب نقش بندی مجددی سے حکیم سید کرم حسین کے مخلصانہ روابط تھے۔ تصوف کے دلدادہ ہونے کی بنا پر مذہبی مدارس میں تصوف کی تعلیم کو لازمی گردانتے تھے۔

حکیم سید کرم حسین نے حضرت میاں سلام اللہ شاہ سے بیعت کی اور دوستانہ خلافت سے مزین ہوئے۔ اسی طرح آپ کا سلسلہ عابدی سے گہرا اور قریبی تعلق قائم ہوتا گیا۔

پیر جی شاہ عبداللطیف سے خصوصی مراسم تھے حکیم صاحب کی اہلیہ حکیم النسا انہی پیر جی سے بیعت تھیں۔

حکیم صاحب کے دل میں حرمین شریف کی حاضری اور حج کا بے پناہ اشتیاق تھا۔ 1933 میں محفل میلاد کے بعد حرمین شریف کی زیارت اور حج کی سعادت کے لیے خصوصی دعا کرائی۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی۔ 1943 میں حج کا بابرکت فریضہ ادا کیا۔ ایک مرتبہ خواب میں بھی انھیں روضۂ رسول کی زیارت نصیب ہوئی اس حج میں تجارہ سے سات افراد بڑے صاحبزادے حکیم عتیق القادر، زوجہ حکیم النسا، ہمشیرہ خور دانوری بیگم، خواجہ کمال الدین، قاضی سعیدالدین، ضعیفہ خاتون کو بخرطی پابہ رکاب تھے۔

مکہ مکرمہ سے وہ دو جوڑ کبوتر اور مدینہ منورہ سے دو جوڑ قمریاں کافی اخراجات سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو باری تعالی کے اوصاف حمیدہ کی نغمہ سرائی کرتی رہتی تھیں۔

روضۂ پاک کی حاضری پر کیا خوب کہا ہے۔

تیرے در کو تکتے تکتے ہوں ہلاک   واں کی خاک پاک سے مل جائے خاک
الٰہی تو دکھا جلد روضۂ رسول   دعا کر تو عاصی کی جلد قبول

قومی وملی خدمات:

خدمت قومی بڑی نعمت ہے جس کو باری تعالیٰ دنیا میں عزت اور آخرت میں سرفراز کرنا چاہتا ہے اس کو قومی خدمت کی توفیق اور اس کے دل میں ولولۂ خدمت گزاری پیدا کر دیتا ہے۔ بڑے سے بڑے انسان پر نظر ڈالی جائے تو اس کی بڑائی اور اعزاز کا ایک ہی سبب ہوگا یعنی خدمت خلق اللہ۔ وہ افراد بہت ہی قابل قدر اور لائق تحسین ہیں جو خود کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیں یا کم از کم اپنے دیگر مشاغل سے بچا ہوا وقت خدمت خلق میں صرف کریں۔

حکیم سید کرم حسین نے نہ صرف اپنی حیات میں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ بیش بہا خدمت کر گئے جن کی بنا پر آج بھی لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔

1- انجمن خادم الاسلام

ریاست الور میں اس انجمن کے قیام میں حکیم کرم حسین کا خصوصی تعاون رہا اور ان کی سرپرستی میں اس انجمن نے ریاست کے فلاح و بہبود کے لیے کافی کام کیا۔

2- جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام:

اس تنظیم کا تعلق اسلام کی اشاعت اور تبلیغ سے رہا۔ بعد میں اس انجمن کا دفتر انبالہ سے کانپور راقم کے گھر کے قریب منتقل ہو گیا۔

3- جامع مسجد تجارہ:

1943 میں اس مسجد کی توسیع کرائی اور اخراجات میں مسجد کو خود کفیل بنایا۔ خود مکرانہ جا کر سنگ مرمر اور 6 کاریگر ساتھ لائے ان معماروں نے حکیم صاحب کے گھر رہ کر اس کا صدر دروازہ تعمیر کیا۔ حکیم کرم حسین اس مسجد کے متولی بھی تھے۔

تجارہ کی قلندری مسجد، لال مسجد اور دہلی مسجد مچھلی والان اردو بازار کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر تعاون کیا۔ خانقاہ عابدی (الور) کی تعمیر میں بھی وہ پیش پیش رہے۔

اسی طرح اسلامیہ اسکول تجارہ جو حکیم صاحب کی حویلی میں 1915 میں قائم ہوا تھا خبر گیری کرتے رہتے تھے۔

اسی طرح ملی رفاہی کاموں میں اپنی حیثیت کے مطابق ہمیشہ خرچ کرتے رہتے تھے۔

وفات:

25 جون 1953 کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ بوقت انتقال غفلت و نیم بیہوشی کے عالم میں وہ کبھی سر کا مسح کرتے۔ کبھی کہنیوں کو دھونے کی سعی کرتے یعنی وضو کی کوشش تھی اور انگلیاں جو تسبیح کی عادی تھیں وہ بغیر تسبیح کے اسی طرح چلتی رہیں۔

ان کے انتقال پر متعدد شعرا نے مرثیے و قطعات بطور نذرانے کے پیش کیے جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

منجانب حکیم سید نورالعین راغب چھتاری:

حکیم و قاضی و حاجی کرم حسین جو تھے — شرف فروز تجارہ وقار طب قدیم
ہزار حسرت و افسوس آج دنیا سے — گئے وہ چھوڑ کر ارباب علم و فن کو یتیم
عتیق قادر مطلق کہ فضل رحمان ہوں — غم فراق میں ہر اک کا دل ہوا دو نیم

نوید غیب یہ تاریخ فوت ہے راغب
کرم حسین ہوئے داخل پناہ کریم

از حفیظ بھوپالی:

حاذقوں میں نہ بھلا نام ہو کیونکر ممتاز — یار تھے تم کو مسیحائی کے لاکھوں اعجاز
دم میں بیمار یہاں آ کے شفا پاتے تھے — خوب کرتے تھے کرم بندوں پہ اے بندہ نواز

از رمزی ترمذی بھوپالی:

ولی کامل و فخر زماں جناب حکیم — کرم حسین مسیحائے حاذق میوات
دیا تھا دست شفا جن کو حق تعالیٰ نے — وہ جن سے فیض پہنچتا تھا خلق کو دن رات
وہ جن کی نبض شناسی کی دھوم تھی سب میں — وہ جن کی طب میں ہے مقبول عام تصنیفات
عتیق و فضل پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا — یہ کیا غضب ہوا اے مرگ بادم لذات

کرم تھا شافی مطلق کا جن پر اے رمزی
ہم ان کی ذات سے! محروم ہو گئے بہ حیات

مندرجہ ذیل اشعار میں علامہ قمر واحدی جے پوری نے کتنے حسین پیرایہ میں

منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ح | حاجی حکیم قاضی محمد کرم حسین | خوش وضع وخوش صفات وخوش اخلاق خوشخصال
ک | کم خواب وکم خوراک وکم آمیز وکم سخن | خود دار وخود شناس وخود آگاہ وخود خیال
ی | یاد خدا سے یہ کبھی غافل نہیں رہے | ہر وقت ان کو رہتا تھا انفاس کا خیال
م | مد نظر مقولہ تھا خیرالامور کا | ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال
ک | کردار کے تھے مرد تو گفتار میں تھے فرد | ہر قول بے نظیر تھا ہر فعل بے مثال
ر | رہتے تھے شان وشوکت ودولت سے بے نیاز | علم عتیق وفضل کی دولت سے مالا مال
م | ماہر تھے آپ جملہ علوم و فنون کے | یعنی ہر ایک علم میں آپ اپنی تھے مثال
ح | حالات انقلاب زمانہ سے باخبر | کب تک عروج رہتا ہے ہوتا ہے کب زوال
س | سائل نہ خالی لوٹا کرم کا یہ حال تھا | جو ان کے پاس آتا تھا ہو جاتا تھا نہال
ی | یہ حال فن حکمت وطب میں تھا آپ کا | تشخیص لاجواب تھی تجویز بے مثال
ن | ناگفتہ حال نبض سے تشخیص جو کریں | ایسے حکیم ہوتے ہیں دنیا میں خال خال
ص | صوفی حکیم ناظم و ناشر ادیب تھے | حاصل تھا علم وفقہ وتصوف میں بھی کمال
ا | اول سے ایک وضع پر قائم رہے سدا | یکساں تھا ان کا ماضی ومستقبل اور حال
ح | حمد خدا زباں پہ تھی اور دل میں یاد حق | ایسے گئے ہیں پیش خداوند ذوالجلال
ب | حکیم سید کرم حسین صاحب

طبی معرکے:

حکیم صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے وہ بیک وقت شاعر، ادیب تھے تو ناشر بھی۔ منتظم تھے تو مہتمم بھی۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک لائق وفائق طبیب تھے۔ ان کے علاج سے کتنے ہی لوگ فیضیاب ہوئے جن کی کوئی گنتی نہیں ہے۔ چند ایسے علاج جو تاریخی ہیں، درج ہیں:

ڈاکٹر خلیل احمد (شمس آباد) کا بیان ہے کہ ماؤنٹ آبو میں حکیم صاحب کے دوران قیام ایک لالہ جی کا 7 یا 8 سال کا اکلوتا لڑکا حکیم صاحب کی خدمت میں لایا گیا۔ جس کو آپریشن آخری علاج تجویز کیا گیا تھا کیونکہ اس نے ایک چھوٹا چاقو نگل لیا تھا۔ لالہ جی اور ان کے گھر کے دیگر

افراد کی پریشانی دیکھا دیکھ نہیں جاتی تھی۔ حکیم صاحب نے دو دوائیں یکے بعد دیگرے (غالباً سفوف مقناطیس کسی مناسب مسہل کے ہمراہ) استعمال کرائیں۔ یہ چھوٹا چاقو سلامتی کے ساتھ دستوں میں نکل آیا۔

1926 میں دھوی لال سنار کے پوتے کو پتھری کی شکایت ہوئی۔ الور اور دہلی کے اسپتالوں میں آپریشن تجویز ہوا حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حکیم کرم علی صاحب نے مولی کے عرق میں حجرالیہود خوب سحق کرا کر کشتہ تیار کرایا۔ اس کشتہ کے استعمال سے 2 ماہ میں پتھری نکل گئی۔ بچے کو صحت ہو جانے کی خوشی میں دھوی لال سنار نے حکیم صاحب کو چاندی کا گلاس بنا کر دیا۔

تصانیف:

ہر بڑے حکیم کی طرح حکیم سید کرم حسین نے بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اور مندرجہ ذیل کتب تحریر کیں۔

(1) تحفہ جہاں معروف بہ کیمیائے عشرت:

یہ جنسیات کے موضوع پر ایک ضخیم و معلوماتی کتاب ہے جس میں جنسی مسائل پر مستند کتابوں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب عوام و خواص میں حد درجہ مقبول ہوئی اور پہلی اشاعت 1896 سے لے کر 1950 تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اس کتاب میں تین حصے ہیں۔

(1) بزم خلوت

(2) بزم راحت۔

(3) بزم حسرت۔

لیکن صرف اول حصہ بزم خلوت ہی زیور طباعت سے مزین ہو سکا جس کے تین سو سے زیادہ صفحات ہیں۔

(2) نصاب الطب المعروف طبی خالق باری:

یہ ان کے استاد طب حکیم محمد حسن حاذق اور ان کی مشترکہ کاوشوں کا منظوم مجموعہ ہے جس میں

ادویہ کے فارسی عربی اور ہندی ناموں کے علاوہ امراض اور اصطلاحات طب کو نظم کیا گیا ہے یہ فارسی کی درسی کتاب خالق باری کے طرز پر ہے۔ 1923 میں دوسری بار زیور طباعت سے آراستہ ہوئی تھی جسے نامور طبیب حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

3-رسالہ ام الصبیان:

یہ کتاب زیور طباعت سے محروم رہی لیکن اس کتاب کی وجہ تصنیف کا ذکر حکیم سید کرم علی نے کیمیائے عشرت میں کیا ہے۔ چونکہ اس مرض ام الصبیان میں حکیم سید کرم حسین کے پانچ بچوں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے رفاہ عام کے فائدہ کے لیے یہ کتاب تحریر کی تھی۔

4-رسالہ خضاب:

یہ بہ زبان فارسی تحریر کیا گیا ہے اس میں خضاب کے متعدد نسخے ہیں۔

5-رسالہ خواص آکھ:

آکھ جسے اکوزہ یامدار بھی کہتے ہیں اس کے فوائد پر ایک کتاب لکھی تھی اور ہچیش کے لیے اس دوا سے ایک ایسی دوا تیار کی تھی جو ان کے تجربات میں سے تھی۔

6-الحب معروف بہ من موہنی:

یہ 300 صفحات پر مشتمل ایک تعویذ و عملیات کی ایک کتاب ہے جو کئی بار زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

7-رسالہ مقصود الطالبین:

حضرت سید محمد عرف سید شمس الحق قادری دہلوی مرید حضرت شاہ محمد غوث قادری غازی پور زمانی و پیر و مرشد حضرت سید شاہ آل احمد عرف اچھے صاحب قادری مارہروی کے فارسی رسالہ مقصود الطالبین کا اردو ترجمہ ہے۔

8-مفاتح الغیب:

حضرت امام جعفر صادقؑ کی طرف منسوب کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں قرآن پاک سے فال نکالنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔

9- تسخیر خلائق ترجمہ کتاب عقد المحبت:

اس کتاب میں قرآنی آیات کا فارسی زبان میں مطلب بیان کیا گیا تھا۔ حکیم سید کرم حسین نے اس کا اردو ترجمہ کر کے حاشیے میں ان کے فوائد تحریر کیے ہیں۔

10- مفتاح الصلوٰۃ:

نماز کا یہ رسالہ 1911 میں کتب حنفیہ سے تیار کیا گیا ہے جس میں نماز کے احکام اور نماز سے متعلق دیگر احکامات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

11- معراج المومنین:

یہ کتاب بھی نماز کے بیان میں ہے۔ جس میں نماز کی فضیلت اور اس کو پڑھنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلۂ اول کے طور پر یہ کتاب 1929 میں چھپی ہے۔

12- رمضان المسلمین:

یہ کتاب منظوم طور پر روزوں کی فضیلت اور ان سے متعلق ضروری بیان کے مسائل میں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سلسلہ دوم کے طور پر یہ کتاب بھی 1929 میں چھپی ہے۔

13- رسالہ فضائل الالحج:

اسلامی تعلیمات کے سلسلہ کا یہ تیسرا رسالہ ہے جو طبع نہیں ہو سکا تھا اور منظوم ہے۔

14- چہل کاف:

ایک مشہور دعا ہے جس کا اثر اب حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی طرف ہے۔ یہ کتاب 1930 میں طبع ہوئی تھی۔

15- درود مستغاث:

اس درود کو حضرت امام جعفر صادقؒ کی سند حاصل ہے۔ 1904 میں حضرت میاں سلام اللہ شاہؒ نے حکیم سید کرم حسین کو اس درود کو پڑھنے کی ترغیب دی تھی جو آخر زندگی تک بعد نماز فجر حکیم صاحب کے معمولات میں شامل رہا۔ حکیم صاحب نے اس کتاب کی ابتدا میں احادیث اور معتبر ماخذ کی روشنی میں درود کی فضیلت پر علمی حیثیت سے لکھا ہے۔

16-حرز مرتضوی معروف بہ دعائے سیفی:

1346ھ/ 1928 میں یہ کتاب دہلی سے چھپی تھی۔ یہ ایک بابرکت اور مقبول دعا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تلقین فرمائی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق نے اس کے فوائد اور برکتوں کے علاوہ اس کو بہت سے ناموں سے موسوم فرمایا ہے۔

17-دربار سلطان الہند:

اس رسالہ میں خواجہ ہند والولی کے روحانی دربار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1239ھ/ 1921 میں دہلی سے چھپی تھی۔

18-شان صابر ہدیہ نظیر:

حکیم سید کرم حسین کا حضرت علاء الدین صابر کلیری کے مزار پر بہ سلسلۂ مرضا دربار جانا ہوا۔ بارگاہ حضرت صابر کلیری میں مختلف شعرا نے جو منظوم خراج عقیدت پیش کی ہے۔ حکیم صاحب نے اس کو یکجا کر کے 1928 میں چھپوایا۔

19-ارشاد واحدی:

ایک بزرگ حضرت حافظ قاری میاں واحد علی شاہؒ کے ملفوظات ارشاد واحدی کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

20-تذکرہ احباب:

اپنے دو صاحبزادوں کی تعلیم پر ہونے جشن میں احباب و متعلقین کے احساسات وخیالات کو یکجا کر کے 1930 میں شائع کیا تھا۔

21-جشن مولود:

1929 میں حکیم صاحب کے پہلے نبیرہ کی پیدائش پر تجارہ میں جو جشن مسرت منایا تھا ایسے موقع پر حکیم صاحب نے پیش کیے گئے۔ قصیدہ، قطعات ایک مقام پر یکجا کر کے شائع کیا تھا۔

22-سورہ یٰسین:

1935 میں سورہ یٰسین اور اس کا اردو ترجمہ مع خواص وفوائد پیش کیا تھا۔

23-میلاد خیر العباد:

میلاد شریف یعنی حضور پاک کی سیرت پر مشتمل یہ کتاب تھی۔

24-کتاب المعالجات

اس کتاب میں اسباب، علامات اور تشخیص امراض پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اپنے اساتذہ کے مجربات درج تھے۔ اس کتاب کو عرفیت کے طور پر وہ کبھی کبھی مزاجاً "بیماروں کا دلی چین" بھی کہا کرتے تھے۔

25-بیاض طب:

اس کتاب میں انھوں نے بزرگوں کے تجربات اپنے تجربات اور مریضوں سے دواؤں کی کیفیات کوسن کر تین حصوں میں قلم بند کیا تھا۔

اس کے علاوہ چند کتب اور بھی تحریر کی تھیں جیسے شرح قصیدہ نمونیہ، مثنوی، نظمیں، رسالہ قدم شریف وغیرہ۔

حکیم صاحب نے طب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں اور خدمات کی تھیں وہ سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل تھیں۔ حکیم سید کرم حسین نے غریب عوام کی عام معلومات کے لیے تجارہ جیسے دور دراز مقام سے 1927 میں ایک رسالہ ماہنامہ مسیحائے زمان کے نام سے بھی جاری کیا تھا جس کی تعدا اشاعت قریب پانچ ہزار تھی۔

شمس الاطباء

خان صاحب حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی انصاری

1926-1873

مما لک غیر میں طب یونانی کا نقیب

طب یونانی جو اپنے ابتدائی دور سے ایک خوش آئند مستقبل کی ضامن اور طب کا مبتدا تھی ابتدائی دور میں ہندوستان میں مشاہیر اطباء کی آمد مغلیہ دور حکومت میں سرزمین ایران سے شروع ہوئی۔ ہند کے بیشتر طبی خانوادوں اور اطباء کا سلسلۂ تلمذ بھی ان ہی گرامی قدر اساتذہ تک جا پہنچتا ہے۔ خاندان شریفی دہلی اور خاندان عزیزی لکھنؤ کے بزرگ بھی ایرانی اطباء کے تربیت یافتہ تھے غرضکہ اس وقت ملک ایران طبی شعبے میں سربرآوردہ طبی حیثیت کا مالک تھا۔

خاندان:

حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کا خاندان برصغیر کی عظیم و نمایاں ہستیوں پر مشتمل ایک اعلیٰ خاندان تھا۔ ان کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے واردان ہند میں سے تھے۔ آپ کے خاندانی حالات آپ کی علمی قابلیتوں سے متاثر ہو کر انگلینڈ کے ایک نامور سیاح سیوج ہنری لنڈوز (Swej Henry Landose) نے اپنے سیاحت نامہ ''ایران و ترکستان'' میں تحریر کیے ہیں جو لاہور کی ایک پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی مرحوم

پیدائش:

آپ کی پیدائش تعلیم کی دولت سے مالا مال علم وفن سے مزین ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں 15 مئی 1873 کو لاہور میں ہوئی تھی۔ آپ ایک اعلیٰ انصاری خاندان میں اس وقت تولد ہوئے جب ہندستان کے سیاسی وسماجی افق پر عظیم تبدیلیوں کے دوررس اثرات مرتب ہورہے تھے۔ ایک جانب قدیم ذہن کے علما پر مشتمل طبقہ اسلام کی بقا کے لیے جدوجہد کررہا تھا تو دوسری طرف جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے اور دنیا میں مسلمانوں کو سرخرو کرانے کے لیے سرسید جیسے علما پر مشتمل ان کے رفقا برسرپیکار تھے۔

تعلیم وتربیت:

ایسے پرآشوب دور میں والدین نے اپنے فرزندار جمند کے لیے حسب قاعدہ ابتدائی تعلیم کی ابتدا گھر سے کی۔ عربی فارسی نیز انگریزی کی تعلیم کی تکمیل مدارس میں کرکے نورمل مڈل اسکول لاہور سے مڈل پاس کیا۔

طبی تعلیم:

چونکہ ان کے والد حکیم سلطان محمود انصاری اپنے وقت کے نہ صرف ایک جید عالم ہی تھے بلکہ عالی مرتبت حکیم بھی تھے اور جو باقاعدہ لاہور میں ایک کامیاب مطب ودواخانہ کے مالک بھی تھے۔ طب کی تعلیم نہ صرف اپنے والد سے بلکہ دیگر باکمال اطباء سے بھی حاصل کی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں تحصیل تعلیم کے بعد لاہور کے میڈیکل کالج میں داخل ہوکر علم وعمل ڈاکٹری کی تعلیم کی شروعات کی۔ اس وقت ہندوستان میں جدید طب یعنی ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم صرف ڈپلومہ تک محدود تھی۔ لہٰذا حکیم غلام جیلانی صاحب نے 1895 میں ایل۔ ایم۔ ایس کا ڈپلومہ یعنی سند حاصل کی اور اسی سال سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے اور چند سال تک پنجاب کے کئی سرحدی مقامات پر مامور رہنے کے بعد آپ اپنی علمی وعملی لیاقت کے سبب منتخب ہوکر ملک ایران کو روانہ کیے گئے جہاں آپ کو نہایت عزت وشہرت ملی۔

ابتدا میں آپ گورنمنٹ برطانیہ کے قونصول یعنی سفیر متعینہ قائنات وکرمان کے ڈاکٹر مقرر ہوئے۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد آپ بمقام برجند دارالحکومت تہران (قائنات) ایران میں برٹش

ایجنٹ مقرر کیے گئے۔ جہاں آپ اپنی طبی قابلیت کے سبب نہایت ممتاز خیال کیے جاتے تھے۔ چنانچہ جب جلالت مآب عمدۃ الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت قاینات (نمائندہ حکومت) نے آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا۔ اس کے ایک سال بعد آپ دولت عظمیٰ برطانیہ کے قونصول خانہ (سفارت خانہ) سیستان کے میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے وہاں پر بھی آپ کی طبی لیاقت کی نہایت قدر ہوئی۔ چنانچہ جلالت مآب عمدۃ الامراء العظام امیر شوکت الملک حکمراں ولایت سیستان نے بھی آپ کو اپنا طبی مشیر مقرر فرمایا جہاں آپ کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم کے کئی ایک محترم قونصلوں یعنی سفیروں نے جن کے ماتحت غلام جیلانی صاحب کو اپنے دوران قیام ایران میں طبی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ اپنے عنایت ناموں یا تصدیق ناموں میں جو حکیم غلام جیلانی صاحب کے پاس موجود تھے۔ آپ کی طبی قابلیت خدمات و حذاقت کی بہت تعریف کی تھی۔ نیز عالی جناب سر میک موہن صاحب بہادر کے سی۔ ایس آئی نے (جو 1904 میں سرحد افغانستان و ایران کے حاکم مقرر ہوئے تھے اور جن کے نام پر آج بھی میک موہن لائن بنی ہوئی ہے) نیز لارڈ رولڈ شے صاحب بہادر جیسے امیر الامرائے انگلینڈ نے بھی جن کو 1900 میں دوران سیاحت ایران میں آپ سے علاج کرانے کا اتفاق ہوا تھا اپنے تصدیق ناموں میں جو حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی کے پاس آخر وقت تک تھے۔ آپ کی طبی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

تقریباً عرصہ آٹھ یا نو سال تک مختلف مقامات ایران میں کام کرنے پر 1904 میں آپ کی حسن خدمت کے صلہ میں حکومت ہند نے بطور ذاتی اعزاز کے آپ کو خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے قبل دوران قیام ایران میں حکومت ایران نے بھی آپ کی بہت عزت افزائی کی اور 1902 میں آپ کو شمس الاطباء کے معزز خطاب سے نوازا اور 1903 میں اعلیٰ حضرت مظفر الدین شاہ مرحوم ومغفور شاہ ایران نے شیر وخورشید کا ایک ممتاز تمغہ آپ کو مرحمت فرمایا۔ پھر 1904 میں مملکت ایران کی شاہی مجلس حفظ الصحۃ نے آپ کو اپنا ممبر منتخب فرمایا۔

1906 میں آپ اپنے وطن مالوف لاہور میں رخصت پر تشریف لائے اور بعض خانگی امورات کے سبب 1907 میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور تب ہی سے آپ لاہور میں

مطب کرنے لگے۔ لیکن زیادہ تر آپ طبی تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹری و طبی کتب کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا آپ کو ابتدا ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ انڈین میڈیکل ریکارڈ کلکتہ جو کلکتہ کا ایک معروف انگریزی رسالہ تھا اس میں آپ کے کئی اعلیٰ مضامین شائع ہوئے اور دو بار آپ کو رسالہ مذکور کے انعامی مضامین انعامات مع سندات ملے جو ایک ہندوستانی طبیب کے لیے باعث افتخار تھا۔

علمی و ادبی کارنامے:

بعض مشہور اردو رسائل و جرائد مثلاً پیسہ اخبار، وطن اور وکیل میں بھی آپ کے علمی مذاکرہ مباحث اور اردو طبی رسائل مثلاً مجلّہ طبیہ دہلی و اخبار حکمت لاہور اور خصوصاً رفیق الاطبا میں آپ کے کئی علمی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کی طبی تصنیفات کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ اس دور میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ان کی مخزن حکمت جس کا دوسرا نام "گھر کا حکیم و ڈاکٹر" ہے بے حد مقبول ہوئی۔ مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جائے گا کہ اب تک دونوں جلدوں کے چودہ پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اکثر پڑھے لکھے گھروں میں گھر کے اس حکیم و ڈاکٹر کی دونو جلدیں موجود ہوتی ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو صرف ان دو کتابوں کو پڑھ کر ہی ڈاکٹر و حکیم بن گئے ہیں۔

مخزن حکمت کی مقبولیت کو دیکھ کر اسی طرز پر کئی اور کتب شائع ہوئیں لیکن کسی کتاب کو بھی وہ قدر و منزلت نہ ملی جو ان کی تصنیف کو حاصل ہوئی۔

بلاشبہ حکیم غلام جیلانی میں تصنیف و تالیف کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور تصنیف و تالیف کی خداداد صلاحیت تھی۔ مختلف طبیہ کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی کے طبی امتحانات کے آپ اکثر ممتحن ہوتے تھے تاہم علاج و معالجہ سے پوری دلچسپی رکھتے تھے مطب میں وقت مقررہ سے حاضر ہوتے تھے۔

چنانچہ آپ کی تصانیف کی ایک ایک جلد از راہ قدر دانی انڈیا آفس لندن اور برٹش میوزیم لندن کے سرکاری کتب خانوں میں بھی رکھی گئی تھی۔

تصانیف:

1-مخزن الادویہ ڈاکٹری: یا میڈیا میڈیکا باتصویر

اس کتاب کی دو جلدیں ہیں جلد اول کی ضخامت تقریباً1100 صفحات پر مشتمل ہے جلد دوم کی ضخامت تقریباً1420 صفحات کی ہے۔ڈاکٹری کی علم الادویہ پر یہ ایک نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہے اس کتاب میں امریکہ کی تمام ڈاکٹری مفرد و مرکب ادویہ کی تحقیق اوران کی لاطینی انگریزی، یونانی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو ناموں کی صحیح تطبیق کی گئی ہے اوران کے مفصل افعال وخواص کے علاوہ تقریباً ہر ایک دوا کا طریقۂ استعمال بھی لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب علم طب میں درحقیقت ایک نہایت ہی مفید اضافہ ہے۔ چنانچہ ملک کے اکثر نامی گرامی ڈاکٹروں و حکیموں نے اس کتاب کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اس کتاب کی ایک ایک جلد نہ صرف انڈیا آفس لندن، برٹش میوزیم، شاہی کتب خانوں نیز امپیریل لائبریری کلکتہ، شاہی کتب خانہ کلکتہ اور میڈیکل کالج لاہور کی زینت بنی ہیں جو درحقیقت باعث امتیاز وافتخار ہیں۔

2-مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر وحکیم:

طب خانگی پر اردو زبان میں یہ ایک لاجواب و بے مثال کتاب ہے جس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کی ضخامت1400 صفحات ہیں۔

3-تاریخ الاطبا:

اس کتاب میں مشرق ومغرب کے متقدمین ومتاخرین مشاہیر اطبا یعنی حکیموں ویدوں اور ڈاکٹروں کی زندگی کی دلچسپ طبی حالات، طبی خدمات وتجربات نیز انکشافات کا بالوضاحت بیان کیا ہے۔اس کتاب کی ضخامت تقریباً900 صفحات ہے۔

4-علاج بالمفردات یونانی وڈاکٹری:

600 صفحات کی ضخامت ہے۔

5-ہندوستان کی جڑی بوٹیاں:

1000 صفحات کی ضخامت ہے۔

6-لغات الادویہ:

سات یا آٹھ سو صفحات کی ضخامت ہے۔

قاموس طبی۔عربی و فارسی یونانی لغات طبیہ کی ایک جامع کتاب۔

وفات:

افسوس کہ فروری 1926 کو آپ اس عالم فانی سے رہ گزارئے عالم جاودانی ہوئے۔

طبی معرکے:

آپ کے لاہور، تہران نیز دیگر مقامات کے مجربات وشاہکار علاج کی فہرست طویل ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ لاہور کا ہے۔

ایک مرتبہ یہ لاہور کے ایک لیڈر صاحب کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے جو تین چار ماہ سے جوڑوں کے درد میں مبتلا اور چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔آپ نے ان کو بغور دیکھنے کے بعد نبض دیکھی، ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کے جوڑ گھٹنے اور کہنی کے جوڑ سب سوجے ہوئے تھے۔درد اور ہلکا سا بخار بھی رہتا تھا۔ پیاس زیادہ لگتی تھی، بھوک بہت کم، قبض مسلسل رہتا تھا۔رفع حاجت کے لیے بھی دوسروں کے محتاج نظر تھے۔حکیم غلام جیلانی صاحب نے ''وجع مفاصل بسبب قبض و ریاح'' قرار دے کر حسب ذیل نسخہ تجویز کیا اور مندرجہ ذیل ادویہ کو ایک بڑے پتیلے میں پکوا کر مریض کو اس میں یعنی ٹب میں پانی گنگنا کرا کے بٹھایا۔

سورنجان ایارج، شیطرج ہر ایک 3 تولہ۔

تربد مقشر، تخم حنظل سناء المکی ہر ایک 3 تولہ۔

افلیموں اینوں۔تخم گرخی ہر ایک 2 تولہ۔

مقل دس ماشہ۔سب ادویہ کو باریک کوٹ چھان کر آب گنگنا میں چنے کے برابر گولیاں بنائیں اور یہ پانچ ماشہ گولیاں رات کو سوتے وقت گرم پانی سے کھالیا کریں۔اور مندرجہ ذیل روغن مالش کے لیے دیا۔

روغن اکسیر وجع مفاصل:

سورنجان تلخ 5 تولہ، قط تلخ فوہ، زرد چو، دار ہلا، ہر ایک 3 تولہ، وج ترکی عود صلیب، دار

چینی، سبل الطیب بابونہ ہر ایک 2 تولہ سب دواؤں کو باریک کوٹ کر 2 سیر پانی میں دو دن بھگو دیں پھر اتنا پکائیں کہ پانی آدھا رہ جائے۔ اس کو مل کر چھان لیں اور اس میں تل کا تیل 50 تولہ شامل کرکے خوب جوش دیں۔ جب پانی جل جائے اور صرف تیل رہ جائے تو چھان کر بوتل میں بھر لیں۔ کافور 2 تولہ روغن تارپین 10 تولہ میں حل کرکے اسی تیل میں شامل کرکے حفاظت سے رکھ لیں یہ تیل گرم گرم مالش کرکے گرم گرم روٹی باندھنے کی ہدایت کی گئی۔

ترش وسرد غذاؤں سے پرہیز بتایا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ حکیم صاحب نے مریض کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ درد کم ہے، اجابت روز ہو جاتی ہے، اٹھ کر بیٹھنے میں اب پہلی سے تکلیف نہیں ہے۔

یہی دوائیں دو ہفتے مزید جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ تیسرے ہفتہ خود مریض حکیم صاحب کے مطب میں حاضر ہوئے۔ خوشی کا اظہار فرمایا اور مبارک باد دی کہ اتنے تکلیف دہ مرض پر آپ نے اتنی جلدی اور آسانی سے قابو پالیا۔ طاقت کی دوا کی فرمائش کی۔

ایک ہفتہ کے بعد حکیم صاحب نے یخنی سے معجون اذاراقی 5 ماشہ صبح وشام کھانے کو مزید بتا دی۔ اس کامیاب علاج سے لیڈر صاحب صحت یاب ہو گئے۔ اور انھوں نے حکیم غلام جیلانی صاحب کے طریقۂ علاج اور دست شفا کی بہت تعریف کی۔

آخر میں آپ کو اعزازی طور پر آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی کے بورڈ آف ایگزامنز مجلس ممتحنین کے ممبر نیز کالج مذکور کی ٹیکسٹ بک کمیٹی (مجلس معین نصاب تعلیم) کے ممبر اور جماعت ہائے مدرسہ طبیہ دہلی کے ممتحن اور جماعت زبدۃ الحکماء وعمدۃ الحکماء وحکیم حاذق متعلقہ اسلامیہ کالج لاہور کے بھی ممتحن رہے تھے۔

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخون زادہ

1881 اردو ادب بنگال تابندہ ستارا 1947

1297ھ 1366ھ

حکما طب یونانی کے عام طور پر جید عالم و فاضل اور جو انھوں نے میدان طب میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں اور علوم دیگر میں بھی کمال حاصل کیا ہے یعنی دستار فضیلت اور خرقۂ شیخت دونوں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں۔

ایسی شخصیتوں میں ایک نمایاں شخصیت شفا الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخون زادہ ڈھاکہ کی بھی ہے۔ جس نے طب کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی تاریخ ساز کام کیا ہے۔

خاندان:

آپ کا خاندان نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ صوبہ سرحد کے مشہور قبیلہ یوسف زئی کے پٹھان طبقہ سے متعلق تھا۔ ان کے والد محترم الحاج مولانا محمد خان شاہ آخون زادہ جنکلدنی واقع صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے جو لکھنؤ سے ہجرت کر کے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان ۔ کے وہاں بنگال تشریف لائے اور ڈھاکہ میں شادی کر کے بود و باش اختیار کر لی تھی اور اس تقریب سے سرحد ہند کی یہ دولت بنگال کی

قسمت میں آئی تھی۔

پیدائش:

جادو نگار ادیب اور نادرہ روزگار طبیب حکیم حبیب الرحمٰن خاں آخون زادہ کی ولادت باسعادت 23 مارچ 1881 کو مطابق 1298ھ کو ڈھاکہ میں اس تاریخی قبیلہ کے گھرانہ میں ہوئی تھی۔

تعلیم تربیت:

مولانا ظفر احمد تھانوی کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ مزید تعلیم کے لیے سرکاری مدارس کی شکل دیکھی اور بعد میں تکمیل تعلیم کے لیے صوبۂ یوپی کے مشہور شہر کانپور کا سفر کیا۔ ابتدائی صرف ونحو کے لیے کچھ اسباق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جب وہ کانپور میں درس دے رہے تھے حاصل کی جس کا خاتمہ 1315ھ میں ہوا۔ زیادہ تر درسیات وتعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانی سے حاصل کی۔ معقول مولانا احمد حسین کانپوری اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے پڑھیں۔ جبکہ یہ علما کانپور میں مدرس تھے۔ حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک شاگرد سے حاصل کی اور اجازت لی۔ اس کے بعد آگرہ میں مزید تعلیم حاصل کر کے عربی اسلامیات، منطق فلسفہ اور دیگر علوم میں واقفیت بہم پہنچائی لیکن بقول پروفیسر حسن معصومی لیکچرار فلسفۂ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے ''حکیم حبیب الرحمٰن کی تعلیم آگرہ اور بہار میں ہوئی۔

تعلیم طب:

طب کی تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں حکیم عبدالمجید خان دہلوی المتوفی 1901 سے حاصل کر کے کمال حاصل کیا۔

1904 میں تعلیم حاصل کر کے ڈھاکہ واپس آئے اور طبیب کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی۔ طبابت کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے دور دور تک شہرت پھیل گئی۔ اس شہرت اور عظمت کی وجہ سے نواب بہادر سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے آپ کو اپنا طبیب خاص مقرر کر دیا۔ نواب صاحب کو حکیم صاحب سے اس قدر دلی محبت پیدا ہو گئی کہ

نواب صاحب اپنے ذاتی مسائل کیا سیاسی، سماجی مسائل میں حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔ حکیم حبیب الرحمن کے یہ ذاتی مراسم ڈھاکہ کے دیگر وارثین نواب حبیب اللہ الحاج خواجہ ناظم الدین، خواجہ شمس الدین وغیرہ سے گھریلو رہے او ر یہ ڈھاکہ کے نوابین جیسا کہ آگے کی تحریر سے معلوم ہوگا کہ ان کے تحریری و ادبی کام میں بہت معاون رہے۔

حکیم صاحب کی تعلیم تمام تر پرانے طرز کی ہوئی تھی مگر فطرت کے خزانے سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اپنے اس فطری وفکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں اور طب کے بعد جن فنون سے ان کو ذوق رہا وہ بھی تاریخ و ادب تھے اور اسی سلسلے سے وہ مولانا شبلی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تھے۔

چنانچہ 1906 ان کی زندگی کے لیے بڑی اہمیت کا سال ہے اسی سال مولانا شبلی سے جب وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے مولانا شبلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حاجی خلیفہ کی کشف انسطوں کی طرز پر ہندوستان کے ہر صوبہ کی تصنیفات پر ایک محققانہ کتاب لکھی جائے۔ مولانا نے ان کے اس خیال کی تحسین کی اور بنگال کا حصہ ان کے سپرد کیا۔

بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ حکیم صاحب کے اکثر خطوں میں ان کی اس تصنیف کی بابت تذکرے ہوا کرتے تھے۔

سیاسی، سماجی وادبی خدمات:

1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام بمقام شاہ باغ ڈھاکہ عمل میں آیا۔ نواب وقار الملک اس کے اول صدر تھے۔ نواب سر سلیم اللہ اس کے اول سکریٹری اور حکیم حبیب الرحمن خاں اس جماعت کے اول جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔

حکیم صاحب کو اوائل عمری سے آخری دم تک دوسروں کے مفاد کا خیال رہا۔ چنانچہ ڈھاکہ کے مسلمانوں کی اہم خدمات انجام دیں۔

1922-23 میں حکومت بنگال نے ایک کمیٹی بنائی جس کے سکریٹری کرنل حسان

سہروردی مرحوم تھے حکیم صاحب اس کمیٹی کے سرگرم رکن رہے۔ اس کمیٹی کا کام یونانی طریقۂ علاج پر غور کرنے کے بعد حکومت کو رپورٹ پیش کرنا تھی کہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں طبیہ کا قیام سودمند ہوگا یا نہیں۔

کمیٹی کی سفارشات کے بعد حکومت نے طبیہ کالج کے قیام کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا لیکن حکیم صاحب کو لگن لگی تھی اور جذبۂ ہمدردی رگوں میں موجزن تھا۔ مدرس عربیہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مستقبل کا بھی احساس تھا جس کے لیے حکومت کی راہیں مسدود تھیں۔ چنانچہ ان وجوہ کے پیش نظر انھوں نے بڑی ہمت کر کے جواں مردی اور جذبۂ ایثار کی آڑ لے کر 1930 میں طبیہ حبیبیہ کالج کے نام سے ایک کالج کرایہ کی عمارت میں قائم کیا۔

اس کالج کے پاس شدہ اطبا بنگلہ دیش ہندوپاک میں جا بجا مقام پر پھیلے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب کے اخلاق اور علم طب کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کالج کے سالانہ جلسوں میں ملک کی بڑی بڑی اور مایۂ ناز ہستیاں نہ صرف شریک ہوئیں بلکہ معاونت بھی فرمائی۔ جن میں سرجون ہوبرٹ، مسٹر اے۔ کے فضل الحق مرحوم۔ خواجہ ناظم الدین مرحوم نواب خواجہ حبیب اللہ بہادر مرحوم، مسٹر ایچ۔ ایس سہروردی مرحوم، خواجہ شہاب الدین مرحوم قابل ذکر ہیں۔ بحیثیت طبیب حکیم حبیب الرحمٰن آخون زادہ کی سارے ملک میں شہرت تھی 40 برس تک آپ نے طبابت کی اور لاکھوں لوگوں کو آپ نے فائدہ پہنچایا۔

حکومت ہند نے 1939 میں حکیم حبیب الرحمٰن خان آخون زادے کے طب یونانی کی خدمات اور شہرت دیکھ کر شفاء الملک کا خطاب عطا کیا جو بعد میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت کے بموجب حکومت کو واپس کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے انجمن اطبا مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک تنظیم اطبا کی قائم کی تھی جس کے آپ تاحیات صدر رہے۔

1946 میں مسلم لیگ اور کانگریس کی ملی جلی حکومت انٹریم گورنمنٹ کے دور میں دہلی میں طب یونانی کے فروغ کے لیے وزارت صحت نے جو سہ رکنی کمیٹی بنائی تھی اس کے ایک رکن شفاء الملک مرحوم بھی تھے۔

حکیم حبیب الرحمٰن کی ادبی حیثیت کا آغاز بھی 1906 سے ہوتا ہے۔ اس سال انھوں نے ڈھاکہ سے ''المشرق'' کے نام سے ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ پھر ''جادو'' کے نام سے ایک اور ادبی وعلمی رسالہ جاری کیا اس کے ساتھ ہی ساتھ ''معارف'' کے ابتدائی پرچوں میں بھی ان کے مضامین چھپے تھے۔

مرحوم حکیم صاحب کے قلم میں بڑی لطافت تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے نہ ہو سکی۔ لیکن تھوڑی بہت اگر کسی سے ہوئی ہے تو عجیب بات ہے کہ وہ بنگال ہی کے جادوگران ادب سے ہو سکی ہے ان میں پہلا نام نصیر حسین خاں کلکتہ کا اور دوسرا نام حبیب الرحمٰن ڈھاکہ کا ہے۔

ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا اور اس مقصد کے تحت مرحوم نے انجمن ترقی اردو مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت طبیہ حبیبیہ کالج میں برابر مشاعرے اور جلسے ہوا کرتے تھے جن میں ممتاز شعرا ادیب اور عمائدین شہر برابر شرکت کیا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ حکیم شفاء الملک صاحب مرحوم آل انڈیا ریڈیو سے بنگال کی خصوصیات پر برابر تقاریر نشر کرتے تھے۔ حکیم صاحب ان تقاریر کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے مگر شرط یہ تھی کہ محکمہ نشریات ان کو کتابی شکل میں شائع کرے گا جس سے آئندہ کی نسلوں کو فائدہ ہو۔ حکیم صاحب کی آل انڈیا ریڈیو سے جن موضوعات پر نشریات ہوئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) ڈھاکہ اب سے پچاس سال پہلے۔

(2) مساجد ڈھاکہ۔

(3) کچھ پرانی باتیں۔

(4) تاریخ شعرا اولیائے بزرگان دین۔

(5) ڈھاکہ کی عمارات۔

(6) ڈھاکہ کے قدیم خاندان اور ان کے رسومات۔

(7) شائستہ خان کا بند دروازہ۔

تصانیف:

ہر بڑے حکیم اور ادیب کی طرح حکیم صاحب نے بھی متعدد شاہکار سپرد قلم کیے ہیں۔ بنگال کی تاریخ اور اس کے جغرافیائی خصوصیات اور نقشے پر حکیم صاحب کو مکمل عبور حاصل تھا۔ بنگال سے متعلق ''ثلاثۂ غسالہ'' کا نام انھوں نے حافظ شیراز کی اس غزل سے کیا تھا جس کو حافظ شیراز نے سلطان بنگالہ کے نام لکھ کر بھیجا تھا۔

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی غزل کا ایک ٹکڑا ہے ''ثلاثۂ غسالہ می رود''، ''الفاروق'' اور ''حیات سقراط'' ان کی طالب علمی کے رسالے ہیں۔ ان کی دیگر تصنیفات کے نام مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے، شعرائے ڈھاکہ وغیرہ ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''آسودگان ڈھاکہ'' تحریر کی تھی جو 1946 کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ڈھاکہ کی سرزمین میں مدفون بزرگان دین کے مزارات کی تحقیق اور تذکرے ہیں اس کے بعد آسودگان ڈھاکہ کا مصنف خود ڈھاکہ کی خاک میں آسودہ ہو گیا۔

حکیم صاحب کو قدیمی سکوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ نومبر 1930 میں 211 سکوں کا عطیہ ڈھاکہ کے عجائب گھر کو دیا گیا جو مہتمم عجائب خانہ نے 1926 میں ایک کتاب سکوں کی با تصویر شائع کی اور بعد میں حکیم صاحب کی تصویر کے ساتھ ایک ڈاک ٹکٹ بھی شائع ہوا۔

حکیم صاحب کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں اردو، عربی، فارسی کی نایاب اور بیش قیمت کتابیں تھیں۔ جو ان کے انتقال کے بعد کچھ کتابیں ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری کو ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی پروفیسر شعبۂ اردو و فارسی کی معرفت دے دی گئی تھیں۔ ان کی بیگم صاحبہ نے حکیم صاحب کی وصیت کے مطابق خاندان کے لوگوں کے سامنے بغرض اشاعت و طباعت حکیم صاحب کے تحریر کردہ کچھ کتب کے نسخے ڈاکٹر شادانی کو دے دیے تھے بدقسمتی سے ڈاکٹر شادانی صاحب بھی کچھ عرصہ بعد مرحوم ہو گئے اور ان مسودات کا کیا حشر ہوا یہ نہ معلوم ہو سکا۔

وفات:

مگر آہ وہ مسیحا نفس جو دوسروں کو موت کے پنجے سے چھڑایا کرتا تھا آخر ایک دن وہ آیا جب

وہ خود اس کے پنجہ میں گرفتار ہوا۔ مرحوم کو کئی ماہ پیشتر اس آنے والے حادثہ کا علم جیسے ہو گیا تھا۔ بعض احباب سے تذکرہ اس بابت کر چکے تھے کہ میں جب جاؤں گا دفعتاً جاؤں گا۔ جس دن (23 فروری) یہ واقعہ پیش آیا حسب معمول صبح کو بیدار ہو کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں شریک ہوئے اور مطب میں مریضوں کو انہاک سے دیکھا۔ مغرب کے بعد نشست گاہ میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کیں جو مختلف موضوعات پر تھیں۔ اثنائے گفتگو میں معلوم کیا کہ آج مولانا عثمانی ڈھاکہ میں تشریف نہیں رکھتے؟ ان کو اپنی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوچ کا وقت قریب ہے۔ اس لیے کچھ وصیتیں بھی کر چکے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ میری نماز مولانا ظفر احمد تھانوی پڑھائیں اور اگر وہ نہ ہوں تو پیر جی عبدالوہاب مہتمم مدرسہ اشرف العلوم پڑھائیں۔

شوئی قسمت کہ مولانا عثمانی اس دن کہیں باہر تھے۔ 3 بجے شب کو قلبی دورہ پڑا۔ طبیب کے لیے آدمی گیا ان کے آتے آتے مسافر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ آناً فاناً خبر شہر ڈھاکہ و گرد و نواح میں پھیل گئی۔ صبح کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ جنازہ میں مجمع اتنا کثیر تھا کہ شرکا جنازہ و سامعین کہتے ہیں کہ شاید کسی کے جنازہ میں اتنا اژدہام رہا ہو۔ حسب وصیت نماز جنازہ پیر جی عبدالوہاب نے پڑھائی اور تدفین عظیم پور دائرہ شریف کے قبرستان میں انجام پائی۔ ان کی قبر ان کے والد مرحوم کی پائنتی ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ اپنی حیات ہی میں زمین خرید چکے تھے۔

ان کے جنازہ میں ہر طبقہ کے افراد شامل تھے اور سوگ میں ڈھاکہ کے ہر طبقہ کا بازار بند رہا۔

ادبا و شعرا نے اپنے اپنے طور پر قطعات، تاریخ و مرثیہ کہے اور اہل قلم نے متعدد اخبار میں نذرانہ ہائے پیش کیے۔

فروری آئی ہے پھر یاد حبیب آنے لگی — چشم پرنم رنج و غم سے اشک برسانے لگی
خدمت انسانیت کا ایک سراپا تھے حبیب — بات جیسی تھی زبان خلق پر آنے لگی
کار ہمدردی شفا الملک کا تھا مشغلہ — روح اہل خیر دیکھو وجد میں آنے لگی
آپ کی مسکیں نوازی دیکھ کر اقوام غیر — خلق ڈھاکہ آپ کے ہر وقت گن گانے لگی
ہے فن طب پر جو احسان آپ کا بنگال میں — کیا بتاؤں غم سے ہچکی پے بہ پے آنے لگی

دیکھو مرزا اب زباں کھولو نہ اپنی چپ رہو
کالی کالی قلب پرغم کی گھٹا چھانے لگی

مصنف سیرۃ النبی سید سلیمان ندوی ماہر وفیات نے ان کی وفات پر لکھا کہ

''جنیبی۔ دوستوں نے تمھارے لیے مرثیے لکھے۔ احباب نے تمھارے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی۔ جاننے والوں نے تمھارے اوصاف گنائے۔ ماننے والوں نے تمھارے احسانات یاد کیے مگر تم اس دنیا میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح و ستائش کی حکایتیں نہیں پہنچتیں۔ مغفرت کی دعائیں تمھارے لیے ہیں غفور و رحیم ان کو قبول فرمائے۔'' آمین

پسماندگان:

بعد انتقال ایک وسیع حلقۂ احباب سوگواروں کا اور چار صاحبزادے دو صاحبزادیاں حیات چھوڑی تھیں۔

1- الحاج حکیم ارتضاالرحمٰن خان صاحب آخون زادہ پرنسپل طبیہ حبیبیہ کالج ڈھاکہ۔

2- حکیم حسام الرحمٰن خان آخون زادہ، آپ طبیہ حبیبیہ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں اور آپ کا مطب بڑا دواخانہ کے نام سے نیو مارکیٹ ڈھاکہ میں ہے۔

3- اجتباء الرحمٰن صاحب جو ایل۔ آئی۔ سی۔ میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔

4- اصطفا الرحمٰن خاں

حکیم صاحب کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ ہر کھانے کے وقت احباب کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان احباب میں مولانا ظفر احمد عثمانی خواجہ شہاب الدین، سید طیفور، ڈاکٹر محمود حسن سابق چیئرمین پبلک سروس کمیشن ڈاکٹر محمود حسین خاں قابل ذکر تھے جا بجا تذکروں میں حکیم صاحب مرحوم کے دستر خوان کا ذکر بار بار آیا ہے۔ جس میں نہاری شب دیگ، حلیم قبولی، مرغ کباب، مرغ پلاؤ، زعفرانی، ہلسہ کباب، کشمیری سالن، شکاری سالن، حکیم صاحب کے دستر خوان کی خاص ڈشیں ہوا کرتی تھیں جس کو وہ بڑے اہتمام سے پکواتے اور کھلانے میں مسرت حاصل کرتے تھے۔

معرکے:

بعض دفعہ تو مریض کی تشخیص و تجویز اور علاج لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ اکثر و بیشتر صورت دیکھ کر یا آواز سن کر اور وہ بھی ریڈیو کی آواز سن کر مریض کا مرض اور اس کا علاج بتلا دیا کرتے تھے اور مریض اس پر عمل کر کے صحت یاب ہو جایا کرتے تھے۔

مرحوم طبیب اور حاذق طبیب تھے قیافہ اور نباضی میں حد درجہ کمال رکھتے تھے۔

1944 میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی علالت کا حال مولانا ظفر احمد عثمانی سے سن کر مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی۔ جب تھانہ بھون سے خطرناک حالت کی اطلاع آئی تو کہا کہ اب دوا بیکار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وقت آخر آ پہنچا اور آخر جیسا انھوں نے کہا ویسا ہی ہوا۔

ایک بار ان کے ایک مریض دہلی تشریف لے گئے اور اپنے مرض کے سلسلہ میں مسیح الملک جناب حکیم حافظ محمد اجمل خان سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ جواب ملا کہ ڈھاکہ سے۔ اس پر مسیح الملک صاحب نے فرمایا کیا اب حکیم حبیب الرحمٰن صاحب وہاں تشریف نہیں رکھتے۔

اس کے بعد انھوں نے نسخہ لکھ دیا۔ اس نسخہ میں اور حکیم حبیب الرحمٰن کے نسخہ میں سرمو فرق نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی طبی حذاقت کا ایک واقعہ خود علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مصنف سیرۃ النبی سے منسوب ہے۔ لکھتے ہیں کہ

''کئی سال کی بات ہے۔ میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا، میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سنی جو آپ کے ضعف قلب کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کی خبر جلد لیں۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہی مجھے اسی قسم کے سخت مرض کا سانحہ پیش آیا جس سے اللہ تعالیٰ نے جانبری فرمائی۔''

غرضیکہ ایسے ایسے قابل عالم فاضل طبیب گزرے ہیں جو ادب کا میدان ہو یا طب کا۔ دونوں مقامات پر ان کی حیثیت امر مسلم ہے۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر

1306ھ مطابق 1888 1943

(ماہر سرجن طبیب)

سرزمین لکھنؤ کو علوم وفنون علاج ومعالجہ شعروادب کی وجہ سے خصوصی مقام حاصل رہا ہے اور اسی مرکزیت کی وجہ سے دور دراز مقامات سے علما وفضلا نیز اطبا ہجرت کرکے لکھنؤ منتقل ہوتے رہے تھے۔

خاندان:

ان ہی اوقات میں حکیم محمد ہادی رضا خاں کے پردادا حکیم مولوی حاجی محمد علی رضا 1815 میں ایک بہت مشہور زمانہ طبیب تھے جو کشمیر کی جانب سے لکھنؤ آکر آباد ہو گئے تھے اور ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں ومہاراجاؤں کا کامیاب علاج کرکے خاص وعام میں بہت ہردل عزیز ہو گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم مولوی محمد حسن رضا 1825 میں اپنی فنی قابلیت اور تجربہ کی بنیاد پر راجہ صاحب بنارس کے طبیب خاص ہو گئے تھے اور اپنے زمانے کے طبیب اعظم مشہور تھے۔ حکیم مولوی محمد حسن رضا کے دو صاحبزادے تھے۔

1- حکیم مولوی احمد رضا خاں

2- حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں۔

آپ کے والد بزرگوار حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں 1901 میں والی ریاست رامپور

ماہر سرجن حکیم محمد ہادی رضا خاں صاحب مرحوم

نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے طبیب خاص مقرر ہو گئے تھے اور ریاست رامپور میں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر کے زمانے میں عرصہ تک افسر الاطبا یعنی ڈائرکٹر رہے۔ آپ کے بڑے بھائی حکیم محمد احمد خاں کا مطب ریاست رامپور میں بہت کامیاب تھا اور مطب میں مرضا کا مجمع لگا رہتا تھا۔

حکیم محمد رضا خاں نے بڑے معرکے کے علاج کیے تھے۔ ان معرکے کے علاجوں سے متاثر ہو کر ہی نواب صاحب نے ان کو رامپور کے سرکاری شفا خانوں کا ڈائرکٹر مقرر کیا تھا۔

حکیم مولوی محمد حسین رضا خاں کو درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔ آپ کے ذاتی مطب میں طالبان فن طب کا ہمیشہ مجمع رہتا تھا۔ دور دور سے شائقین فن طب تحصیل علم کی غرض سے حکیم حسین رضا کی خدمت میں آتے تھے۔ درس و تدریس کا حلقہ جب زیادہ وسیع ہو گیا تو 1902 میں حکیم مولوی محمد حسین رضا نے صوبہ کے مرکزی مقام لکھنؤ میں ایک طبی درسگاہ بنام ''منبع الطب کالج'' کی بنیاد رکھی اور باقاعدہ طلبا کے داخلے و تعلیم کا انتظام کیا۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف طبی خانوادہ خاندان عزیزی جھوائی ٹولہ کا آپ کے خاندان رضائی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ خاندان رضائی کی کئی صاحبزادیاں خاندان عزیزی میں منسوب ہو کر گئیں تھیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے مشہور طبیب شفاالملک حکیم عبدالمعید صاحب مرحوم کی والدہ محترم حکیم محمد حسین رضا خاں کی ہمشیرہ تھیں۔

پیدائش:

آپ کی پیدائش یوپی کے مشہور شہر ادب لکھنؤ کے مرکز طب و علم جھوائی ٹولہ 13 اکتوبر 1888 مطابق 26 محرم 1306ھ بروز چہار شنبہ کو ہوئی۔

تعلیم و تربیت:

حسب توقع تعلیم کی ابتدا گھر سے ہوئی۔ والد کے ریاست رامپور سے وابستہ ہونے کی بنا پر گھر پر ابتدائی اردو فارسی اور کچھ انگریزی کی تعلیم ہوئی۔ آپ بچپن سے ہی بڑے ذہین چست اور محنتی ہونے کے ساتھ انتہائی باہمت و خداداد قابلیت کے حامل تھے۔ اردو، فارسی، انگریزی نیز قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے پرائیویٹ طور پر انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ 1901 میں انگریزی تعلیم ترک کر کے منطق، فلسفہ اور عربی، فارسی کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔

مولوی غلام محمد پنجابی سے عربی صرف ونحو اور فلسفہ کی تعلیم شروع کی اور بعض کتب ادب مولانا محمد طیب عربی مکی سے پڑھیں۔ علوم عربیہ میں آپ کو فخر الاساتذہ حضرت مولانا محمد عبد الغفار مرحوم رامپوری اور استاذ الاساتذہ مولانا حاجی حافظ ابو الافضال محمد فضل حق پرنسپل مدرسہ عالیہ ریاست رامپور سے تلمیذیت کا فخر حاصل کیا۔

طبی تعلیم:

1904 سے اپنے پدر محترم حکیم محمد حسین رضان خاں سے باقاعدہ علم طب کی تعلیم حاصل کی اور جو کتب طب آپ پڑھتے جاتے تھے وہ وہ کتب طب طبی طلبہ کو پڑھاتے بھی جاتے تھے۔

1908 میں آپ کی طبی درسیات ختم ہو گئیں اور آپ کے والد بزرگوار نے اپنے دست مبارک سے سند فراغت عطا کی۔ آپ نے ریاست کے سرکاری کتب خانے میں قلمی کتب طبیہ دحواشی غیر مطبوعہ کا گہرا مطالعہ فرمایا۔ 1909 میں آپ کے والد افسر الاطبا حکیم محمد حسین رضا خاں کا انتقال ہو گیا اور طبی درسگاہ و مطب کی ساری ذمہ داریاں آپ پر ہی آن پڑیں۔

نام:

آپ کو حکیم خواجہ محمد ہادی رضا خاں کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

قومیت:

آپ نسبی طور پر کشمیری مغل ہیں۔

مذہب:

آپ سنی حنفی العقائد تھے اور یہی مسلک آپ کے اجداد کا تھا۔

شعر و ادبی ذوق:

حکیم ہادی رضا کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ماہر تخلص فرماتے تھے اور بہت باذوق شاعر تھے۔ مرکز شعر و ادب لکھنؤ کی اہم علمی و ادبی نشستوں میں شرکت فرماتے تھے اور داد و تحسین سے سرفراز کیے جاتے تھے۔ حکیم ہادی رضا کا شعری مجموعہ ان کے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا ادیب کی کوششوں سے ان کے انتقال کے بعد کلام ماہر کے نام سے زیور طباعت سے مزین ہوا جس پر تعارف یوپی کی معروف شخصیت الحاج حضرت مولانا الفقر جوہانی وارثی نے اور کلام پر تبصرہ

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا تھا۔

حکیم صاحب نے حمد و نعت غزلیات قطعات قطعات تاریخ نیز سیاسی انداز سے نظمیں کہی تھیں۔ حکیم صاحب کے شعری مجموعہ کی اشاعت پر حکیم مولوی عبدالجلیل خان ہما فاضل و کامل بجنوری نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

مہارت کاملہ بہتر نمونہ سمجھو

1969

"کلام ماہر"

شاگرد:

حکیم ہادی رضا نے شعر و شاعری میں کسب فیض سخن حضرت علامہ افقر موہانی سے حاصل کیا تھا۔ خان رامپور کا خاندانی لقب ہے اور خواجہ بوجہ والدین کے صحیح النسب کشمیری ہونے کے جواہل کشامرہ کا علمی و بزرگی و سرداری کا خطاب ہے۔

حکیم ہادی رضا نے بہت تھوڑا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ بہت خوب کہا ہے۔

مقولہ ہے کہ "یہ دیکھو کیا کہا ہے یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے" کے بقول حکیم ہادی رضا اگر حمد باری میں دعا کرتے ہیں تو کہتے ہیں ۔

اللہ اللہ درد دل کی ہے دوا — اللہ اللہ میں عجب دیکھی شفا
اللہ اللہ ہے فقیروں کی صدا — اللہ اللہ ہے غریبوں کی ندا
اللہ اللہ ہے بڑا مشکل کشا — اللہ اللہ سب کا ہے حاجت روا
اللہ اللہ باعث ایجاد خلق — اللہ اللہ سامع فریاد خلق
اللہ اللہ دین ہے ایمان ہے — اللہ اللہ قدسیوں کی جان ہے

عشق و محبت کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ۔ یاد حسین منقبت۔ غرضیکہ ہر میدان میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

متفرقات میں قطعات رباعیات۔ قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔

سامنے مرے ذرا بیٹھ تو جائے کوئی — نہ کرے بات تو صورت ہی دکھائے کوئی

حال جو دل کا ہے کیا تم کو بتائے کوئی — کس لیے جان مصیبت میں پھنسائے کوئی
میں نے غیروں کو جو دیکھا تو کہا یہ اس نے — مرے گھر اب نہ خدا کے لیے آئے کوئی
جل کے بولے جو کیا میں نے سوالِ بوسہ — تو وہ ہے تجھ سے تو بس منہ نہ لگائے کوئی
شکوۂ غیر پہ منہ پھیر کے ظالم نے کہا — جو جلے ہم سے اسے کیوں نہ جلائے کوئی
روز ہر بات پہ جو روٹھنے والا ٹھہرا — کیا کرے ایسے کو کس طرح منائے کوئی
اپنی آنکھوں کو اٹھا کر یہ کہا غصے سے — میری محفل میں خبردار نہ آئے کوئی

تو ہی جب بھول گیا کوچۂ جاناں ماہر
تجھ کو دیوانہ ہے جو راہ بتائے کوئی

1926 میں منبع الطب طبیہ کالج کے سالانہ جلسہ کے مشاعرے میں ایک ایسا مطلع پڑھا تھا جو اللہ والوں کے کام کا تھا اور بعض نے اسے مناجات میں شامل کر کے وظائف تک میں برابر استعمال کیا جو مطلع پڑھا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

رحمت پکارتی ہے کہ دست دعا نہیں
باب کرم کھلا ہے کوئی مانگتا نہیں

اس سالانہ جلسہ و مشاعرے میں جب جلسۂ تقسیم اسناد ہوا نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری اسٹیٹ گورنر یوپی نے صدارت فرمائی تھی۔

حکیم ہادی رضا کے دیگر مشاغل میں شعر و شاعری کا شغل بھی داخل و شامل تھا جس سے وہ اکثر و بیشتر تفنن طبع بھی حاصل فرماتے رہتے تھے اور یہی ایک ایسا شغل تھا جو ان کی دوسری افکار و پریشانیوں کا ازالہ کہلائے جانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اپنے برادر نسبتی کے عقد سعید پر جو حسب دستور سہرا لکھا اور بوقت حاجت پڑھا تھا تو سننے والے سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

سر پہ باندھا ہے جو ترے قد کے برابر سہرا — ڈھل گیا نور کے سانچے میں سراسر سہرا
ذرہ انجم کو اگر جمع کریں بحر و فلک — نہ بنے اُن سے بھی ہرگز ترا گز بھر سہرا
کس کی شادی کی ہے یہ دھوم بنا کون بنا — زہرہ گاتی ہے خوشی سے جو فلک پر سہرا

جس طرح پرتو خورشید سے ذرہ کو فروغ یوں ترے روئے درخشاں سے منور سہرا
کس کی تعریف لکھوں مجھ کو عجب حیرت ہے طرہ سہرے سے فزوں طرہ سے بڑھ کر سہرا
اپنے سہرے کی گھڑی تجھ کو مبارک ہو رشید
تیرے ماہر نے کیا ختم دعا پر سہرا

حکیم ماہر کے زمانے میں لکھنؤ جو نہ صرف مرکز علم و ادب تھا بلکہ علوم و فنون اور علاج و معالجہ کا معتبر اور منفرد مقام تھا اس وقت وہاں زبان دانی پر زور طبع زیادہ صرف کیا جاتا تھا۔اس کے نمونے جابجا کلام ماہر میں موجود ہیں۔مستند روایات شعری سے انحراف ان کے یہاں قطعی نہیں ہے لیکن اس روایتی شاعری میں بھی باوجود معروفیت کے حکیم ہادی رضا ماہر نے بعض اشعار نہایت روایتی تسلسل اور خوب صورت انداز میں پیش کیے ہیں۔

دنیا میں آ کے شان بشر کچھ نہ پوچھیے سب کچھ ہے اختیار مگر کچھ نہ پوچھیے
(2) رسائی میرے تخیل کی رنگ و بو تک ہے مجھے حقیقت فصل بہار کیا معلوم
(3) کیا جانے کسی امید کے پردے میں بے خودی
محو نظارہ ہو گئی ہستی کے خواب میں
(4) ماہر اسی کا نام فریب حیات ہے انساں کو اپنی موت کی پروا ذرا نہیں

اگر حکیم ہادی رضا کی حیات کچھ اور وفا کرتی تو وہ اس چمن زار میں اور بھی خوب صورت گل کھلا سکتے تھے۔کیونکہ کلام ماہر میں موجود ان کی غزلیات،نظمیں،قطعات اور فن تاریخ گوئی اس بات کی غمازی کرتی ہیں اور شاہد ہیں۔

حکیم ہادی رضا کو نہ صرف شعر و شاعری سے بلکہ ادب طب سے ایک گونہ محبت تھی۔پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کہا تھا کہ وہ اس سوسائٹی کے ایک ممتاز فرد تھے۔جب شعر گوئی اور سخن سنجی ہماری تہذیب اور شائستگی کا ایک جز و لاینفک سمجھی جاتی تھی۔کوئی کسی علم و فن میں دستگاہ رکھتا۔سخن گوئی کا ذوق یا سخن فہمی کا شوق ضرور رکھتا تھا۔حکیم صاحب پیشہ کے اعتبار سے تو طبیب تھے لیکن طبیعت کو شعر گوئی سے کافی مناسبت تھی۔طبعی مناسبت نہ بھی ہوتی تو بھی وہ اس فن کو اپنے پیشے میں کامیابی کے لیے ضرور حاصل کرتے۔کیونکہ یہ فن ایک علم مجلسی بن چکا تھا۔حکیم صاحب نے بھی اپنی

حذاقت کے ساتھ ساتھ اپنی موزوں طبعی کر کے کرشمہ متعدد شعر و شاعری کی مجلسوں میں دکھائے اور ان میں کامیاب بھی رہے۔اس کے ساتھ ساتھ حکیم ہادی رضا تاریخ طب میں اپنی حیثیت سے واقف تھے اور اپنی عظمت کو پہچان گئے تھے۔ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ اپنی عظمت رفتہ کو پہچان گئے ہوں۔

اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ''لمحات حیات ماہر'' ہے اپنے شب و روز کے اوقات مصروفیات قلم بند کیے ہیں جس سے ان کی شخصیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔جو درج ذیل ہے۔

منظور ہے ماہر سے ملاقات تو یارو — وہ شب کو تمھیں خانۂ ویراں میں ملے گا
پھر آخر شب اس کو اگر ڈھونڈیں گے احباب — مصروف تلاوت انھیں قرآن ملے گا
پھر وقت سحر ہوگا مصلّٰی پہ نمایاں — مصروف دعا خانۂ یزداں میں ملے گا
پھر صبح کو چارہ گر نوع بنی انساں — مصروف علاجات مریضاں میں ملے گا
دوپہر کو وہ مرد خدا تم کو مکاں میں — تدوین کتب حکمت یوناں میں ملے گا
سہ پہر کو پاؤ گے اسے درس میں مصروف — اصحاب سخن سنج و سخن داں میں ملے گا
پھر شام کو وہ رند خرابات محبت — وارفتۂ جاں محفل خوباں میں ملے گا
اور جمعہ کو مل جائے گا گر وقت مشاغل — مصروف عمل خدمت انساں میں ملے گا
دیکھو گے اگر اس کو حقیقت کی نظر سے — ڈوبا ہوا وہ بحرہ عرفاں میں ملے گا
جب دیکھو گے پاؤ گے اسے محو تمنا — کھویا ہوا جذبات کے طوفاں میں ملے گا
القصہ اسے دیکھو گے بے جان کسی دن — یا اس کا نشاں شہر خموشاں میں ملے گا
جو مست ہے خوشبوئے مدینہ کے اثر سے — کیا لطف اسے سنبل و ریحاں میں ملے گا

پھر بعد فنا ہوگی اگر اس کی ضرورت
تاریخ کے اوراق پریشاں میں ملے گا

وفات:

حکیم ہادی رضا ماہر جو منبع الطب طبیہ کالج کے نگراں تھے اور ہیضہ کے علاج کے ماہر۔ بہ سلسلہ منبع الطب طبیہ کالج رامپور گئے تھے۔ہیضہ کا خود شکار ہو کر بریلی شریف اپنے برادر خورد حکیم

حبیب رضا کے پاس گئے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر 20 جون 1943 کو داغ مفارقت دے کر معبود حقیقی سے جا ملے۔ میت لکھنؤ لا کر حیدر گنج کے شہر خموشاں جو ان کی ننہالی قبرستان ہے تدفین ہوئی۔

انھوں نے خود عرض کیا تھا۔

ماہر فن ہادی راہ طبابت چل دیا
در حقیقت معنی لفظ محبت چل دیا

ان کے انتقال پر ان کی طب کی درس گاہ کے شاگرد رشید حکیم مشتاق احمد خاں غبار بارہ بنکوی نے نذرانۂ عقیدت کے جو پھول اشعار کی شکل میں نذر کیے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اے سید فن طب اے مولوی ہادی رضا — زندہ جاوید ہے ایثار تیرا مرحبا
اے ہمہ معصومیت اے ساکن دارالسلام — خدمت اقدس میں تیری عرض کرتا ہوں سلام
دیکھ کر تیری شبیہ پاک بھر آتا ہے دل — ہر ادا میں پا رہا ہوں ایک جذب مستقل
دوررس ہوتی ہے ہر عامی سے شاعر کی نگاہ — کر رہا ہوں قلب میں محسوس لطف بے بیاں
مرگ تیری اک مقدس زیست کی تفسیر ہے — اللہ اللہ کس قدر منہ بولتی تصویر ہے
شاہکار زندگانی تیرے یوں بیدار ہیں — مرگ میں بھی تیری گویا زیست کے آثار ہیں
اے مقیم خلد ہاں اے جادہ پیمائی فنا — ہر قدم پر دیکھتا ہوں تیرے آثار بقا
ظلمتیں جب ہوں سواد شام میں پرچم کشا — کاکل شب میں ہو جب افشاں ستاروں کی ضیا
شرق سے ہونے لگے نور سحر جب ضوفشاں — جب ہوائے صبح سے مرجھائے شام کہکشاں
جب کہ آنکھوں میں ستاروں کے خمار آنے لگے — تا کمر جب شب کی زلف مشک بار آنے لگے
خوشۂ انگور کا ہو جب ثریا پر گماں — چاندنی کا کھیت جب بن جائے کشت زعفراں
کروٹیں لیتی ہو جب سبزے پہ موج آب جو — جب شعاعیں چوس لیں سبزے کی نبضوں کا لہو
لمحہ لمحہ یوں ہی ہستی کا تغیر خیز ہے — انقلاب تازہ ہر شے کے لیے مہمیز ہے
اس کشاکش سے مگر برتر ہے اب تیرا مقام — تیری فطرت اب نہیں ہے اس تغیر کی غلام
نور عالم سے یکسائے روز و شب صبح و شام — آ رہی ہے قلب کے اعماق تک تیری ضیا

وہ تیرا روئے منور وہ تیرا حسن جبیں
آرزو کی انجمن میں گویا ہے شمع مبیں

زیب پیشانی ہیں یونہی واغبائے ضوفشاں
جس طرح اوراق مصحف پر ہوں سجدوں کے نشاں

وہ خم محراب ابرو اور وہ مژگاں دراز
ترک ہوں جس طرح سے صف بستہ از سہر نماز

کون کہہ سکتا ہے وہ تصویر اب بے جان ہے
ہر ادا میں جس کی تازہ زندگی کی شان ہے

منبع الطب تیرے جو بھی فیض سے سیراب تھا
اس کا گوشہ گوشہ رشک جنت شاداب تھا

تیرے امکانی مساعی ہر طرح تھے آبیار
دم قدم سے تیرے یہ کالج رہا رشک بہار

چل بسا ہاں چل بسا لیکن کچھ ایسا کر دیا
طب یونانی کو اعجاز مسیحا کر دیا

اے خوشا وقتیکہ ہو اس پر نگاہ لطف یار
خاک پائی رہ رواں ہے جبکہ یہ مشت غبار

پسماندگان:

ان کی شادی 1913 میں خواجہ امیر شاہ تحصیل دار کی دختر رزاقی بیگم سے ہوئی تھی۔ جس سے تین صاحبزادیاں (1) آفاق جہاں بیگم (2) جہاں آرا بیگم (3) عصمت جہاں بیگم اور دو صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب اور بریگیڈیر محمد شاہ رضا تولد ہوئے۔

تصانیف:

ذیل کی کتب آپ کی وسعت معلومات زور قلم اور کثیر تجربات تحریری و تاریخی ہیں۔ جن کو اطبانے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بعض تو دو بارہ و سہ بارہ شائع ہوئی ہیں۔

1-قرابادین رضائی فارسی:

یہ قرابادین آپ نے 1907 میں مرتب کی تھی جس میں بہترین 500 مرکبات مع حل لغات موجد و صانع اول مرکب کا نام اور اس کی وجہ تسمیہ بحوالہ کتب طبیہ بحروف تہجی درج کیے گئے ہیں۔ اوزان بجائے عربی کے جو مروج تھے اس وقت مثقال و رطل کے رتی و ماشہ کے لکھے ہیں اور آخر میں اوزان طبی عربی، فارسی، ہندی، ایرانی، ترکی، یونانی، وسیدی ڈاکٹری وغیرہ تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔

2-القانون فی علاج الطاعون:

حکیم ہادی رضا ماہر نے یہ رسالہ اپنے والد ماجد کی خواہش پر ترتیب دیا تھا۔ مرض طاعون کے تمام متعلقات کو اس حسن وخوبی سے قلمبند کیا ہے جس کی کوئی دیگر نظیر نہیں ملتی ہے۔

آل انڈیا یونانی وویدک کانفرنس منعقدہ رامپور 1916 اس کو نہ صرف اجمل خاں بلکہ دیگر مشاہیر فن طب نے پسندیدگی کی سند دی تھی اور شفاء الملک حکیم اجمل خاں کے اس سند پر دستخط بھی ہیں۔

3-القول الکامل فی ذخیر الحق والباطل:

اس رسالہ میں زحیر (پیچش) کے تمام اختلافی مسائل مع فنی نکات اسباب وعلاج وعلامات بامحاورہ سلیس عربی میں تحریر کیا ہے۔

4-قانون طب:

اس رسالہ میں تمام قوانین مطب واصول طب کو جن کا تعلق خاص کر مطب سے ہے بڑی قابلیت سے تحریر فرمایا ہے۔

5-اصطلاحات الاطبا:

جس میں اطبا قدیم کے تمام اصطلاحات بڑی خوش اسلوبی سے تحریر فرمائے ہیں۔

6-عجائب المفردات:

اس میں ان جڑی بوٹیوں کا ذکر ہے جن کا موجودہ کتب میں پتہ نہیں چلتا ہے اور جو اپنے اثرات میں تیر بہدف ہیں۔

7-الحیات:

ایک زمانے میں لکھنؤ میں طاعون کا بڑا زور تھا۔ سینکڑوں موتیں اس موذی مرض میں ہوگئی تھیں۔ حکیم صاحب نے الحیات نام کی ایک ڈبیہ ایجاد کی تھی اس ڈبیہ کی خوبی یہ تھی کہ جو شخص اس ڈبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا وہ طاعون سے محفوظ رہتا تھا۔

جون 1933 میں الطبیب کے نام سے لکھنؤ سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا اور جو چند سال جاری وساری رہا۔

غرضیکہ آج جبکہ نہ وہ خود ہیں نہ وہ زمانہ اور نہ وہ ارباب زمانہ تاہم ان کی یادان کے کلام، ان کی تصانیف سے باقی ہے اور جب کبھی ان کا ذکر آتا ہے تو ان کے مذکورہ اشعار بھی یاد کو تازہ بنا دیتے ہیں۔

قومی وملی خدمات نیز تحریک آزادی میں تعاون:

ملک کی جدوجہد آزادی سے بھی حکیم ہادی رضا ماہر کا قریبی تعلق رہا تھا۔ ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے زمانے میں ایک موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو جب لکھنؤ آئے تو حکیم ہادی رضا نے ان کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کی ایک تصویر نہ صرف جنگ آزادی کے مجاہدین کی یاد دلاتی ہے بلکہ روز روشن کی طرح اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے کہ جنگ آزادی میں اطبا کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

صوبۂ پنجاب میں مجاہدین آزادی پر ہو رہے مظالم سے متاثر ہو کر انھوں نے جو اشعار کہے تھے وہ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ان کے دل میں تحریک آزادی کی تڑپ کتنی شدید تر تھی۔

وہ نظم جو انھوں نے پنجاب کے مجاہدین کے لیے کہی تھی درج ذیل ہے۔

بازا آیا دیکھ لی حالت تری سرکار کی — حق طلب کرنے پہ جس نے قید کی بھر مار کی
گر یہی حالت رہی اس شوخیِ رفتار کی — جوش میں آجائے گی رحمت پھر میرے غفار کی
شانتی وقید خانے بازوئے سوراج ہیں — کیا ضرورت توپ کی بندوق کی تلوار کی
جور سے پنجاب ہے مجروح سارا ہندوستاں — ہے دوا سوراج ہی اس وقت کے بیمار کی
معتدل فتویٰ کی ضبطی کم نہیں قرآن سے — جان ہی لیوا ہے جو ہے بات دل آزار کی
گولہ باری یاد ہے ظلم وستم بھولے نہیں — کیا قیامت خیز ہے حالت مری سرکار کی
جان دینے قید ہونے کو تو خود حاضر ہیں ہم — دین وایماں چھین لیں یہ کب مجال اغیار کی
مارشل لا کی ضرورت کیا کہ اہل ہند کی — گردنیں مشتاق ہیں خود آج کل تلوار کی

سر سے اب آب مظالم بڑھ چلا ہے اس قدر
کوئی دن میں ڈوبتی ہے آبرو سرکار کی

جوش تحریک آزادیٔ ہند سے اس وقت شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو متاثر نہ ہوا ہو

تحریک خلافت، تحریک ترک موالات غرضیکہ کوئی بھی تحریک رہی ہو اطبا کبھی بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔ اسی طرح تحریک خلافت میں بھی حکیم صاحب نے صرف زبانی حصہ نہیں لیا بلکہ بڑھ چڑھ کر تعاون دیا۔ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کے دنوں میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا ۔

یارب کرم کہ حد سے فزوں ہے غم والم
بدنام و خوار امت خیر الانام ہے
اسلام درد مند مسلماں ہیں مضطرب
زغہ میں دشمنوں کے ہمارا امام ہے
ہے تیرے ہاتھ دولت عثمانیہ کی لاج
دشمن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہستی امام ہے

طلباطب سے شفقت:

حکیم ہادی رضا اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور اس قدر دل لگا کر محنت و محبت سے ان کو درس دیتے تھے کہ طلبا ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

1940 کی بات ہے کہ حکیم ہادی رضا خاں منبع الطب کالج میں قانون شیخ کا ایک اہم مسئلہ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔ 2 گھنٹے مسلسل کتاب میں موجود ایک مسئلہ پر لیکچر دیا۔ دوسرے دن پھر وہی بحث چھیڑ دی اور تیسرے دن اس مسئلہ پر پھر تقریر شروع کر دی۔ جب سب طلبا چلے گئے تو ان کے صاحبزادے حکیم صابر رضا ادیب جو تینوں دن کی بحث پر موجود تھے۔ اپنے والد محترم سے دریافت کیا کہ قبلہ ایک مسئلہ کو سمجھانے میں آپ نے تین دن لے لیے۔ حکیم ہادی رضا نے فرمایا کہ بیٹا یہ طلبا بہت دور دور سے تحصیل علم طب کے لیے میرے پاس آئے ہیں میرا فرض ہے کہ میری جو ناقص معلومات اس مسئلہ سے متعلق ہیں ان کو سمجھا دوں۔ اگر درس دینے میں میں بخل کروں گا تو یہ بیچارے کس سے اور کہاں سے علم حاصل کریں گے اس محبت اور خلوص کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کے پڑھاتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار اطبا نہ صرف یوپی میں بلکہ بنگال، اڑیسہ مدراس، آندھرا پردیش، صوبہ سرحد افغانستان، قندھار اور بخارا تک موجود ہیں جن میں سے بعض تصنیفی اور معالجاتی حیثیت سے ملک میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

حکیم ہادی رضا اپنی فنی مہارت بہترین تشخیص علاج و معالجہ نیز خداداد ذہانت کی وجہ سے لکھنؤ کے اطبا میں حاذق طبیب مشہور ہو گئے تھے آپ ایک بہترین مقرر تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں آپ کی جامع اور مدلل تقریریں سن کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے آپ گھنٹوں تقریریں کرتے مگر زبان پر لغزش نہیں ہوتی تھی۔ آپ فارسی اور پشتو زبانیں بہت روانی سے بولتے تھے۔ چنانچہ افغانستان کی جانب سے بہت سے افغانی آپ سے طب کی تعلیم حاصل کرنے لکھنؤ آتے تھے۔

طبی وغیر طبی معرکے:

لکھنؤ حاذق اطبا کا مرکز رہا ہے لیکن ایسے طبیبوں کی تعداد بہت کم رہی ہے جن میں طبی حذاقت اور جراحی کا کمال دونوں جمع ہوں خاندان عزیزی کے اہم رکن حکیم عبدالعزیز نے اس کمی کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور شفاء الملک حکیم عبدالرشید اور شفاالملک حکیم عبدالحمید کو باقاعدہ سرجری کی تعلیم دلوائی۔ ان دونوں نے سینکڑوں چھوٹے بڑے آپریشن کیے اور سرجری کو مستقل اپنی پریکٹس کا جز بنائے رکھا۔ خاندان رضائی اور حکیم عبدالحلیم کے کالج میں بھی یہ امتیاز قائم رہا۔

حکیم صاحب ایک ماہر سرجن بھی تھے:

حکیم ہادی رضا کو معالجہ کے علاوہ سرجری سے خاص دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں اپنا مطلب شروع کرنے کے بعد انھوں نے سرجری کی جانب کافی توجہ دی تھی لکھنؤ میڈیکل کالج میں انھوں نے ایک انگریز سرجن ڈاکٹر کے ساتھ آپریشن کر کے کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اپنے مطب میں سرجری کا ایک شعبہ بھی قائم کیا تھا اس میں آپ روزانہ کئی کئی آپریشن کیا کرتے تھے اور منبع الطب کالج کے طلبا کو عملی طور پر سرجری کی تعلیم بھی دے دیتے تھے۔ آج بھی یونانی اسپتال میں ایک فوٹو موجود ہے جس میں حکیم ہادی رضا ایک مریض کی آنکھ کا آپریشن کر رہے ہیں۔ حکیم صابر رضا اور دیگر طلبا طب اس فوٹو میں آپریشن دیکھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

حکیم صاحب کو آنکھ کے آپریشن کا خاصہ تجربہ تھا اور دور دور سے مریض آنکھ کے آپریشن کے لیے آتے تھے۔

تانگے والے کا ہاتھ کاٹا گیا:

ایک دن ایک تانگہ والا خون میں لت پت حکیم ہادی رضا کے دوا خانہ لایا گیا اور حکیم

صاحب کو بتایا گیا کہ اس کے گھوڑے نے غصہ میں آکر اس کا ہاتھ چبالیا۔ حکیم صاحب نے تانگے والے کا ہاتھ بغور دیکھا اور پایا کہ اب ہاتھ کام کا نہیں رہا اگر اس کو جلدی بدن سے الگ نہیں کیا گیا تو تانگے والے کے بدن میں زہر پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ گھر والوں کی مرضی سے حکیم صاحب نے اسی وقت تانگے والے کو بیہوش کر کے بہت صفائی سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ بہت دنوں تک ایک شیشہ کے بڑے کنسٹر میں حکیم صاحب کے مطب میں رکھا رہا۔ اور اس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے رہتے تھے۔ حکیم صاحب کے آپریشن روم میں ہزاروں روپے کے قیمتی جرمنی کے بنے ہوئے سرجری کے اوزار تھے۔ حکیم صاحب کو انگریز اعلیٰ حکام کی جانب سے کوکین، مارفیا، کلوروفارم جیسی خطرناک دواؤں کے رکھنے کی باقاعدہ اجازت تھی۔ آج بھی ان کے ورثا کے پاس یہ سرٹیفکیٹ جو انگریز سول سرجن نے دیا تھا اور مذکورہ دوا میں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی محفوظ ہے۔

مرضا سے ہمدردی اور محبت:

1935 کی بات ہے کہ ایک دن حکیم محمد ہادی رضا خاں مطب میں مریضوں میں بہت مشغول تھے ان کے ایک پرانے مریض مرزا صاحب حیران و پریشان آئے اور حکیم صاحب سے عرض کیا۔ قبلہ میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے اس کو آپ ابھی ملاحظہ کر لیں۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب مرزا صاحب کے ساتھ پہنچے۔ مرزا صاحب کا مکان مطب سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ حکیم ہادی رضا صاحب نے واپس آکر اپنے صاحبزادے حکیم محمد صابر رضا سے جو اس وقت مطب میں موجود تھے کہا کہ بیٹا ایک پیالہ بکری کے شوربے کا جلد انتظام کر کے مرزا صاحب کو دے دو۔ حسب حکم والد صاحب کے حکیم محمد صابر رضا ادیب نے اس کا انتظام کر دیا۔ جب مطب سے مرضا اور طلبا چلے گئے تو حکیم محمد ہادی رضا کے استفسار پر کہ مریض کے گھر کھانا بھجوانے کی کیا ضرورت پیش آئی تو انھوں نے فرمایا بیٹا تم نہیں جانتے۔ میں مرزا صاحب کی جس لڑکی کو دیکھ کر ابھی آیا ہوں وہ ٹی بی کی مریضہ ہے اور چند گھنٹوں کی مہمان۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حکیم صاحب میں کیا کھاؤں تو میں نے اس کو بکری کا شوربہ چپاتی کھانے کو بتایا۔ اس نے کہا کہ حکیم صاحب میں بکری کا شوربہ آپ کے گھر کا کھانا چاہتی ہوں۔

اگر آخری وقت میں اس کی خواہش پوری کردوں تو میرا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح حکیم ہادی رضا خاں اکثر و بیشتر غریب غربا کی فیس تک واپس کردیا کرتے تھے۔

تذکرہ حاضر دماغی کا:

حکیم صاحب مزاجاً انتہائی خلیق اور جری واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ یوپی کے آخری انگریز گورنر مسٹر ہیلیٹ نے 1942 میں طب کو درپیش مسائل پر گفتگو کے لیے بلایا۔ حکیم ہادی رضا وقت مقررہ پر گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ گورنر صاحب نے دیر تک حکیم ہادی رضا سے خوش گوار ماحول میں بات چیت کی۔

دوران گفتگو حکیم صاحب کو گورنر صاحب کو انگریزی میں کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ حکیم صاحب کے انگریزی بولنے پر گورنر صاحب نے حکیم صاحب سے دریافت کیا۔

''ول حکیم صاحب آپ کتنی انگریزی جانتا ہے۔'' حکیم صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

''ول صاحب آپ جتنی اردو جانتا ہے۔''

حکیم صاحب کا یہ جواب سن کر گورنر صاحب بہت خوش ہوئے اور حکیم صاحب سے ہاتھ ملا کر دیر تک ہنستے رہے۔

علامہ حکیم احمد حسین عثمانی

1933-1895

بانی طبی درسگاہ

دنیا میں ایسے لوگ گنتی کے ہیں جنھوں نے اپنی راہ خود بنائی ہو۔جس طرح دنیا میں 3 طرح کی اولادیں پائی جاتی ہیں۔سپوت، پوت اور کپوت۔

سپوت وہ جو اپنے والدین سے زیادہ نام کمائے۔

پوت وہ جو اپنے والدین جیسا ہی ہو۔

کپوت وہ جو اپنے والدین سے کمتر حیثیت کا ہے۔

خاندان:

آپ کے اجداد کسی وقت میں ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے اور بعد میں الہ آباد کے قریب سید سراواں جو طبقۂ سادات اور شرفا کی بستی ہے وہاں قیام کیا۔

آپ نسباً عثمانی خاندان میں شمار کیے جاتے ہیں۔آپ کے والد بزرگوار مولوی بدرالدین سید سراواں کے جانے و مانے رئیس تھے لیکن گردش زمانہ اور حالات وقت کا شکار ہو کر بسلسلۂ ملازمت الہ آباد آکر مقیم ہو گئے تھے۔

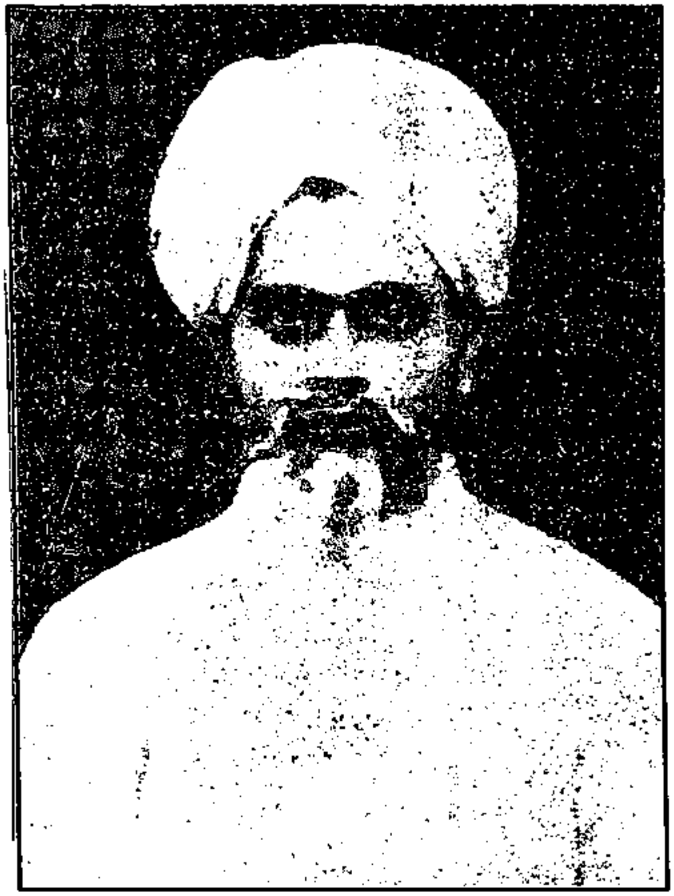

بانیِ کالج الہ آباد۔علامہ حکیم احمد حسین عثمانی صاحب مرحوم

پیدائش:

آپ کی پیدائش الہٰ آباد کے مشہور مردم خیز قصبہ جو پچھلے ادوار میں علم وادب کے میدان میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ ایک معزز گھرانے میں 1825 کو ہوئی تھی۔

تعلیم وتربیت:

حسب دستور زمانہ آپ کی تعلیم وتربیت کا آغاز اپنے والد کے سایہ عاطفت میں ہوا۔ گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد قصبۂ مذکور میں اردو وفارسی کی تعلیم کی ابتدا کی۔ بعد فراغت تعلیم قصبہ والد ماجد کے نقل مکانی کے ساتھ ساتھ خود بھی ان کے ہمراہ الہ آباد منتقل ہو گئے اور مدرسہ اسلامیہ عربیہ (جو ان کے زمانہ میں تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا) میں داخل نصاب تعلیم ہو گئے۔ بعد فراغت تعلیم مدرسہ آپ نے اپنے وقت کے ماہر تعلیم اور جید بزرگ مشہور عالم وفاضل خان بہادر حاجی حافظ مولوی حکیم صوفی محمد حسین کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے ادب تہہ کیا اور ایک عرصہ تک اصول فقہ، حدیث، بیان، منطق، ریاضی وغیرہ درسی کتب دیکھتے رہے۔ مولانا کی مصروفیت بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ کی تعلیم میں حرج واقع ہوتا تھا اس لیے آپ اپنے والد قبلہ کو اطلاع دیے بغیر بے سروسامانی کی حالت میں کان پور جا پہنچے اور مولوی حاجی حافظ احمد حسین صاحب صدر مدرس دارالعلوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چونکہ آپ کی طبیعت ذہین واقع ہوئی تھی اور تکمیل فنون کا شوق تھا۔ اس لیے آپ کی خاص توجہ سے حکیم صاحب مستفید ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں تکمیل فنون کر کے بغرض حصول تعلیم طب لکھنؤ چلے گئے اور راس الاطبا سرخیل اطبا وحاذق طبیب حکیم حیدر حسین طبیب دارالشفا شاہی سے 3 سال تک طبی کتابیں پڑھیں اور مطب سیکھا اور نسخہ نویسی کی خوب مشق کی۔ 17-16 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر کلکتہ چلے گئے وہاں مطب کیا اور کامیاب بھی ہوئے لیکن والد ماجد کی علالت کی بنا پر جب الہٰ آباد آئے تو واپس جانے کو دل نہ چاہا اور الہٰ آباد میں ہی مطب شروع کر دیا۔ چونکہ یہ اپنے والدین کے دوسرے اور آخری صاحبزادے تھے اس لیے گھر کے ساتھ دیگر ذمہ داریاں بھی کاندھوں پر آن پڑیں تھیں۔ چونکہ صاحب ذوق تھے اور علم وفہم کے ماہر، ذکاوت اور سلیم الطبع بھی تھے۔ طبع نکتہ رس تھی۔ لہٰذا بہت تھوڑے ہی عرصہ میں چل نکلا اور گرد ونواح کے امیر وغریب آپ کے علاج اور حسن تدبیر سے

فیضیاب ہونے لگے اور چہار سو آپ کی حذاقت، بلاغت اور ماہر طبیب ہونے کا شہرہ ہوگیا۔

ہندوستان میں جب طاعون کا زور ہوا تو جہاں دوسرے شہر و قصبے محفوظ نہ رہے وہاں الہ آباد بھی لپیٹ میں آ گیا اور الہ آباد کے بہت سے ڈاکٹر اور حکیم شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تو آپ نے وہاں مقیم رہ کر مرضا کی بہت خدمت کی۔ جس سے آپ وہاں عوام کیا خواص سب میں مقبول ہو گئے اور مطب بہت کامیاب ہوا۔

نہایت ذہن اور باصلاحیت اوصاف کی بدولت دست شفا بام عروج پر پہنچ کر شہرہ آفاق بنی۔ آپ کو تحقیق اور تدوین فن طب سے کافی لگاؤ اور خصوصی دلچسپی کے باعث علاج و معالجہ میں آپ کی معجزہ نمایاں اکثر و بیشتر لوگوں کے زبان زد تھیں اور سینکڑوں اطبا کرام کو بھی شرف تلمذ حاصل تھا۔ فجر کے بعد سے ظہر تک آپ کا مطب نہایت ہی کامیابی سے جاری اور مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ آپ کے زمانہ طبابت میں مریضوں کی قسمت کا فیصلہ عموماً کم فہم عطاروں کے ہاتھ میں تھا اور غربا کے علاج کا کوئی طریقہ نہ تھا چنانچہ اس نظریے کے تحت علامہ موصوف نے یونانی دواخانہ الہ آباد کی داغ بیل 1912 میں ڈالی۔ اس دواخانہ نے آپ کی حیات میں ہی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ موصوف نے یونانی دواخانہ پریس الہ آباد بھی قائم کیا تھا جس کے قیام کا مقصد صرف تدوین طب اور ترجمہ ابن خلدون جنگ ہائے صلیبی وغیرہ کی اشاعت تھی۔ اس پریس کا کارنامہ ہے کہ علم القابلہ میں قبالا کی چارٹ ابتدائے زمانہ حمل سے انتہا تک شائع کر کے طبی اداروں کو سپلائی کیا جس کا ایک نسخہ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد میں آج بھی موجود ہے۔

حکیم مولوی احمد حسین نے 1904 میں طب یونانی کی ترویج و ترقی کے لیے اپنے آبائی مکان واقع محلہ سبزی منڈی الہ آباد میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا جو مختلف مدارج سے گزر کر اس وقت یونانی میڈیکل کالج کی حیثیت سے اپنی زمین اور اپنی بلڈنگ محلہ ہمت گنج الہ آباد میں موجود ہے۔ یہ ادارہ بلا شرکت غیرے موصوف نے اپنی ذاتی جیب سے قائم کیا تھا موصوف نے فن طب کی تدریس کے لیے ہندوستان کے مشاہیر اطبا پر مشتمل ایک جماعت جمعیۃ الاطبا کی تشکیل بھی کی تھی۔ جس کے زیر نگرانی مدرسہ طبیہ بعدہٗ یونانی میڈیکل اسکول کے امتحانات اور نصاب جاری اور قائم کیا

تھا۔عربی دان کے لیے تعلیم خالص عربی زبان میں ہوتی تھی اور چار سال کی فراغت کے بعد ان فارغین کو ماہر الطب والجراحت اور اردو زبان میں طب کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو چار سال کی مدت کے بعد معتمد الطب والجراحت اسناد عطا کی جاتی تھی۔

یونانی دواخانہ الہ آباد میں موصوف کے زمانۂ حیات سے ہی ایک طرف امرا اور مستطیع حضرات کو اصول طبیہ کے متعلق اصلی دوائیں قیمتاً دی جاتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ ان کے بے مثال علاج و معالجہ کے کارنامے اور ایثار سے لوگوں کا خیال تھا کہ باری تعالیٰ نے بنی نوع انسانی کے فائدہ اور فن طب کی ترقی کے لیے خاص طور پر موصوف کو معمور کیا تھا۔غربا کی طبی امداد اور فن طب کی ترقی کو علامہ مرحوم نے مقصد حیات بنا رکھا تھا۔ان کی دیرینہ اور 35 سالہ مسلسل فنی خدمات کے عوض میونسپل کارپوریشن نے اس سڑک کا نام جس پر یونانی دواخانہ ہے حکیم احمد حسین روڈ رکھ دیا ہے۔

1931 کو موصوف نے خود زمین خرید کر طبیہ کالج کو اس کی زمین میں منتقل کر دیا اور ایک سال بعد اس زمین پر تعمیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اس کالج کے فارغین کی بہت بڑی تعداد تقریباً ہر صوبے میں پھیلی ہوئی ہے اور کامیابی کے ساتھ مطب کر رہے ہیں۔اس کالج میں طب قدیم کے ساتھ ساتھ انکشافات جدیدہ سے بھی بقدر ضرورت واقفیت کرائی جاتی ہے۔

وفات:

ابھی طبیہ کالج میں تعمیر کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ 30 جنوری 1933 کو موصوف نے ملک عدم کی راہ لی۔کالج کے احاطے میں ہی بصد احترام و اعزاز دفن کیا گیا۔

حکیم حسین احمد عثمانی کو فن طب سے اس قدر لگاؤ اور رجحان تھا کہ اپنے بعد اپنے دونوں بیٹے اس فن کی جانب لگائے اور دونوں فرزندوں کو طب کی تعلیم سے مالا مال کیا۔

آپ کی وصیت کے مطابق 1961 تک طبیہ کالج میں تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ غیر مستطیع طلبا کے لیے وظائف بھی مقرر تھے۔ان کے زمانۂ حیات میں یونانی میڈیکل اسکول میں بڑے بڑے عالم اور جید حضرات جیسے شمس العلما امجد علی فیلو آف الہ آباد یونیورسٹی۔ڈاکٹر محمد عظیم فیلو آف پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر کل ہند کانگریس، ڈاکٹر عنایت اللہ بٹ

آئی۔سی۔ایس۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں، جسٹس گوکرن ناتھ مصرا، ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا، ڈاکٹر سرمحمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے معائنہ فرمایا اور موصوف کی خدمات کو سراہا۔

پسماندگان:

آپ نے اپنے بعد اپنے لگائے ہوئے درخت کی آبیاری کے لیے دو بیٹے شفاء الملک حکیم احمد عثانی اور حکیم محمد صفوان عثانی کو چھوڑا۔

ادبی خدمات:

اگر آپ نے ایک جانب طبی خدمات علاج و معالجہ وطبی درسگاہ کی حیثیت سے کی ہے تو دوسری جانب تاریخ میں ترجمہ ابن خلدون جو 14 جلدوں پر مشتمل ہے یہ نہ صرف ایک دستاویز ہے بلکہ تاریخی حیثیت سے ایک شاہکار ہے۔ جس میں

جلد اول- جواز قبل ولادت نبوی تا شہادت حضرت علی کے بیان میں ہے۔

جلد دوم- جو حالات ملوک فارس و یونان وغیرہ کے بیان میں ہے۔

جلد سوم- عرب قبل اسلام۔ رسول اللہ کی ولادت تا عہد خلافت کے بیان میں ہے۔

جلد چہارم- فتوحات فاروق اعظم کے بیان میں ہے۔

جلد پنجم- خلفائے بنی امیہ۔ امیر معاویہ مزید تا واقعات کربلا کے بیان میں ہے۔

جلد ششم-

جلد ہفتم

جلد ہشتم- خلافت عباسیہ کے زمانہ انحطاط کے تاجدار کے بیان میں ہے۔

جلد نہم- خلافت عباسیہ کے آخری دور کے گیارہ تاجدار کے بیان میں ہے۔

جلد دہم- حاکم با امر اللہ کی خلافت سے بنو امیہ کے بیان میں ہے۔

جلد یازدہم- اندلس کا آخری دور کے بیان میں۔

جلد دوازدہم- علاوہ دیگر حکمرانان اسلام جاپان، ہند، نیپال، گوالیئر وغیرہ کے بیان میں۔

جلد سیزدہم- سلاطین غوریہ کے انساب و حالات فتوحات دہلی، بنارس، میرٹھ، کالپی، بدایوں، مقابلہ بھیم دیو جے چند۔

جلد چہار دہم۔سلاطین سلجوقیہ، چنگیز خان کا خروج تا تاریوں کا طوفان، ممالک اسلامیہ کی بربادی۔

ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

صلاح الدین۔سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کی سوانح عمری۔

حیات نورالدین محمود زندگی، فاتح شام و جزیرۂ مصر کی سوانح عمری۔

ان کی طبی حذاقت۔علمی لیاقت فن طب کے لیے ایثار قربانی سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خدمت طب کے لیے سب کچھ خدارا دے دیا
حصول طب کی خاطر اپنا ادارہ دے دیا
بحر طب میں آپ نے گویا کنارا دے دیا
ڈوبتی کشتی کو ساحل کا سہارا دے دیا

آپ کی رائے تھی کہ:

(1) حصاۃ الکلیہ کے متعلق مخرجات اور مفتتات عام طور پر درسی کتب میں مندرج ہیں۔یا قرابادینوں میں لکھے ہیں۔مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ منع تحجر اور تولد مصاۃ کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔آپ کی رائے میں مادۂ محجرہ جگر سے پیدا ہوتا ہے۔اس کا انسداد یہیں سے ہونا چاہیے۔پہلے منضج استعمال کرائیں۔بعدۂ مسہل دے کر مقویات جگر و گردہ و مثانہ استعمال کرائیں۔اس طرح کے علاج سے انشاء اللہ تعالیٰ تولد خصاہ ورمل رک جائے گا۔

(2) ماء اللحم نیز عرفیات میں ثعلب مصری، شقاقل مصری طباشیر کبود کا استعمال قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔آپ کا خیال ہے کہ عرفیات میں ان دوؤں کا استعمال فضول ہے اس لیے کہ جب ادویہ پر غور کیا جاتا ہے تو تین طرح کی دوائیں پائی جاتی ہیں۔ایک وہ کہ جن کے افعال اجزائے ارضیہ کے ساتھ ہیں یعنی وہ اجزائے ارضیہ اجزائے لطیفہ، ہوائیہ، ناریہ سے اس طرح مثبت ہیں کہ ان کا اڑانا اور جدا کرنا ممکن نہیں۔منتفع ہونے کے لیے استادوں نے معاجین وغیرہ کی ایجاد کی ہیں نہ کہ عرفیات۔

(2) دوسری وہ دوائیں ہیں جن کے اجزائے لطیفہ اجزائے ارضیہ سے اس طرح اڑائے اور جدا کیے جاسکتے ہیں کہ ان کے اجزائے ارضیہ محض ثفل کی صورت میں رہ جائیں جو مایہ مقصد نہیں۔ ایسی دواؤں کا عرقیات میں استعمال کرنا ادنیٰ و نسب ہے۔

(3) تیسری وہ دوائیں جن کے اجزائے ارضیہ و لطیفہ دونوں نفع میں تقریباً برابر ہیں۔ ایسی دوائیں ہر طرح سے کام میں لائی جاسکتی ہیں؟ پس جن ادویہ کے محض جرم میں تاثیر موجود ہے اور جن کے اجزائے لطیفہ ان کے اجرام سے منفک نہیں ہو سکتے۔ ان کا عرقیات میں استعمال کرنا بے معنی ہے۔

طبی معرکے:

ایک بار کا ذکر ہے کہ فیض آباد کے ایک سول سرجن کی اکلوتی لڑکی تھی جو عرصے سے قولنج گردہ بوجہ حصاۃ الکلیہ میں مبتلا تھی۔ آپریشن سے بہت گھبراتی تھی۔ ایک زمانہ تک مختلف معالجین کا علاج ہوتا رہا مگر آرام نہ ملا۔ درد کا دورہ برابر پڑتا آخر کار اس قدر کمزور اور نحیف للجم ہوگئی کہ گھر والے ناامید ہوگئے۔ درد کا دورہ ختم ہوا اور نہ پتھری نکلی۔ اس سلسلہ میں موصوف کو الہ آباد میں رجوع کیا گیا۔ حکیم صاحب نے حوالیۂ گردہ کا سب سے پہلے علاج شروع کیا۔ شروع میں تین دنوں تک عرق بادیان دن بھر پلاتے رہے۔ پھر اس کے بعد جوارش شہریاران ایک تولہ کی مقدار میں رات کو سوتے وقت دی گئی۔ تین دن کے بعد اپنا سنگ گردہ کا مجرب نسخہ شروع کیا۔ نسخہ تخم ترب حجر الیہود سنگ سرماہی۔ ہر ایک ایک ماشہ خوب باریک پسی شربت کثوث ایک تولہ میں ملا کر چٹائیں۔ اس کے اوپر حب کا کنج 6 ماشہ تخم حنا رین 3 ماشہ۔ پندرہ تولہ پانی میں جوش دے کر چھان کر گل قند آفتابی 2½ تولہ ملا کر برابر پلاتے رہیں۔ 15 روز کے بعد درد کا شدید دورہ ہوا۔ یہاں تک کہ مریضہ بیہوش ہوگئی۔ حکیم صاحب طلب کیے گئے۔ موصوف نے کوکنار مسلم 5 عدد عرق گلاب خالص ایک پاؤ میں جوش دے کر فلالین کے کپڑے کو تر کر کے نچوڑنے کے بعد ٹکور کرانا شروع کیا مریضہ کو بستر پر پیشاب ہوگیا جس میں بڑی مقدار میں ریزے تھے۔ مریضہ کی آنکھ کھل گئی یہ علاج اس وقت جاری رہا جب تک کہ پتھری بالکل نہیں گئی۔ لوگوں کو اور خصوصاً سول سرجن صاحب کو اس علاج سے بڑی حیرت ہوئی۔ علاج تقریباً چھ ماہ چلتا رہا۔ مریضہ دن بدن صحت یاب ہوتی گئی۔

اسی طرح ایک بار صوبہ یو پی میں مرض طاعون بہت شدت سے پھیلا۔ ہزاروں انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ الہ آباد بھی اس مرض کی لپیٹ میں آ گیا۔ حکیم صاحب نے ایسے ہی موقع پر الہ آباد ہی میں رہ کر جبکہ شہر کے بہت سے ڈاکٹر حکیم اس خوف ناک مرض کے خوف سے الہ آباد چھوڑ چکے تھے مریضوں کا علاج شروع کیا۔

ایسے ہی حالات میں ایک جوان العمر مریضہ جو طاعون میں مبتلا تھی اس کے لیے موصوف نے جدوار خطائی 9 ماشہ درونج عقربی ایک تولہ۔ مرزنجوش 3 تولہ کافور 6 ماشہ زرشک 9 ماشہ کوکوٹ کر پیس کر چنے کے برابر گولیاں تیار کرائیں اور مریضہ کو شروع میں 3 عدد دن میں 3 بار پھر چار دن کے بعد 3 کے بجائے 2-2 گولیاں دن میں 3 بار استعمال کرائیں۔ مریضہ کو شفا ہوئی اور صحت یاب ہو کر بقیہ زندگی اچھی گزاری۔

شہنشاہ تصنیفات۔ نازش طب

علامہ حکیم کبیر الدین

1976-1894

تاریخ ہمیں ہمیشہ وہ یادگار ہستیاں باقی رہی ہیں جو اپنی مساعی جمیلہ سے ایسے کام کر گزری ہیں جو نمایاں رہے ہوں۔ ان قابل ذکر ہستیوں میں حکیم علامہ کبیر الدین کا نام بھی داخل ہے۔ طبی دنیا میں ان کا نام نامی و اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

اجداد:

آپ کے جد امجد شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور کاٹھیاواڑ سے صوبۂ بہار منتقل ہو گئے تھے۔ بعہد شہنشاہ اکبر ان کے اجداد کو ایک بڑی جاگیر صلہ خدمت کے عوض ملی تھی۔ ان کے والد جمال الدین ایک جانے مانے ہوئے بزرگ و عالم دین تھے۔

پیدائش:

علامہ حکیم کبیر الدین کی پیدائش صوبہ بہار کے مردم خیز ضلع مونگیر کے قصبہ شیخ پورہ محلہ یحیٰ پور میں 1894 کو ہوئی تھی۔

تعلیم:

تعلیم کی ابتدا قاعدہ بغدادی سے وطن کے ہی مکتب میں ہوئی۔ 1905 میں گیارہ برس کی عمر میں اپنے منجھلے بھائی حکیم محمد ظہور الدین کے ساتھ کانپور میں پہنچے جہاں حضرت مولانا عبیداللہ کانپوری جیسی بے نظیر ہستی کا بچپن ہی میں سایہ نصیب ہوگیا۔ مولانا گو مدرسہ دارالعلوم کانپور کے صدر مدرس تھے۔ مگر از راہ شفقت بزرگان گھر پر نام حق، پند نامہ، عطار، گلستاں جیسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے جس میں ایک 11 سالہ بچہ کے ساتھ منتہی طلبا کا بھی شریک درس ہونا باعث فخر تصور کرتے۔

عربی تعلیم:

اس کے ساتھ ہی جلد ہی میزان منشعب، پنج گنج جیسی کتب بھی شروع ہوگئیں اور صرف ونحو کی مشق اور ابتدائی منطق کی تعلیم کانپور ہی میں مولانا کے زیر سایہ ہونے لگی۔ 1907 میں دونوں بھائی لکھنؤ پہنچے جہاں منجھلا بھائی تکمیل الاطب طبیہ کالج میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہو گئے اور برادر خورد یعنی کبیر الدین کو شمس العلما مولانا عبدالمجید فرنگی محلی کی شاگردی نصیب ہوئی جو عربی کی اوپر کی درسی کتب کے نہ صرف قابل ترین استاد تھے بلکہ کنگ کالج (قیصر باغ) میں شعبۂ علوم ومشرقیات کے اساتذہ میں شامل تھے۔ محنتی وذہین شاگرد نے اپنے لائق استاد کی توجہ سے درسی کتب پر بہت جلد عبور حاصل کرلیا۔

طبی تعلیم:

1909 میں جبکہ آپ کی عمر تقریباً 16 برس تھی آپ علم طب کی تحصیل کے لیے مدرسہ طبیہ (عربی) دہلی پہنچے جو اس زمانے میں گلی قاسم جان میں واقع تھا اور دہلی میں مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت اس طبی مدرسہ میں جو اساتذہ تعلیم دے رہے تھے وہ سب کے سب اپنے فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ مولانا حکیم عبدالرشید صاحب رامپور ''کلیات'' مولانا حکیم عبدالرحمن صاحب پنجابی ''معالجات'' مولانا حکیم عبدالرزاق صاحب پیرجی تشریح اور ڈاکٹر امیر چند صاحب جدید مضامین کا درس دیا کرتے تھے۔ ان مستقل اساتذہ کے علاوہ حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خان عرف بھورے میاں صاحب بھی وقتاً فوقتاً

بعض مضامین پڑھایا کرتے تھے۔

استاذ کبیر استاذ الاساتذہ حاذق الملک مسیح الملک شفاء الملک حکیم محمد اجمل خاں بھی اساتذہ میں شامل تھے مگر شعبہ عمل کی حد تک کہ مدرسہ کے طلبا نظری تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کے مطب میں بیٹھ کر اصول علاج سیکھتے تھے۔ استاذ کبیر اس زمانہ میں کتابی درس نہیں دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی دیگر اساتذہ کی طرح مدرسہ میں آکر درس دیتے تھے۔

چند ہی روز میں اس بچہ یا سولہ سال کے نوجوان نے ہم جماعت طلبا اور اساتذہ کے قلوب میں اپنا مقام حاصل کر لیا۔ طلبا عزت کرنے لگے اور اساتذہ محبت۔ پیر جی عبد الرزاق صاحب از راہ شفقت اکثر اوقات کبیر الفلاسفہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

امتحان کے نتائج ایسے شاندار رہے کہ مشکل سے اس کی نظیر مل سکے۔ ہر سال دونوں مضامین (یونانی و ڈاکٹری) میں برابر اول رہے اور کبھی ہمراہی کو پیش روی کا موقع نہیں دیا۔ اس طرح مدرسہ طبیہ دہلی سے اول درجہ کے دونوں تمغے حاصل کیے۔

تمغہ شیو پرشاد بہادر (اول۔ یونانی)

تمغہ شمس الاطبا (اول ڈاکٹری)

رفعت اوج کی تمنا اس نوجوان کو لاہور لے گئی۔ ''دور کے ڈھول سہانے''

زبدۃ الحکما آخری امتحان کا لقب کتنا شاندار ہے۔ سادہ نام کے ساتھ جب اتنا بڑا لفظ لکھا جائے گا تو کتنا بھلا معلوم ہوگا۔ اسی قسم کے جذبات نوجوانی نے ان کو اس امتحان کی شرکت کے لیے آمادہ کیا۔

اس وقت لاہور کے اس بڑے طبی کالج میں بدعنوانیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ حسن اتفاق کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں امتحانات میں اچھی طرح سختی برتی گئی اور نگران اعلیٰ پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب نے اپنی خداداد جدت نظر اور قوت نظم کے پورے جوہر دکھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زبدۃ الحکما اور عمدۃ الحکما کے امتحانات میں صرف حکیم کبیر الدین کے کوئی بھی حکیم کامیاب نہ ہو سکا۔ درجات میں یہ نہ صرف اکیلے رہے بلکہ اول بھی رہے۔ اس وقت مذکورہ امتحانات کی حیثیت ایسی تھی جیسی کہ آج کل کی طبی تعلیم ایم ڈی ہے۔

اس کامیابی میں سر یوٹی ڈین کا تمغہ حاصل کیا اور جب یہ خبر دہلی پہنچی تو حکیم اجمل خان اعظم اتنے محظوظ ہوئے کہ مدرسہ طبیہ دہلی کی سند اور تمغہ پر نام کے ساتھ ''زبدۃ الحکما'' لکھوانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حسن اتفاق سے اسسال حکیم حاذق اجمل خاں امتحان ''زبدۃ الحکما'' کے ممتحن بھی تھے۔

دیگر علوم:

زمانہ قیام 1907 لکھنؤ میں کبیر الدین نے فن خطاطی کی تعلیم اپنے زمانہ کے نامور اور فن کے ماہر شمس الدین اعجاز رقم سے حاصل کی اور کیننگ کالج میں تعلیم بھی۔

لاہور میں 1914 میں مندرجہ بالا امتحانات پاس کر لیے تھے اور یہ زمانہ حکیم کبیر الدین کی دور تعلیمی کے ختم ہونے کا ہے وہاں یہ کچھ عرصہ شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ یہاں پر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ترجمہ و تالیف کا مشغلہ مل گیا۔ جو طبعاً مرغوب بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ جو تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا کہ آپ نے لاہور ہی میں مطب اور طبی درس کا اعلان کر دیا یعنی استادی کا درجہ لاہور ہی میں استاد محترم حکیم غلام جیلانی کی رفاقت میں مل گیا تھا۔

ترجمہ کی ابتدا 1916:

لیکن قدرت کو چونکہ کچھ اور منظور تھا اور خدمت فن کا بڑا کام ان سے لینا چاہتی تھی۔ سلسلہ مطب کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ آپ کو شرح اسباب کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا۔ چار جلدوں میں سے دو جلدوں کا برق رفتاری سے ترجمہ کر کے اور چھپوا کر استاذ کبیر و محسن طب حکیم اجمل خان کی خدمت میں پیش کیا۔ جو حکیم اجمل خاں کے نام سے منسوب تھا۔ اس طرح طبع اول جو 1916 کا ہے حکیم صاحب سے منسوب ہے۔

اسی زمانہ میں مدرسہ طبیہ کو کالج کے معیار پر لانے کی کوششیں تیزی سے ہو رہی تھیں اور اجمل اعظم کے دماغ میں کالج کی ترقی کے منصوبہ جوش و خروش پر تھے۔ جب رامپور سے واپس آ کر جہاں ہدیہ سعید و حقیر پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دہلی میں دوبارہ حکیم کبیر الدین کو حکیم اجمل خاں کے نیاز حاصل ہوئے تو استاذ کبیر حکیم اجمل اعظم کا ارشاد ہوا۔

''جدید تنظیم کے تحت تصنیف و تالیفات کا ایک شعبہ کھولا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم

مولف اول کی جگہ کام کرو۔"

کیونکہ سعادت مند اور لائق وفائق شاگرد کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو استاد محترم کی دوربین ودوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔

یہ ارشاد نہ صرف واجب التعمیل اور واجب الاحترام بھی تھا بلکہ ایک شاندار اعزاز اور کھلا اعلان کہ اجمل اعظم کی جوہر شناس نگاہ میں جوہر کبیر کی کیا قدر و قیمت ہے۔

شعبہ تصنیف وتالیفات حسب منشا کھلا۔ کھلنے والے کالج کے لیے اگر ایک طرف قرول باغ میں اینٹ اور پتھر سے عمارتیں بن رہی تھیں تو دوسری جانب علمی بنیادیں بھری جارہی تھیں۔ یعنی عربی زبان میں نصاب کی کتب تحریر کی اور کرائی جارہی تھیں۔

علامہ حکیم کبیر الدین کے ذمہ سب سے پہلا تحریری وتصنیفی کام جو دیا گیا تھا وہ کام ایک کتاب فن تمریض یعنی تیمارداری تفویض ہوا تھا جو حکیم کبیر الدین نے اپنی سخت جاں فشانی محنت سے دس ماہ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد حکم ملا کہ نصاب تشریح کے لیے ایک جامع کتاب عربی ہی میں معلوم تالیف کی جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں تشریح کا بہت بڑا حصہ لکھا گیا۔

تشریح کا یہ مسودہ تو زیور طباعت سے سج نہ سکا۔ وقت کے تقاضوں کے تحت نصاب تعلیم اور حکیم اجمل خاں کے خیالات اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سرکاری زبان اردو ہونے کی بنا پر اردو کی جانب راغب ہوگئی لہٰذا یہ عربی کا مسودہ آگے چل کر اردو قالب میں ڈھل کر تشریح کبیر کا بنیادی مواد بن گیا۔

خدمت تعلیم:

شیخ الشیوخ پیر جی عبدالرزاق صاحب کے انتقال پر ملال پر اجمل اعظم خان مناسب استاد کی تقرری کے لیے از حد فکر مند تھے آخر اس مشکل مرحلے کے لیے قرعۂ فال علامہ حکیم کبیر الدین صاحب کا انتخاب صحیح تھا۔

پیر جی شیخ عبدالرزاق سے پہلے تشریح کا مضمون ڈاکٹروں کے ذمہ پڑھانے کی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلے طبیب تھے جنھوں نے نہ صرف خود اس کالج میں علم تشریح پڑھائی بلکہ ایسے شاگردان

رشید کی ایسی پوری ٹیم تیار کردی جو آج بھی مختلف کالجوں میں نہ صرف علم تشریح پڑھاتے بلکہ تشریح کی کتابیں بھی تحریر کر رہے ہیں۔

اس زمانے میں تشریح کی دوہری کتب پڑھائی جاتی تھیں۔

تشریح قدیم (عربی زبان میں)

تشریح جدید (اردو زبان میں)

اس پڑھائی سے طلبا کے دماغ میں کیسی کیسی الجھنیں، وسوسے اور خیالات پیدا ہوتے ہوں گے۔ اس تلخی اور بدمزگی کا اندازہ صرف پڑھنے اور پڑھانے والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ حکیم کبیرالدین نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے تشریح کبیر جیسی کتاب کی تصنیف کی۔ تشریح کبیر کے چھپنے کے بعد جدید و قدیم تشریح الگ الگ پڑھانے کی ضرورت نہیں رہی اور جدید و قدیم تشریح کا فرق مٹ گیا کیونکہ اس کے قبل ایسی کوئی کتب بازار میں نہ تھی۔

تشریح جیسے مضمون کا تمام تر اپنی اصطلاحات میں پیش کرنا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس زمانے میں آسانی سے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس کام نے ترجمہ کے فن کو نیا قالب دے دیا اور طبی دنیا کو یہ احساس پیدا کرادیا کہ ڈاکٹری کتب کے تراجم اپنی اصطلاحات کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف شرط محنت اور ہمت کی ہے۔

ان کی علم تشریح پڑھانے کی کامیابی سے متاثر ہو کر ذمہ داران طبیہ کالج نے کچھ عرصہ کے بعد علامہ کو علم فزیالوجی (منافع الاعضا) کی تعلیم طلبا طبیہ کالج کو پڑھانے کی سپرد کر دی۔ درس و تدریس میں علامہ نے وہ جوہر دکھائے کہ تمام طلبا آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ علم تشریح میں کامیاب تصنیف و تالیف کے بعد اسی عہد و پابندی کے ساتھ انوکھے اور نئے مضمون منافع الاعضا پر قلم اٹھایا اور شاہکار تصنیف منافع کبیر کے نام سے ترتیب دی۔

اب وہ مبارک ساعت آ گئی جو طبی دنیا کے لیے بشارت کبریٰ کا درجہ رکھتی تھی یعنی مدرسہ طبیہ کرایہ کے بوسیدہ مکان سے نکل کر قرول باغ کی عالیشان عمارت میں منتقل ہو گیا اور حکیم اجمل خاں جو قومی یکجہتی کی علامت تھے ان کی وسعت قلبی سے ایسے کالج کی بنیاد پڑی جہاں آیورویدک اور یونانی طب کی تعلیم کے لیے مخلوط درسگاہ آیورویدک "یونانی طبی کالج" کے نام سے کھولا گیا جس کی

اگر بنیاد لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھوں رکھی گئی تو افتتاح باپو مہاتما گاندھی کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔

دہلی کا مشہور طبی رسالہ "مجلہ طبیہ" جس میں مدرسہ طبیہ کی ترقی نیز معلومات طب کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ پیرجی عبدالرزاق کے انتقال کے بعد بند ہو گیا تھا۔ لہٰذا پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالہ جاری کیا جائے جن میں نہ صرف طبی خبریں ہوں بلکہ طبی کالج کا ترجمان بھی ہو۔

1921 میں "المسیح" کے نام سے ایک طبی جریدہ نکالنا شروع کیا جو آٹھ سال تک شائع ہو جانے کے بعد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ ان کے ادارے المسیح سے بعد میں بہت سی نصابی کتب بھی شائع ہوئیں جس نے ہماری نصابی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کر دیا۔ طبیہ کالج کے سند یافتہ اسی تعلق کی بنا پر حکیم کبیر الدین کے نام سے بخوبی واقف اور کتب کی فراہمی کے لیے ان کی خدمات کے معترف بھی ہیں۔

طبیہ کالج کی شکل میں مدرسہ طبیہ کے منتقل ہونے اور قرول باغ کی نئی عمارت میں آجانے کے بعد عملی قوتوں میں ظاہر ہے کہ ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ تشریح و منافع کی کتب تیار ہو چکی تھیں کہ اسی طرز پر جراحت کی کتاب بھی لکھی جائے جس کے ذمہ داران ارکان ادارہ نے حکیم کبیر الدین ہی کا انتخاب کیا۔ جراحت کی کتاب کی تدوین و تالیف میں حکیم کبیر الدین اپنے مخلص دوست ڈاکٹر محمد عثمان خاں (ایم او ریاست بڑوالی جو بعد میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں داخل ہو گئے تھے) کو بھی اپنے اس کام میں شریک کر لیا تھا۔ گو اس کتاب کا بڑا حصہ جدید علم جراحت کا ترجمہ ہے مگر اصطلاحات کے طویل و عریض مرحلۂ خارزار کو جس انداز میں پہلی بار کامیابی سے طے کیا تھا وہ صاحب تصنیف و تالیف کے لیے قابل توجہ ہے۔

تشریح منافع اور جراحت کی کتب کیا تیار کیں کہ میدان کھل گیا اور ترجمہ تصنیف و تالیف کے لیے ایک صاف ستھری اور سیدھی شاہراہ بن گئی۔

تشریح منافع اور جراحیات جیسے موضوعات پر اس کے قبل بھی آگرہ اور اردو مرکز لاہور میں کتب تحریر کی گئی تھیں لیکن حکیم کبیر الدین جیسی تیار کردہ آسان و عام فہم کتابیں نہ تو کسی نے تحریر کی تھیں نہ ترجمہ اور نہ ہی مرتب کی تھیں۔

1925 تک طبیہ کالج کے لیے نصاب تعلیم تیار ہو چکا تھا۔ جس میں قدیم و جدید دونوں

طرح کے مضامین شامل ہیں۔

اس عظیم کام سے فراغت پا کر اس سے بھی زیادہ اہم کام اصلاح نصاب کی جانب توجہ دی گئی جس کی جانب المسیح روز اول ہی سے زور دے رہا تھا۔ چنانچہ 1926 میں اس علمی مجلس کی تشکیل ہوئی اور دہرہ دون ومنصوری کے درمیان واقع قصبہ راج پور میں طب یونانی کے عظیم رہنما حکیم اجمل خان کی نگرانی میں اس کام کی ابتدا کی گئی۔ جو طب یونانی کی تاریخ کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے اجمل خان نے ایک تحریر اپنے خود ہاتھ سے تحریر کی جو معاہدہ اجمل کے نام سے منسوب ہے۔

اس عہد نامہ کے الفاظ یہ ہیں:

ہم نے آج 2 جولائی 1926 کو جمعہ کے دن ''اصلاح طب'' کا کام جو حقیقت میں یونانی طب کے لیے بمنزلہ اساس کے ہے شروع کیا اور ہم خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نیک کام میں مدد دے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس جلیل القدر خدمت کو اپنی استطاعت کے مطابق برابر انجام دیتے رہے ہیں۔

اجمل

فضل الرحمٰن　　محمد الیاس خاں　　محمد کبیر الدین

عبدالحفیظ　　سید ناصر عباس

اس معاہدہ نامہ پر نہ صرف اپنے دستخط ثبت کیے۔ بلکہ پہلے ثبت کیے۔ اس کے بعد دوسرے اراکین مجلس سے ارشاد ہوا کہ وہ وصیت اجمل پر دستخط کر کے حیات کے آخری لمحات تک اس علمی عہد و پیمان کے پابند ہو جائیں۔

1916 میں حکیم کبیر الدین نے المسیح نام کا جو ادارہ طبی کتب کی فراہمی کے لیے قائم کیا تھا، اس میں حکیم محمد عبد الواحد، حکیم محمد صدیق، حکیم سید محمد یوسف نیر، حکیم حبیب اللہ شامل تھے۔ جنھوں نے المسیح سے کئی کتب شائع کرائیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان کتب میں ایک تاریخی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف ناشر کا نام ہے۔ مصنف مرتب یا مؤلف کا نام نہیں ہے۔

مذکورہ معتزز عہد نامہ جو حکیم اجمل خان سے ہوا تھا اُن قوتوں کو تیز تر کر دیا جو پہلے ہی سے

محرک تھیں۔اب حکیم کبیر الدین کے تراجم وتالیفات میں اصطلاح فن اور تجدید واحیا کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔تھوڑے تھوڑے دنوں میں انھوں نے تصنیفی میدان میں ان گم گشتہ رازوں کو آشکار کرنا شروع کر دیا جو مخفی تھے۔مگر اہل فن کی نظروں سے اوجھل اور دور تھے لیکن اہل نظر اسے سن کر یا پڑھ کر اسے نئے انکشافات کا نام دیتے اور بہ نظر استحسان اس کا استقبال کرتے جیسے اخلاط کا نظریہ۔دوران خون کا مسئلہ قلب کی کواڑیاں یا کان کی ہڈیوں (عظیمات السمع) کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

اس طرز خدمت سے فن میں ایک نئی شان پیدا ہوگئی۔اطبا کی مرعوب ذہنیت کا خاتمہ ہونے لگا۔فن کو ایک نئی شان ملنے لگی اور اس طب پر جو چہار جانب سے جا و بیجا حملہ ہونے لگے تھے ان سے محفوظیت ہونے لگی۔

حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد شریف منزل میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی جس کی بنا پر طبیہ کالج بھی اس زد میں آ گیا اور خاندان شریفی کی ہر چیز تباہ ہونے لگی۔

اس دور تباہی میں حکیم کبیر الدین جیسے قدیم خدمت گزاروں کی خدمت سے طبیہ کالج محروم ہوگیا۔

اس دور تباہی میں حکیم کبیر الدین جیسے قدیم خدمت گزاروں کی خدمت سے طبیہ کالج محروم ہوگیا۔

جن لوگوں نے حکیم اجمل خان سے اصلاح طب کا عہد و پیمان کیا تھا ان کو ہی طبیہ کالج میں داخلہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔

ان حالات میں مجبور ہو کر 1935 میں خدمت خلق اور فلاح و بہبود طب کی خاطر ایک دوسرا ادارہ جامعہ طبیہ قائم کر لیا۔اس جامعہ طبیہ کو گلی قاسم جان (موجودہ ہمدرد طبی کالج) میں حکیم کبیر الدین حکیم محمود الیاس خاں اور حکیم محمد افضل الرحمٰن خاں نے قائم کیا تھا اور حسن اتفاق دیکھیے کہ یہ تینوں حضرات شیوخ جامعہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔جامعہ طبیہ نے اپنے اعلیٰ تعلیمی نظام کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔لیکن اسی دوران حیدر آباد کے ناظم طبابت حکیم نواب مقصود جنگ بہادر نے نظامیہ طبیہ کالج کے لیے جامعہ طبیہ کے اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ جامعہ طبیہ

چھوڑ کر نظامیہ طبیہ کالج میں درس و تدریس دیں۔ اس دعوت شاہی نے بیشتر اساتذہ کو بہتر تنخواہ و مشاہرہ کے عوض حیدر آباد کا سفر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن حکیم الیاس خاں نہ گئے اور انھوں نے بحسن و خوبی ادارہ طبیہ کالج کی دیکھ ریکھ کرنی شروع کر دی۔ شاید قدرت کی یہ مشیت ایزدی تھی کہ اس طور پر جامعہ طبیہ قائم رہے۔ 1939 میں حکیم کبیر الدین کو نظامیہ طبیہ کالج کا وائس پرنسپل بنا کر تعلیمی نظام حکیم صاحب کو سونپ دیا گیا۔

اس کالج میں حکیم کبیر الدین نے اپنے حسن اخلاق سے اور تعلیمی تجربہ کی بنیاد پر چند اصلاحات کیں جیسے معیار داخلہ و نصاب تعلیم میں اس طور پر تبدیلی کی کہ طب قدیم کے ساتھ طب جدید کے ان مضامین کی تعلیم بھی دی جانے لگی جن کا حاصل کرنا دور حاضرہ اور مستقبل میں اطبا یونانی کے لیے ضروری تھا۔ حکیم صاحب ایک انتہائی حساس دل اور صاحب فن طبیب تھے اس لیے حکیم صاحب کی بعض ایسی تحریکات کی جو بعد کے غیر فنی ناظم طبابت کی جانب سے کی گئی تھیں مخالفت کر کے حکیم کبیر الدین کے خلاف محاذ تیار کیا گیا۔ حکیم صاحب نے استعفیٰ دیا جو نواب صاحب نے منظور نہ کیا حکم سلطانی کے طور پر یہ استعفیٰ بعد میں حکیم صاحب نے واپس لے لیا لیکن جڑیں مخالفت کی تیز تر ہو گئی تھیں۔ سازش کا نیچے سے اوپر تک جال بچھا دیا گیا کہ اب کالج کو حکیم صاحب کی خدمت کی ضرورت نہیں رہی۔ آخر حکیم صاحب کو کالج کو خیر باد کہہ کر تصنیف و تالیف کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور وہ اپنی قدیمی شائع شدہ کتب کی از سر نو ترتیب و تدوین میں لگ گئے چنانچہ مباحث اغلاط پر ایک عالمانہ کتب شائع کرنے کے علاوہ شرح اسبا کے ضمیمے پر نظر ثانی کی اور بہت سے فوائد کے اضافہ کے ساتھ قدیم و جدید علاج میں موازنہ ثابت کیا۔

نظام حیدر آباد نے آپ کو شہنشاہ تصنیفات کے خطاب سے نوازا اور کلیات ادویہ کی تصنیف پر توصیفی نوٹ تحریر کیا۔

تحریر و تصنیف کے علمی دور اور پیشے کے سلسلے میں (9) نو تمغے حاصل کیے تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم عبد اللطیف فلسفی کے اصرار اور وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر موصوف کا تقرر طبیہ کالج میں بحیثیت ریڈر کے ہوا اور امور طبیہ کی تعلیم حکیم کبیر الدین کے ذمہ سپرد کی گئی۔ طلبا اور اساتذہ دونوں مستفید ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حیدر آباد کی

طرح یہاں کی فضا بھی راس نہیں آئی۔ بوجہ مجبوری 1960 میں علی گڑھ سے رخصت ہو کر دہلی آ گئے اور 1965 تک مشیر حکمۂ ترجمہ ہمدرد دواخانہ مقرر ہوئے۔ 1966 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی انتظامی کمیٹی کے رکن بنائے گئے اور آخر تک دونوں کے ممبر رہے۔

وفات:

آخر دنوں میں عرق النسا کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کچھ دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر نہ صرف طب کے بلکہ ہندوستان کے پایۂ تخت میں حرکت قلب بند ہو جانے کی بنا پر 9 جنوری 1976 کو سات بجے بعد نماز مغرب بیاسی (82) سال کی عمر میں مالک معبود سے جا ملے اور طب کا یہ منور ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

ان کی آخری آرام گاہ قبرستان چمیلیان نزد دتی عید گاہ ہے۔

پسماندگان:

آپ کی اہلیہ آمنہ خاتون جن کا حکیم صاحب کی حیات میں انتقال ہو گیا تھا۔ 1968 میں 4 صاحبزادے اور 2 صاحب زادیاں تولد ہوئیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1- ڈاکٹر صلاح الدین پی۔ ایچ ڈی۔ کیمسٹری۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر تھے پھر سندھ یونیورسٹی میں تبادلہ کرالیا، پھر ریٹائر ہو گئے۔

2- ڈاکٹر علا الدین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی فارسی، پہلے انھوں نے بی فارما پھر ایم فارما کے لیے انگلینڈ گئے پھر امریکہ چلے گئے اب وہاں ملازم ہیں۔

3- ڈاکٹر محمد جمال الدین۔ ایم۔ ڈی۔ یہ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔

4- جلال الدین، ایم۔ ایس سی۔ انھوں نے علی گڑھ سے ENTOMOLOGY پاس کی تھی۔

صدیقہ خاتون سب میں بڑی تھیں بھائیوں سے بھی۔ ماہ شعبان میں حکیم کبیر الدین صاحب کے انتقال کے کچھ پہلے انتقال ہوا۔

تصنیفات:

حکیم کبیر الدین صاحب نے اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ طب یونانی اور اردو زبان

وترجمہ کے فن کو ایک نئی زندگی، ایک نیا قالب اور سب سے بڑھ کر نئی اساس دی ہے۔ یہ فن اردو زبان ان کے احسان کی رہین منت ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایک نئی سمت دے کر اس فن کو اس قابل بنادیا ہے کہ آج وہ دوسرے فنون کے مقابل علوم کے برابر کھڑی ہے۔

آپ نے 82 سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور قریب قریب بیاسی 82 ہی کتب تحریر کیں۔

معالجات:

اکسیر اعظم، جلد اول، دوم

ترجمہ کبیر۔ شرح اسباب وعلامات، جلد اول، دوم

تشریحی تصاویر

تشریح:

تشریح کبیر	حصہ اول	دوم
تشریح صغیر	〃 〃	〃

منافع الاعضا:

منافع کبیر

کلیات:

مخازن التعلیم۔ علاج الامراض، القرابادین، بیاض کبیر دہلی کا مطب، حصہ اول

دوم، دہلی کے مرکبات۔ سوم، دہلی کو دواسازی، قانونچہ

کلیات قانون، اول۔ دوم

کلیات نفیسی، اول۔ دوم

ادویہ دواسازی:

صدریہ۔ کلیات ادویہ، علم الادویہ، کتاب الادویہ، کتاب التلبیس، مجموعہ کبیر

علم الجراحت

کتاب الجراحت، حصہ اول دوم

علم الامراض:

کتاب التشخیص حصہ اول دوم

رسالہ جات:

رسالہ حمیات ۔ رسالہ حاشیہ و غائبہ۔ رسالہ امراض صبیان، رسالہ جدری (چیچک)

رسالہ مسماع الصدر۔

رسالہ مقیاس الحرارت

رسالہ قبض و بواسیر۔ (حاصور و باسور)

〃 آتشک۔

〃 سوزاک

〃 اوزان الادویہ۔ رسالہ اوزان طبی۔

〃 بحران۔

〃 اخلاط

〃 وبال ونکال یعنی آتشک وسوزک

〃 سم الفار۔ رسالہ کچلہ۔ رسالہ مدار بوٹی۔ رسالہ ازاراقی

〃 قارورہ 〃 نبض

لغات الادویہ:

لغات کبیر۔ طبی فرہنگ، القابلہ، معالجات امراض نسواں۔ الاکسیر تجربات قسطن۔ آسان

نسخہ عمل احتقان

رسالہ جراثیم اور طبیعت۔

〃 دوران خون

〃 طاعون۔ رسالہ ہیضہ۔

〃 سل ودق۔

دیدان امعاء

صدری مجربات۔اصول حمیات

تشریح تصاویر کلاں۔تصاویر احشا۔تشریح اعضائے نسوانی۔کلیات کے مباحث ضروری ارمغان وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ حکیم کبیرالدین مرحوم کا یہ کارنامہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے فن طب کی نصاب کی اُن کتب کی فراہمی کی جو آج تک کوئی دوسرا ان کے حصہ کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جتنے سال ان کی عمر تھی اتنی ہی انھوں نے کتب تحریر کی تھیں۔ان کی تصانیف کو اگر اوپر نیچے رکھا جائے تو اتنی لمبی لائن لگے گی جتنا ان کا قد تھا اور اگر ان کی تصنیف کردہ کتب کا وزن کیا جائے تو ان کے وزن کے برابر ان کی تصانیف کی ایک ایک جلدیں ہیں۔

حکیم محمد اسحاق

1895 — 1975

مجاہد تحریک آزادی اور کانگریسی رہنما

اعظم گڑھ جس کی بنیاد بکرما جیت نامی سورج بنسی خاندان کے نومسلم بیٹے اعظم خان 1665 میں رکھی تھی کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ پہلی تو یہ کہ قومی یکجہتی یا ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسری تحریک آزادی میں سب سے پہلی پنچایت عدالت یہیں قائم ہوئی۔ تیسری شبلی کالج جو ایک اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے اور یوپی کا علی گڑھ کے بعد سب سے بڑا علمی تاریخی گہوارہ ہے۔ چوتھی خصوصیت جو سب سے بڑھ کر ہے دارالمصنفین شبلی اکاڈمی ہے۔ جسے 1914 میں حضرت علامہ شبلی نعمانی نے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا اور اپنی زندگی کا ما حصل خیال کیا تھا۔ شبلی اکاڈمی ایک ایسا فانوس تھا جس کی روشنی میں اس ضلع میں علم، ادب، تہذیب و تمدن سیاست اور معیشت جگمگا اٹھی تھی۔

خاندان:

ان کا خاندان اعظم گڑھ کے علمی و ادبی خانوادے کا ایک مشہور و معروف گھرانہ تھا جو معاشی میدان میں کمزور سہی لیکن اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی طور پر مضبوط اور علمی دولت سے مالا مال تھا۔

حکیم محمد اسحاق کے دادا حافظ محمد منیر جو کچہری میں ایک جانب محرر تھے تو دوسری جانب اپنے پیشے کی بنا پر ہر خاص و عام میں بے پناہ مقبول اور شہر کے وکلا مختاروں، حکاموں سے نہ صرف روابط بلکہ قریبی شناسائی بھی تھی۔

ان کے والد شہر کے اچھے حفاظ میں شمار ہوتے تھے اور اعظم گڑھ شہر کی شاید ہی کوئی ایسی مسجد ہو جس میں انھوں نے قرآن کا ختم نہ کیا ہو اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عید کا چاند نہیں ہوا اور ان کے والد چند مخصوص نمازی احباب کو کو لے کر ایسی مسجد کا رخ کرتے جہاں رمضان شریف میں قرآن نہ ختم ہوا ہو۔ رات بھر میں قرآن ختم کرتے روپے آٹھ آنے کی مٹھائی تقسیم ہوتی اور سحر سے قبل سب لوگ گھر واپس آجاتے۔ غرضیکہ ان کا خاندان اپنے وقتوں کا گہوارہ ادب اور علم کی دولت سے مالا مال تھا۔

ان کے دادا کے انتقال کے بعد ان کے ایک معتقد منشی معین الدین نے جو اشعار کہے تھے وہ ذیل میں درج ہیں۔

حافظ نامور منیر احمد　　کامل عصر و نیک نام طبیب
کرتے تھے جب تلاوت قرآن　　لطف ملتا تھا اک عجیب وغریب
دور سے لوگ سننے آتے تھے　　خوش نوا ایسے تھے امام و خطیب
تھے وہ مسکیں نواز بھی ایسے　　ساتھ کھاتے تھے روز چند غریب
حیف اکیس مارچ کو　　یعنی منگل کی نصف شب کے قریب
سوئے جنت ہوئے روانہ وہ　　با عنایات سمیع و مجیب

بہر حال وفات لکھ دو حنیف
ہائے حافظ منیر پاک طبیب

ان کا انتقال مارچ کی 21، 1933 کو ہوا تھا۔

پیدائش:

اعظم گڑھ کے مشہور محلہ کوٹ میں 1895 ان کی پیدائش ہوئی اور وقفہ دوران تعلیم کے سوا قریب سارا وقت محمد اسحاق اعظم گڑھ میں گزرا۔

تعلیم:

ابتدائی تعلیم حسب دستور دادا نیز والدین کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور مزید تعلیم کے لیے مدرسہ اسلامیہ باغ میر پنشو میں مولوی خدا بخش سے (جو عربی و فارسی کے اچھے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی میں کلام موزوں کہتے تھے) شرح ملا جامی اور منطق کی حاصل کی۔ 1907 میں بعمر 11 سال مشہور استاد القرئی حافظ حسینی سے قرآن پاک کا حفظ کر کے محلہ کی مسجد میں پہلی تراویح پڑھائی۔

طبی تعلیم:

1912 میں ان کے والد نے انھیں طب کی تعلیم کے لیے دہلی مولانا حالی کے ایک عزیز قاری عبدالحلیم انصاری کے ساتھ حکیم اجمل خاں کے ایک شناسا عبدالغفور وکیل کے ایک سفارشی خط کے ہمراہ روانہ کیا۔ چنانچہ ان کا داخلہ مدرسہ طبیہ دہلی میں ہو گیا اور تعلیم طب شروع ہو گئی۔

جہاں داخلہ کے لیے مزید عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔

تاریخی سہو اور عفو:

دوران تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں ایک واقعہ ہو جانے کی بنا پر ان کا نام مدرسہ سے خارج کر دیا گیا۔

جب یہ اعلیٰ درجہ کا امتحان دے چکے تھے اور درجہ سوم والوں کا امتحان ہو رہا تھا کہ ہم جماعتوں کو خیال گزرا کہ نیچے درجات والوں کو امتحان میں مدد دی جائے۔ امتحان کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے پرچہ تقسیم ہو جاتا تھا، پھر بآواز بلند پڑھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ جو طلبا مدد پر آمادہ تھے انھوں نے یہ سوالات سن لیے اور پاس کی مسجد میں بیٹھ کر کتابوں کی مدد سے وہ سوالات حل کرنے لگے۔ محمد اسحاق بھی ان سوالات حل کرنے والے طلبا میں شامل تھے۔ شامت اعمال کہ کسی طرح یہ خبر پیر جی حکیم سید عبدالرزاق (جو معلم تشریح الاعضا تھے) کو مل گئی تھی وہ مسجد میں داخل ہوئے اور تمام موجود و ملوث طلبا کے نام لکھ کر حکیم اجمل خان کے سامنے پیش کر دیے۔ اس واقعہ کی جانچ کے لیے حکیم اجمل خان نے ایک تحقیقاتی کمیشن رسالہ رفیق کے ایڈیٹر اور سابق جج پیرزادہ محمد حسین کی سربراہی میں مقرر کر دیا۔ تحقیقی رپورٹ کی بنیاد پر دیگر طلبا کے ساتھ ان کو کالج سے اخراج کا حکم سنایا

گیا اور مزید امتحان میں شرکت سے محروم کر دیا گیا۔ اس دوران حکیم اجمل خان شملہ چلے گئے۔ طلبا کی جانب سے حکیم صاحب کو متعدد تار دیے گئے کہ ہاسٹل میں رہنے اور امتحان میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ حکیم اجمل خان کی شملہ سے واپسی پر تمام طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے شرف باریابی بخشا۔ اس موقع پر حکیم اجمل خاں کے پاس مدرسہ طبیہ کے مشیر اعلیٰ پیرزادہ محمد حسین بھی تشریف رکھتے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھیے اگر میں ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ حکیم صاحب کے سامنے تمام طلبا نے اپنی غلطی کا اعتراف اور توبہ کی تو حکیم صاحب نے از راہ شفقت معافی اور ضمنی امتحان میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی۔

دوران تعلیم انھوں نے طب کے اُن اساتذہ سے کسب فیض حاصل کیا۔ جو نہ صرف اپنے وقت کے جید طبیب تھے بلکہ ان کو شفاء الملک، مسیح الملک، حکیم اجمل خان کے خاص شاگرد رشید ہونے کا بھی موقع ملا۔ ایک بار حکیم اجمل خاں نے ان سے کہا کہ " آج تم مرضا کی تعداد کا شمار کرو۔ گرمیوں کے دن تھے اور 12 بجے تک مریضوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہو چکی تھی۔ حکیم اجمل خاں کو مریض کی نبض پر دوا ایک ثانیے کے لیے ہاتھ ہوتا اس کے بعد بیٹھے ہوئے طالب علموں کو نسخہ لکھنے کا اشارہ ہوتا اور جو طالب علم سب سے پہلے ان کی خدمت میں نسخہ پیش کر دیتا اس میں بقدر ترمیم و اصلاح کر کے نسخہ مریضوں کے حوالے کر دیتے۔ حکیم صاحب کے وہاں نسخہ لکھنے والے شاگردوں کی تعداد بارہ کے قریب تھی۔ اس طور پر ان کو پانچ سو مریض یومیہ کے حساب سے 2 سال تک حکیم اجمل خاں کی شاگردی اور مریضوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

حکیم اجمل خان کی سربراہی میں طب یونانی کو فروغ دینے اور نصاب تیار کرنے کے لیے اصلاح طب کے نام سے جو ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی اس میں حکیم کبیر الدین جیسے مایہ ناز طبی کتب کے مصنف پروفیسر حکیم فضل الرحمٰن صدر الاطبا حکیم محمد الیاس خاں، حکیم سید ناصر عباس اور حکیم عبدالحفیظ جیسے شیوخ جامعہ کے ساتھ یہ بھی شریک تھے۔

اعظم گڑھ جو اس وقت مشاہیر اطبا کا مرکز اور ان مشاہیر اطبا کے علاج و معالجہ کا چہار جانب شہرہ تھا ان اطبا میں حکیم الٰہی بخش، حکیم علی مفید زنگی پوری۔ حکیم کرامت حسین، حکیم سید بدلو، حکیم

عبدالواحد غازی پوری، حکیم محمد نبی جیراج پوری، حکیم شاہ دیویت، حکیم سرے ستیہ قابل ذکر ہیں۔ ایسے ہی حالات میں انھوں نے اعظم گڑھ کے محلہ کوٹ میں دواخانہ کھولا۔ شروع شروع میں مرضا کی تعداد دس پندرہ رہی۔

سیاسی وسماجی خدمات:

ابھی حکیم محمد اسحاق کی عملی زندگی یعنی طبابت کی پریکٹس شروع ہی ہوئی تھی کہ ملک میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت کا آغاز ہو گیا اور پورے ملک میں ایکٹ کی مخالفت کل ہند پیانے پر شروع ہوگئی۔ اسی وقع پر اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے بھی شروع کر دیے جس کی بنا پر سارے ہندوستان میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور کل ہند پیانے پر مندرجہ ذیل مطالبات کی مانگ ہوئی۔

1-سرکاری خطابات چھوڑے جائیں۔

2-سرکاری اسکول چھوڑے جائیں۔

3-شراب چھوڑی جائے اور شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔

4-سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے اور وکیل وکالت چھوڑیں۔

5-ودیشی کپڑوں کا استعمال ترک کیا جائے اور غیر ملکی کپڑوں کی دوکانوں پر ہڑتال کی جائے۔

غرضیکہ سارے ملک میں قومی بیداری کی تحریک پیدا ہوگئی تھی اور اس تحریک کے اثرات سے اعظم گڑھ بھی نہ محفوظ رہ سکا۔

اساتذہ سے سرکاری اسکولوں کو چھوڑنے اور عوام سے کھدر کا بنا کپڑا اور سوت کاتنے کو کہا گیا۔

اسی زمانے میں خلافت تحریک نے اپنا زور دکھانا شروع کر دیا 1919 میں گاندھی جی تحریک خلافت کے صدر پہلے ہی چنے جا چکے تھے 4 تا 9 ستمبر 1920 کو کلکتہ اجلاس نے ملک گیر پیانے پر بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی اور 3 ستمبر 1920 کو جب غیر ملکی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا تو ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آ گئے اور گاندھی جی قیادت میں سب نے

مل جل کر کام کرنا شروع کیا اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ تحریک پھیل گئی۔

بدیشی بائیکاٹ:

1921 میں جب غیر ملکی کپڑوں کے مکمل بائیکاٹ کا سلسلہ شروع ہوا تو پورے اعظم گڑھ میں یہ تحریک زور پکڑ گئی اور خلافت کمیٹی و کانگریس پارٹی کے ممبروں کے ساتھ حکیم محمد اسحاق بھی شہر و قصبات کا دورہ کر کے غیر ملکی کپڑوں کی گانٹھوں کو مہر بند کرنے اور ایسا نہ کرنے والوں کی دوکان پر ہڑتال کی جاتی جس سے خریداروں کی آمد کم ہوتی گئی چونکہ اعظم گڑھ کا قصبہ مئو کو کپڑے کا صنعتی مرکز............ ہونے کا فخر حاصل تھا اس لیے کانگریس اور خلافت کمیٹی کے چوٹی کے لیڈران موتی لال نہرو اور مولانا محمد علی و شوکت علی برادران برابر آتے رہے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو پاسے مئو آرہے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی۔ موسم سخت تھا اور دوسری کوئی سواری نہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے اورسیئر امجد علی غزنوی کے والد نے ریلوے ٹرالی میں نہرو کو مئو پہنچایا جس کی پاداش میں اورسیئر امجد علی کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔

دینی مدارس خصوصاً اعظم گڑھ کا دینی مرکز درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے طلبا اور اساتذہ خصوصاً مولوی شبلی متکلم مولانا امین احسن اصلاحی۔ اختر احسن اصلاحی اور مولوی عبد الجلیل اصلاحی نے تحریک آزادی میں بہت تعاون دیا۔ ان کے ساتھ تحریک میں دیگر جن لوگوں نے تعاون دیا ان میں ان کی اہلیہ محترمہ نے نہ صرف تعاون دیا بلکہ حکیم محمد اسحاق کی بڑی بہن نے مٹھ کی ٹسری ساری ہیرا کئی کے دو پٹہ اور دوسرے غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی۔ مستورات میں تقاریر کیں اور دیگر خواتین کو ترغیب دلائی۔

ان کے ان کارناموں پر اچھا اثر مرتب ہوا۔ شہر میں تو اس تحریک نے اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کر لی کہ مولوی مسعود علی ندوی اور سید سلیمان کی کوششوں سے ایک سودیشی کپڑوں کی دوکان کھول دی گئی۔ عبد الرؤف ساکن چھاؤں اور شاہ یاسین اس کے نگراں اور فروخت کنندگان مقرر ہوئے اس کے ساتھ ساتھ حکیم محمد اسحاق نے اپنے دیگر ہندو مسلم ساتھیوں بھوانی پرشاد وکیل حاجی عبد الغفور خستہ، عبد الشکور دفتری بدر الدین خاں، ظہیر خان، مولوی اسلم انصاری، یاسین مرحوم د حافظ احمد اور پروشوتم کہار وغیرہ کے ساتھ تحریک کے دوسرے رخ جس کا مقصد شراب اور سگریٹ

کی دوکانوں نیز آب کاری کے دفاتر پر پکٹنگ کی جس کی وجہ سے بہت سے ساتھی انگریزی مظالم کے شکار بھی ہوئے۔ جن میں پرشوتم سرفہرست ان مظالم کا شاہکار رہا۔

تحریک کے تیسرے رخ کے طور پر ضلع کے مختلف قصبات میں عدالتی پنچایتیں قائم کی گئیں۔ والنیٹر بھرتی کیے گئے اس تحریک کے تیسرے جز کا سب سے اچھا نتیجہ مئو میں دیکھنے کو ملا۔ جہاں والنیٹرس کی باقاعدہ تربیت اور بھرتی ہوئی تھی۔

تحریک کے دوسرے رخ اساتذہ سے اسکول چھوڑنے کی اپیل پر جہاں اساتذہ اسکولوں میں پڑھانا چھوڑ دیا لہٰذا تحریک کی کامیابی اور ایک سچے مجاہد کی طرح انھوں نے بھی اپنی مادر علمی مدرسہ اسلامیہ باغ میر پیٹو میں پڑھانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی۔ دس بجے تک مطب میں رہے، پھر اسکول پڑھانے چلے جاتے وہاں سے گاندھی جی کے قائم کردہ اسکول جودھی پور میں چلے جاتے اور وہاں چرخہ چلاتے اور سوت کاتتے۔ اس طرح انھوں نے دو تین سال صرف کیے اور خود اپنے ہاتھ سے کاتے سوت کا ایک پاجامہ بنوایا۔

تحریک کی دوسری کڑی خود اپنے اسکولوں کو کھولنا اور ان اساتذہ سے جو سرکاری اسکولوں کو چھوڑ چکے تھے یا جو طلبا اسکولوں میں تحریک کے زیر اثر تعلیم کو خیرباد کہہ چکے تھے یا جن کا نام اسکول سے خارج ہو چکا تھا اس مقصد کے تحت محلہ پہاڑ پور میں گاندھی جی کے نام پر ایک اسکول مولانا شبلی کے والد حبیب اللہ کے مکان میں کھولا گیا۔ شاہ علاؤ الحق وکیل اس مدرسہ کے اہم سرگرم کارکن اور مدرس تھے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی اور اردو تھا۔ طالب علموں میں مہاراج گنج کے شفیق صاحب رفیق صاحب اور رام آسرے قابل ذکر تھے۔

یہ رام آسرے وہی ہیں جنھوں نے اسی زمانے میں قصبہ سرائے میر میں مسلمانوں کے ایک عام جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے دعائے قنوت پڑھی کہ آپ ونشرک ولا نکفرک و نخلع و نترک من یفجرک پڑھتے ہیں پھر آج آپ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں۔؟

انگورہ فنڈ:

حکیم محمد اسحاق کی قومی خدمات میں ایک بڑی خدمت ترکی کی نئی حکومت کے لیے فنڈ کی

فراہمی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے ہمعصر اور تحریک آزادی کے متوالے مولوی مسعود علی کے ساتھ ساتھ روزانہ پچاس پچاس میل کا سفر کیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت انھوں نے 1921 میں ایک لاکھ کا فنڈ اکٹھا کیا تھا جس میں شہر کے علاوہ مئو، مبارک پور، سرائے پور پھریہا اور منڈیار کے لوگوں نے بڑی فراخ دلی سے نہ صرف چندہ بلکہ زیورات تک دے دیے تھے پھر یہاں کی ایک خاتون ہمشیرہ جسٹس اقبال یعنی والد علی نے اپنا طلائی نکلس دے دیا تھا جس کی قیمت اس دور میں 500 روپے تھی۔

تحریک آزادی سے دلچسپی اور شرکت کی بنا پر ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد بھی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکیم اسحاق کے والد محلے کی انجمن کے صدر بنائے گئے جو بازو پر سیاہ بلے لگائے احتجاج میں شریک رہتے تھے۔ اعظم گڑھ میں تحریک آزادی کے زیادہ تر جلسے کربلا کے میدان میں رہتے تھے۔ یاسین اور چھیدو رات رات بھر جھنڈیاں بناتے رہتے تھے۔ حکیم اسحاق کی بیوی اور بڑی بہن بھی شریک جلسہ ہوتیں۔ چنانچہ جب ایک بار بلبل ہند سروجنی نائیڈو جلسہ میں شرکت کے لیے آئیں تو دیگر خواتین کے ساتھ ان کی بیوی اور ہمشیر سے بھی سروجنی نائیڈو کا تعارف کرایا گیا۔ جہاں کافی دیر تک تحریک میں خواتین کی دلچسپی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی بڑی بہن نے تحریک میں فنڈ کے لیے ذاتی زیورات بھی دے دیے تھے۔ یہاں تک کہ جب ناک کی کیل اور کان کے جھمکے فنڈ میں دیے تو مولوی مسعود علی نے یہ سب زیورات واپس کر دیے اور کہا کہ حکیم صاحب کی ہمشیر سے اس سے زیادہ ملنا چاہیے چنانچہ ان کی بڑی بہن نے ان زیورات کے ساتھ ناک کی نتھ کا اضافہ کر کے تحریک آزادی کے فنڈ میں یہ زیورات دے دیے۔ ساتھ میں حکیم صاحب کی اہلیہ محترمہ نے بھی اپنے کان، ہاتھ اور ناک کے زیورات چندہ میں دیے۔

چندے کی رقم کا حساب کتاب لاکھوں میں تھا۔ اس وقت کے جلسوں میں عوام کی بے پناہ شرکت ہوتی تھی اور بچہ بچہ کی زبان پر یہ شعر زبان زد تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اعظم گڑھ میں جب خلافت کمیٹی اور عدم تعاون تحریک سے مل کر ذیلی خلافت کمیٹی بنی تو اس

کمیٹی میں ستاون ممبر تھے جس میں حکیم اسحاق کا نمبر تیسرا تھا۔

تحریک میں جب گاندھی جی کی شمولیت ہوگئی تو اس موقعہ پر متعدد نظمیں لکھی جس کا یہ ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

حکیم اجمل خاں مسیح الملک یہی کہتے تھے
ہم ہیں گاندھی کے طرف دار ہمارا گاندھی

1921 میں یہ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور پارٹی کی حیثیت اس وقت بہت مستحکم ہو چکی تھی اور نمایاں حیثیت اختیار کر چکی تھی دسمبر 1922 کو کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے شرکت کی تھی۔ یہ ان کی اپنے شہر اعظم گڑھ سے کسی دوسرے شہر کے اجلاس میں پہلی بار شرکت ہوئی تھی۔ گیا میں جب کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ تبدیلی کے موافقین اور مخالفین کے نام سے جس کی وجہ سے آپس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ حکیم اسحاق۔تبدیلی کے موافقین کے ہم نوا تھے اور کونسلوں میں جا کر شرکت کرنے کے بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ اسی زمانے میں گیا میں خلافت کمیٹی کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا جس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان برابر شریک جلسہ رہے تھے۔

ان کے ساتھ ان کے شہر اعظم گڑھ میں شاندار پولیٹیکل کانفرنس بھی ہوتی تھیں جس میں رات رات بھر جاگ کر پنڈال کی تعمیر ہوتی اور سارا فرش ودیگر سامان کھدر کا رکھا جاتا تھا۔ ہندو مسلم مل کر چندہ دیتے تھے۔ جلسہ گاہ میں نظم ونسق کا معیار اتنا بلند ہوتا تھا کہ لیڈروں کا پنڈال، سامعین کے بیٹھنے کی جگہ اور اخبار نویسوں کی گیلریوں کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا۔ موتی لال نہرو۔ مولانا محمد علی، سرجونی نائیڈو اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری برابر مشترکہ طور پر ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

پنڈت جواہر لال کے والد موتی لال نہرو ان جلسوں میں زیادہ شریک ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ مشرقی کلچر کے دلدادہ اسلامی تہذیب اور زبان کے شیدائی اور مسلمانوں کے دسترخوان اور کھانوں کے عاشق تھے۔ مشرقی اضلاع کے دورے میں اعظم گڑھ کو اہمیت دیتے تھے اور کھانا دارالمصنفین میں کھاتے تھے اور مرغ وماہی وپلاؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ محمود آباد کے گھر ڈنر تھا جس میں (انگریزی) اسلامی اور ہندوستانی کھانے یکے بعد دیگرے

کھلائے گئے۔ موتی لال نہرو اور سرتیج بہادر سپرو تو آخر وقت تک تینوں اقسام کے کھانے سے عدم واقفیت کی بنا پر پیٹ بھر چکے تھے۔ موتی لال نہرو کی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی دارالمصنفین میں قیام رہتا تھا۔ جہاں جواہر لال نہرو۔ مہمان خانہ کے سامنے بنے ہوئے کنوئیں پر اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔

حکیم محمد اسحاق اپنی دواخانہ کی مصروفیات کے باوجود شریک جلسہ ومیٹنگ رہتے تھے۔ اگرچہ اعظم گڑھ کے باہر قصبات میں بھی اکثرت شرکت رہتی لیکن شام یا رات کو کسی پہر واپس آجاتے تاکہ صبح کے مطب کا ناغہ نہ ہو۔ کم وبیش برابر شہر سے باہر کے مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔

لاہور میں کانگریس کا آل انڈیا اجلاس ہونے کے بعد وہاں کے ریزولیشن اور ہدایت کے بموجب جنوری 1930 میں اعظم گڑھ کانگریس کمیٹی کی از سر نو تنظیم ہوئی تو حکیم اسحاق اس کمیٹی میں نائب صدر مقرر کیے گئے تھے۔

ملک میں آزادی کی تحریک کے سلسلے میں کانگریس پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا 28-1927 میں کانپور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کو کرنی تھی۔ یہ اپنے رفقا کے ساتھ شاہ گنج تک پہنچے تھے کہ ٹرین چھوٹ گئی یہ لوگ شرکت کرنے سے مایوس ہو گئے۔ جلسہ کے صدر مولانا آزاد کو تار دیا گیا کہ خطبۂ صدارت تاخیر سے شروع کیا جائے چنانچہ جب یہ اپنے رفقا کے ساتھ جلسہ میں پہنچ گئے تو خطبۂ صدارت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح انھوں نے کلکتہ کے اجلاس میں بھی شرکت کی جس میں اکابرین ملک بھی شریک تھے۔

26 فروری 1930 کو سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہوا اور 13 مارچ کو گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی شروعات کر کے نمک بنانے کا قانون توڑا۔ 14 تا 16 فروری 1930 کو واردھا میں منعقدہ اجلاس میں مندوبین کانگریس کی جانب سے عام ستیہ گرہ کا اجازت نامہ لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ان کے دیگر رفقا مولوی مسعود اور حاجی عبدالغفور خستہ وغیرہ نے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گنی سنگھ باغ میں نمک بنا کر قانون توڑا۔ اس وقت قانون کے مطابق نمک بنانے کی سزا گرفتار سزا اور جائداد کے نیلام کا حکم تھا اس تحریک میں خاندان کے دیگر افراد

میں ان کے پھوپھی زاد بھائی ثناء اللہ، نورالہدیٰ، محمد وکیع اعظمی بھی پیش پیش رہے۔ نمک سازی کے سلسلہ میں یہ اور تحریک آزادی کے سپاہی و ساتھی سورج ناتھ سنگھ نظام آباد جاکر عوام کو تحریک کے سلسلہ میں آمادہ کر رہے تھے کہ حکیم محمد اسحاق کو اطلاع ملی کہ شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ پھر الہٰ آباد میں تحریک کے سلسلے میں صوبائی میٹنگ تھی حکیم محمد اسحاق کو بھی شرکت کرنی تھی لیکن عین وقت ایک مریض کو دیکھنے کے لیے شہر سے باہر جانا ہوا جس کی بنا پر یہ الہٰ آباد نہ جا سکے۔ دیگر شرکا جو قریب قریب تعداد میں 52 تھے جب لوٹ کر آئے تو شہر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیے گئے۔

اس طرح ان کو صوبائی کانفرنسوں میں صوبائی ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے برابر شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار گورکھپور میں صوبائی میٹنگ تھی کھانا فراق گورکھپوری کے مکان پر جس میں مٹی کے پیالوں میں گوشت کھلایا گیا اور چائے پلانے میں کیتلی کی جگہ مٹی کے بنے ہوئے لوٹوں شکر ڈالنے کے لیے آم کے پتوں اور چائے میں شکر چلانے کے لیے آم کی چھوٹی چھوٹی شاخوں سے چمچہ کا کام لیا گیا۔ حکیم اسحاق چونکہ کانگریس پارٹی کے عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی سے بھی وابستہ تھے اس لیے ان کی شرکت لازمی رہی تھی۔

1932 میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا جس کے سبب مزید ذمہ داریوں اور تنہائی کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے باوجود بھی قومی ملی و سیاسی دلچسپیوں میں کوئی کمی نہ آسکی۔ مطب کی پریکٹس بھی خاصی چل چکی تھی۔ اور شاید ہی کوئی ایسا موقع ہوگا جو انھوں نے مطب چھوڑا ہو ساری ادبی تہذیبی اور سیاسی مشاغل کا مرکز یہی مطب تھا۔ مرضا میں ہندو مسلمان دونوں کی تعداد ہوتی۔ اکثر شہر باہر مریضوں کو دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا۔ حسب دستور اور دعدہ استاد طب محترم حکیم اجمل خاں صاحب کے نہ تو کسی سے فیس کا تقاضا کرتے اور نہ ہی لیتے اگر کوئی مریض خوشی خوشی دے دیتا تو عطار کے پاس جمع کرنے کی ہدایت فرما دیتے۔

اعظم گڑھ شہر میں یوں تو تعلیم کی ابتدا مولانا شبلی کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی۔ شبلی منزل اور شبلی اسکول کی بدولت ضلع میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر ایسی کوئی انجمن نہ تھی جو لوگوں کے اندر ادبی ثقافتی اور تہذیبی ذوق پیدا کر سکتی ہے چنانچہ اعظم گڑھ کی ایک

مشہور شخصیت اسماعیل خان نے 1907 میں انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں مشاہیر علما کی شرکت ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں شرکت بنا پر اقبال سہیل سے ملاقات ہوگئی اور حکیم صاحب نے پھر یہاں جانا شروع کر دیا۔ پھر یہاں کے سفر میں حکیم محمد اسحاق کئی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم سفر رہے۔ پھر یہاں جانے کا مقصد مولانا حمید الدین فراہی سے نیاز حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو نہ صرف ایک بزرگ تھے۔ بلکہ مدرستہ الاصلاح کے بانی بھی تھے۔ حکیم محمد اسحاق عام طور پر گیارہ بجے تک مطب کرتے پھر یہاں چلے جاتے وہاں سے رات گئے تک لوٹ آتے تھے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی وجہ سے سرائے میر میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ جہاں مولانا امین اصلاحی اور مولانا اختر اصلاحی سے بھی گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ یہ دونوں عالم تھے اور مولانا حمید الدین فراہی کے خصوصی شاگرد بھی۔ جو آگے چل کر ان کی تحریک میں بہت معاون بنے۔ اسی درمیان ایک بار جب علامہ شبلی کے پاؤں کو حادثہ پیش آ گیا تھا یہ اپنے والد کے ہمراہ علامہ شبلی کو دیکھنے گئے اس وقت دار المصنفین کا کتب خانہ کچے بنگلہ میں تھا۔ اسی کے بر آمدے میں مولانا قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ارد گرد کتابوں کا انبار تھا اور 1918 میں جب تعلیم طب سے فراغت کر کے آئے تو اپنے دوست رشید احمد کے ساتھ مولانا شبلی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے تو وہیں مولانا مسعو علی، سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں سے ملاقات ہو گئی پھر مراسم بڑھے۔ دار المصنفین زندگی کا ایک جز بن گیا اور تقریباً ہر روز شام کو وہاں یہ نشست میں جانے لگے۔ دیگر رفقا ادارہ سے شناسائی پر علاج و معالجہ کے تعلق سے دار المصنفین کے ایک فرد بن گئے۔

تحریک خلافت کے دنوں میں ان کے روابط دار المصنفین میں آنے جانے والے عمائدین سے بہت بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ مرضا آتے تھے اور حکیم محمد اسحاق کو ان سے دار المصنفین میں ملنے کا موقع ملتا تھا۔ یکم مارچ 1921 کو جب مولانا محمد علی جوہر آئے تو شاہ گنج سے دار المصنفین تک ہزار ہا آدمی ان کے استقبال اور ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔ اسی سال جون میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی شبلی منزل میں تشریف لائے اور لائبریری نیز دوسرے شعبے دیکھے اور زبان کے مسئلے پر گفتگو کی۔ فروری 1930 میں سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر ضیاء الدین تشریف لائے۔ سپرو نے فرمائش کر کے صہبائی کا دیوان دیکھا۔ سپرو کے دادا صہبائی کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین

نے علم ہیئت کی کتب کا معائنہ کیا۔ اسی طرح حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور صدر یار جنگ بھی تشریف لائے ان کو شبلی اسکول میں ایڈریس دیا گیا اور آخرالذکر نے جوابی تقریر کی۔ ان کے ساتھ آنے والوں میں نواب مزمل اللہ خان بھی تھے۔ جنھوں نے دارالمصنفین کی کچی مسجد کو پختہ بنوانے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی۔

صدر یار جنگ نے سنگ بنیاد رکھا اور مولانا حمید الدین فراہی نے گارا اپنے سر پر رکھ کر ڈھویا۔

حکیم محمد اسحاق کی روزانہ شام کو دارالمصنفین میں حاضری ضرور ہوتی تھی۔ برسہابرس تک ان کے والد نے شبلی منزل کی مسجد میں تراویح پڑھائی تھی۔ اب حکیم اسحاق کی ذمہ داری تراویح پڑھانے کی رہی۔ تراویح پڑھانے کا قاعدہ یہ ہوتا تھا کہ حکیم محمد اسحاق اپنے گھر میں 12 رکعت پڑھا کر کسی سال پیدل، کبھی یکہ پر اور کبھی محمد علی مختار کی موٹر پر بقیہ نماز پڑھانے چل دیتے تھے اور چودھویں رمضان کو قرآن ختم کر دیتے۔ شبلی منزل یا دارالمصنفین میں حاضری کا یہ سلسلہ 1942 تک چلتا رہا کہ عصر و مغرب کے درمیان حاضری ضرور رہتی تھی۔ حکیم اسحاق نے شبلی منزل اور موجودہ دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ اپنے مادر علمی مدرسہ باغ پختو کی عرصہ تک نظامت بھی کی تھی۔

تحریک کے دوران ان کی ملاقات مشہور انقلابی شاعر انور صابری اور سلام مچھلی شہری سے بھی ہوئی۔ انور صابری سال میں کئی بار مئو مبارک پور اور سرائے میر کے جلسوں میں آئے تو حکیم محمد اسحاق کے گھر بھی آئے۔ اوقات طب میں جب یہ شاعران کے دواخانے میں آکر بیٹھتے تو انور صابری کو دیکھنے سننے اور ملنے کے لیے لوگ آتے رہتے۔ حکیم محمد اسحاق مریضوں کو دیکھتے رہتے اور نسخے لکھتے رہتے اور احباب کی مجلسی گفتگو کے ساتھ ساتھ انور کی نظموں اور انقلابی اشعار سے بھی محظوظ ہوتے رہتے تھے۔

انور صابری کے حسب ذیل اشعار بہت پسند کیے جاتے تھے۔

اکڑتے پھرتے ہیں ہر سو جو مغربی بندر ہم ان کو ایک طمانچے میں رام کر لیں گے
تم اپنا بوریا بستر سنبھال کر بھاگو ہم اپنے ملک کا خود انتظام کر لیں گے

جس طرح جوش ملیح آبادی کے اشعار نے ایک وقت میں جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اسی طرح انور صابری کے اشعار بھی زبان زد تھے۔

سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم — فدائے قوم شیدائے وطن اے نیز اعظم
سنا ہی ہوگا تو نے ایک بدبختوں کا بستی ہے — جہاں انسانیت بھی آج جینے کو ترستی ہے

انور صابری نے بھی ایک نظم اسی نظم کے مقابلہ میں ایک جلسہ گاہ میں پڑھی۔

غلام آباد میں میری تمنا پوچھنے والے — دل محکوم کا رنگیں فسانہ پوچھنے والے
تمنا ہے کہ لوں بدلہ کبھی جھانسی کی رانی کا — تمنا ہے کہ لوں بدلہ بھگت سنگھ کی جوانی کا
تمنا ہے کہ لوں بدلہ پشاور کے شہیدوں کا — بہادر شاہ کے معصوم بچوں کی امیدوں کا

ان اشعار کے نتیجہ میں مولانا سعید احمد، انو صابری اور رفیع اختر کے نام وارنٹ جاری ہو گیا اور مولانا سعید احمد عین عید سے دو یوم قبل گرفتار ہو کر اعظم گڑھ لائے گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کا جب نعرہ لگا اور جمعیۃ علما نے ہندوستان کے پچاس علما کے فتاویٰ سے ایک اشتہار چھپوا کر شہر میں چسپاں کرانے کے لیے پہلے مبارک پور پھر اعظم گڑھ میں یہ اشتہار لا کر حکیم صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ شہر میں چسپاں کرا دیں۔

حکیم محمد اسحاق نے مولوی عبدالحق کو بلوا کر اشتہارات اور لیئی کے لیے کچھ پیسے دیے اور کہا کہ یہ اشتہارات آج ہی رات چسپاں کرا دیں اور کانگریس کے ایک اہم جلسہ میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے نظام آباد چلے گئے۔ سی۔ آئی۔ ڈی مشتاق نے حکیم محمد اسحاق کو آ کر خبر دی کہ ان کی گرفتاری یقینی ہے۔ یہ چند جوڑے کپڑے، قرآن شریف، مطالعہ کے لیے کچھ کتب اور بستر کے ساتھ جیل جانے کو تیار ہو گئے۔ مگر گرفتاری صرف عبدالحق کی ہوئی۔ یہ محمد اسحاق کی تیسری گرفتاری کی خبر تھی۔ پہلی سورج ناتھ سنگھ کے ہمراہ نظام آباد جا کر نمک بنانے کی تحریک کے لیے عوام کو آمادہ کرنے پر۔ دوسری الہ آباد میں صوبائی میٹنگ کے موقع پر۔ جب یہ الہ آباد نہیں گئے تھے بلکہ ایک مریض دیکھنے چلے گئے تھے ہاں ان کے دیگر ساتھی جن کی تعداد 52 کے قریب تھی گرفتار کے لیے گئے تھے یہ گرفتار نہ ہو سکے تھے۔ تیسری یہ پوسٹر کے سلسلے میں تھی جو نہ ہو سکی۔

گاندھی کیپ:

تحریک میں دن بدن تیزی آرہی تھی۔ انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ دکی مانگ سے ہندوستان کا ہر شہر لرز رہا تھا 1942 کے انہی ہنگاموں سے پولیس نے عوام کو خوف زدہ کر رکھا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ جو شخص گاندھی ٹوپی پہن کر نکلتا۔ پولس والے اس کے سر پر سے زبردستی ٹوپی اتار لیتے یا اتروا دیتے۔ حکیم اسحاق کے چند ساتھیوں نے پولیس والوں کی زبردستی کے باوجود گاندھی ٹوپی نہیں اتاری تھی۔ انہی دنوں ایک اہم واقعہ ہوا۔

حکیم محمد اسحاق جن کا ان دنوں اعظم گڑھ میں شہرہ تھا۔ اعظم گڑھ کے ایک جج کی دختر بیمار ہوگئی۔ اس کو جا کر دیکھنے لیے جج صاحب نے گاڑی بھجوائی۔ حکیم صاحب نے صرف اس نظریے سے کہ وہاں پر کہیں گاندھی ٹوپی کی بے حرمتی نہ ہو جائے (کیونکہ حکیم صاحب گاندھی ٹوپی پہنتے تھے) اس خدشتہ کا اظہار کیا۔ لیکن جج کی یقین دہانی پر حکیم اسحاق گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے اس جج کی لڑکی کو دیکھنے گئے۔

اس دور کی تحریک میں ان کے ساتھ جو ساتھی رہے۔ ان میں یحییٰ اعظمی، بھوانی پرشاد مختار ڈاکٹر حفیظ اللہ، سیتا رام استھانا، سورج ناتھ سنگھ، ناگیشور پرشاد وکیل جن کے لڑکے کی شادی ہندوستان کے پہلے صدر ریہ جمہور ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی پوتی سے ہوئی تھی۔ مولوی عبدالباری حاجی علی حسن اور شمس الدین خاص تھے۔ لیکن ان سب میں جرأت مندانہ ہستی مولوی عبدالحق کی تھی۔ لالہ کنور سین جو دہلی طبیہ کالج میں حکیم اسحاق کے ہم جماعت تھے وہ بھی 1942 میں تحریک کے سلسلے میں میرٹھ میں گرفتار ہو کر فیض آباد جیل بھیجے گئے تھے۔

1942 کے اس ہنگامے کے بعد جب آزاد ہند فوج پر مقدمہ چلانے کی بات چلی تو پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ پھر جب ملکی حالات بدلے اور برطانیہ نے صلح وصفائی پر آمادگی ظاہر کی جبکہ چرچل کسی بھی صورت میں ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں نہ تھا۔ برطانیہ میں ہونے والے الیکشن میں لیبر پارٹی کو اکثریت ملنے پر لیبر پارٹی اور اٹلی کی وزارت عظمیٰ نے ہندوستان کی آزادی کے راستے ہموار کر دیے۔ چنانچہ لارڈ ڈیول کی آمد کیبنٹ مشن کی گفتگو نے لوگوں کی امیدیں بڑھادی تھیں لیکن ملکی سیاست پر مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا تھا۔

1945 میں عام انتخابات کی دھوم مچی اور کانگریس و مسلم لیگ بڑے فریق کی حیثیت سے میدان سیاست میں آ گئیں۔ حکیم اسحاق اور ان کے سیاسی رفقاء ہمعصر مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی رہنمائی میں ضلع کے الیکشن میں مصروف ہو گئے۔ مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے الیکشن کے میدان میں خرچ کرنے کو پانچ ہزار کی رقم دی تھی۔ قاضی ہارون رشید کے گھر میں الیکشن کا دفتر قائم ہوا۔ مولوی ریاست علی ندوی انتخاب کے نگراں مقرر ہوئے۔ ضلع کو مختلف یونٹوں میں بانٹ دیا گیا۔ حکیم اسحاق کے حصہ میں محمد آباد، سگڑی اور صدر کی تحصیلیں آئی تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ عوامی ہمدردیاں زیادہ تھیں ایسے وقت میں جو کارکن کانگریس اور جمعیۃ کے مشترکہ پلیٹ فارم سے کام کر رہے تھے ان کی جرأت قابل داد تھی۔ اس لیے کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ اعلیٰ ذات وطبقہ کے کھاتے پیتے مسلم افراد نہ صرف پاکستان کے کٹر حامی تھے بلکہ جمعیۃ اور کانگریس کے جلسہ جلوسوں میں شریک ہونے پر ساتھیوں پر مختلف طریقوں سے پابندیاں بھی لگاتے تھے۔ حکیم صاحب نیز ان کے شرکاو ساتھیوں کی کوششوں سے رہنمایان ملک وملت کی بار بار اعظم گڑھ آمد ہوتی رہتی تھی جن میں مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا ابوالوفا، مولانا قاسم، مولانا شاہد فاخری جو راقم کے قریبی عزیز قاضی احمد حسین کے بڑے بھائی ہوتے تھے اور مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ گووند بلبھ پنت، رفیع احمد قدوائی کیشو دیو مالویہ اور کیلاش ناتھ کاٹجو قابل ذکر ہیں۔

چونکہ حکیم صاحب ایک باعزت پیشے سے منسلک تھے اور قرب وجوار کے عوام ان کے نام سے واقف تھے اس لیے ہنگاموں اور انتخابی چپقلشوں کے باوجود صرف ایک بار ناخوش گوار واقعہ یہ پیش آیا کہ جب حکیم اسحاق انتخابی مقاصد کے تحت جیراج پور گئے تو ان کی کار پر عوام نے پتھراؤ کر دیا اور یہ ان کے ساتھی موٹر سے نہ نکل سکے اور الٹے پیروں ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ ان حالات میں 1945 کے ہنگامی انتخابات میں ان کی پارٹی کو ہزیمت اٹھانی پڑی کیونکہ ایسے پر آشوب دور میں چہار جانب مسلم لیگ کا غلبہ تھا۔ لیکن یہ عارضی الیکشن کے نتائج ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکے چنانچہ نئے عزم و حوصلے کے ساتھ یہ اور ان کے ساتھی پھر کانگریس اور جمعیۃ کے لیے کام کرنے میں پوری تندہی سے لگ گئے۔

ایسے وقت میں حکیم اسحاق نے اکابرین ملک وملت سے بہت فیض اٹھایا جن کے نام

درج ذیل ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا شاہد فاخری، مولانا ابوالوفا، مولانا قاسم، عبدالحمید الرحریری جو اہل علم تھے اور جدہ میں حکومت ہند کی جانب سے سفارت خانے پر دو تین سال تک کلچرل اتاشی کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے اور پنڈت نہرو کے مجموعہ مکاتیب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ محمد انس، عبدالکریم خان، مولوی فرید الدین وکیل حافظ نصر الحق، شاہ اسحاق وکیل، حافظ عبد الحمید وکیل، شاہ فیضان احمد وکیل، ڈاکٹر عبدالرؤف، محمد یحییٰ خاں فتح پوری، نجم الدین اصلاحی، بابو سراج الحق، ماسٹر محمد شفیع قابل ذکر ہیں۔

الیکشن اور مطب:

1945 کے الیکشن میں بڑی رنجشیں ہوگئی تھیں۔ ذاتی طور پر کچھ لوگوں نے بیجا الزام تراشیاں اور طعنے دیے مگر وقت کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب اپنے پیشے سے غافل نہ رہے اور مطب کے اوقات میں کسی قسم کی کمی نہ آنے دی اور اب مدت پریکٹس 25 سال ہو چکی تھی۔ شہر کے بیشتر مسلمان اور ہندو خاندانوں کے معالج بن گئے تھے۔ ضلع کے بیشتر قصبات میں ان کی آمد و رفت مرضا کے دیکھنے کے لیے ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی طبابت کو کبھی روپے پیسے کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کسی مریض کو اس کی حیثیت سے باہر نسخہ لکھا۔ ان کا اپنا مطب کے سوا دواخانہ بھی تھا لیکن کبھی کسی مریض سے یہ نہ کہا کہ دوا میرے دواخانہ سے لو۔ مطب کی مصروفیت کے بعد جو وقت بچتا اس میں قومی اور مذہبی سرگرمیوں، شبلی منزل کی حاضری اور اپنے یہاں مغرب سے لے کر عشا تک نشست میں پابندی سے شریک ہوتے۔ بعض اوقات ان مصروفیتوں میں بھی مریض آجاتے اور بالا بالا باہر مریضوں کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا۔ ان کی آمدنی کا تمام تر انحصار اس فیس پر ہوتا جو باہر جا کر مریضوں سے ملتی۔ جو نسخہ مطب اور شہر میں لکھتے اس کی قیمت نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی مجربات اور مخصوص امراض کے نسخے بہت قیمتی ہوتے۔ 1940 یا 1945 میں ان نسخوں کی قیمت بہت ہوتی تھی لیکن انھوں نے کبھی کسی کمیشن یا معاوضے کے سبب نسخے نہ لکھے۔

ہوالشافی:

حسب قاعدہ کبھی کسی مریض کو حتمی فائدہ کا یقین نہ دلایا اور مریض سے صاف بتادیا کرتے تھے کہ کتنے دنوں علاج کرنا ہوگا۔ خدا کے فضل سے شفا ہو جاتی ان کے اس طریق کار نے مریضوں کو ان کا مطیع بنادیا۔ حسب دستور مریض تحفے تحائف بھی لاتے تھے۔ مسلم مریضوں کے مقابلے ہندو مرضا کی تعداد زیادہ تھی۔ شہر میں کئی ہندو گھرانے ایسے تھے جن کے تمام بچے اور عورتیں عمر بھر ان کی دوائیں کھاتی رہیں اور بعض بے اولاد حضرات نے حسن عقیدت میں ان سے رجوع ہوئے اور ان کے نسخوں کی بدولت وہ صاحب اولاد ہوئے۔

اسی طرح مسلمان گھرانوں میں اعظم گڑھ کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو ان کے زیر علاج نہ رہا ہو۔

مذہبی رجحانات:

بچپن ہی میں حفظ قرآن کی دولت پائی تھی۔ ان کے والد نے ان کو دین کے راستے پر لگایا۔ ان کے بزرگ مولوی محمد یعقوب نے ان پر دست شفقت رکھ کر دعاؤں سے نوازا ان کے استاد مولوی خدا بخش نے ایک صالح مسلمان کی خصوصیت سے نوازا۔ استاد طب حکیم اجمل خان اپنی دینی و دنیاوی سنجیدگی، بردباری اور اخلاق کی خیرات ان کو دی۔ مولوی مسعود علی کی قربت نے ایک مہذب اور صاف ستھرا ماحول بخشا جس کی بدولت اسلام کے اصول ان کی زندگی کے جز بنے رہے اور حالات کی مساعدت کے باوجود حج جیسے بابرکت فریضہ سے بھی سرفراز ہوئے اور اپنی چچی و بیوی کے ہمراہ 26 اپریل 1960 کو کاشی ایکسپریس سے عازم بیت اللہ ہوئے۔

پابندئ مطب:

مطب کو بہت مشکل سے چھوڑتے تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں شرکت پر ناغہ ہوا۔ اپنی دختر سلمیٰ باجی (جو راقم کے زیر علاج بھی رہی ہیں) کی شادی کے سلسلے میں کانپور کا سفر کار سے کیا اور سب سے طویل ناغہ دوران حج بیت اللہ ہوا۔ یہاں تک کہ اپنے فرزندگان کی شادی میں بھی دواخانہ کر کے اٹھے یہاں تک کہ ایک صاحبزادے کی شادی میں صرف اس لیے نہ شریک ہوئے کہ مطب کا ناغہ ہوگا اور شادی اپنے بڑے بھائی کے سپرد کر دی۔

نسخہ:

مریضوں کو دیکھنے کے بعد مریض تو دوا باہر سے خرید تا تھا لیکن بیشتر نسخے خود ہی لکھتے اور اتنی کثرت سے نسخے لکھتے کہ انگلیاں درد کرنے لگتیں۔ پھر بڑے لڑکے کو نسخہ لکھنے بٹھانے لگے۔

برتاؤ:

مریضوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ مریض کے حالات گاؤں اور مذہب کو ضرور پوچھتے اور نسخے ہمیشہ حسب حیثیت لکھتے اگر کسی مریض کا قارورہ دکھاتے وقت ان کے کپڑوں پر گر گیا۔ یا چھینٹ آ گئی تو ان کو ڈانٹا نہیں۔ کبھی کسی مریض کو جھوٹ اور غلط بیانی سے متاثر نہ کرتے اور نہ ہی مطمئن۔

نذرانے:

مدراس کا ایک واقعہ ہے کہ کسی آدمی نے ان کے ایک مریض سے ان کے بارے میں سنا۔ وہ بے چارہ گٹھیا کا پرانا مریض تھا چنانچہ دوست کی وساطت سے خط لکھوایا حکیم اسحاق صاحب نے نسخہ لکھ کر بھیجا اس نے استعمال کیا اور اسے فائدہ ہو گیا۔ لوگ تحائف بھیجتے اور روپے بھی۔ جن میں سے حکیم اسحاق صاحب بعضوں کا جیب خرچ دیتے مستحقین کا حصہ نکالتے، دعوتیں کرتے ان کے چھوٹے فرزند کی شادی میں ملا یا سے ایک پرانے مریض نے 50 روپے نوید میں بھیجے تھے۔

ایک بار شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر اور وہ ایک مریض کو دیکھنے گئے۔ حکیم اسحاق اور ڈاکٹر صاحب حسن اتفاق کہ ایک ساتھ مریض کے دروازہ پر پہنچے کہ مریض ختم ہو گیا۔ حکیم صاحب لوٹ کر اسی یکہ پر گھر آ گئے اور مریض کے گھر جانے اور دواخانہ (مطب) تک آنے کا کرایہ خود ہی دیا۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب نے فیس لے لی۔

یہی حال مریضوں سے فیس کا ہوتا۔ شہر شہر سے باہر مضافات غرضیکہ کہیں جانا ہو وہ کچھ طے نہ کرتے اور جو کچھ ملتا اسے بخوشی و برضا لے لیتے۔ اگر بعض مجبور نصف دیتے اور بقیہ کا وعدہ کرتے مگر وہ قرض حسنہ ہوتا۔

مریض کو دور دور دیکھنے جاتے تو ٹوکری میں ناشتے دان لوٹا مصلّی اور پان کی ڈبیہ ساتھ جاتی۔ ایک بار گورکھپور ایک مریض کو دیکھنے گئے اور دوسرے دن دوپہر کو واپسی ہو سکی۔ بہت افسوس

کرتے رہے کہ مطب کا ناغہ ہو گیا۔ حالانکہ گورکھپور میں مریض سے پچاس روپے فیس ملی تھی۔

خود طبیب تھے مگر دوا کا استعمال شاید و باید کرتے تھے۔ زندگی اتنی پابند گزارتے تھے کہ پرہیز خود بخود علاج ہو جاتا تھا۔

وضع قطع:

زمانۂ طالب علمی میں چوڑی مہری کا پاجامہ شیروانی اور ترکی ٹوپی لباس تھا۔ لیکن تحریک آزادی میں شامل ہونے کے بعد کھدر کا کرتا پاجامہ تنگ مہری کا۔ شیرانی اور ٹوپی سردیوں میں پٹو کی گرم صدری اور شیروانی ہوتی گرم چادر بھی دستی ہوتی اور کانوں میں رومال ہوتا۔

وفات:

آخری دنوں میں یعنی ماہ فروری 1975 میں 18 کی صبح کو ان ہاتھ منہ دھو کر لٹا دیا گیا اور بڑی دختر (جو راقم کے اکثر زیر علاج رہی ہیں) سلمٰی جو ایک دن قبل آ گئی تھیں ان کو ناشتہ کرانے گئیں روزانہ کے معمولی کی مقدار کو وہ بمشکل حلق سے اتار سکے اور جیسے ہی ان کو دودھ پلایا جانے لگا کہ آنکھیں پھیل گئیں اور بڑی دختر نے ان کو کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ قبلہ رخ کر دیا اور 18 جنوری کی منگل کی شب میں ان کے آبائی قبرستان میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

حکیم محمد اسحاق صاحب کی شخصیت مکارم اخلاق اور محاسن صفات کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے۔ ان کی شرافت نفس، شرافت ذوق، اصابت رائے حذاقت فن اور استقامت علی الحق کا ایسا جامع اور مکمل نمونہ ہمارے اطراف میں مشکل سے ملے گا۔ حضرت مسیح الملک کے تلامذہ میں سے تھے اور نہ صرف فن طب میں بلکہ دیگر حیثیات سے استاد کے آئینۂ کمال تھے۔

ان کے انتقال پر حکیم صاحب کے دوست منشی معین الدین حنیف نے جو اشعار اور مادہ تاریخ کہا ہے وہ ذیل میں درج ہے۔

وہ حافظ حکیم آہ اسحاق مرحوم گلستان عالم میں جواب نہیں ہے
بڑے متقی اور بڑے پارسا تھے جو اب ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
جو اس طرح کر لے مسخر دلوں کو طبیب ایسا کوئی جہاں میں نہیں ہے
مریضوں پہ رکھے جو چشم عنایت کوئی نیک اوصاف ایسا نہیں ہے

اٹھارھویں وہ فروری کی وہ منگل کا دن گھڑی جس کی ہر ایک غم آفریں ہے
وہ اب ہو کے بازار عالم سے رخصت پیش خداوند جان آفریں ہے
وہ انسان کامل پرستار دین وہ جواب زیب باغ بہشت بریں ہے
وہ انسان کامل پرستار دین وہ جواب زیب باغ بہشت بریں ہے
جدائی میں دن رات افسوس اُن کی غم آلودہ میرا یہ قلب حزیں ہے
کرے مغفرت ان کی پروردگار یہی التجائے دل کمتریں ہے
لکھ ازروئے ابجد سن عیسوی میں پریشان عبث تو مصنف حزیں ہے

تھا مشہور عالم جو اسحاق نامی
<u>چراغ ہدایت</u> وہ زیر زمیں ہے

1975

شفاء الملک حکیم عدا للطیف فلسفی

1317ھ مطابق 1900 — 1390ھ مطابق 1970

خاندان عزیزی کا پہلوان حکیم

تاریخ طب میں خاندان عزیزی کا ایک بلند و برتر مقام ہے۔ جب بھی کوئی مؤرخ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرے گا وہ (خاندان عزیزی جس کے بانی حکیم محمد یعقوب تھے اور جو حکیم محمد عبدالعزیز کے نام سے خاندان عزیزی سے منسوب ہوا) خاندان عزیزی کی خدمات کو فراموش نہ کر سکے گا۔

دلی کے بعد لکھنؤ کو ملک کی طبی دنیا میں جو مقام و اہمیت حاصل ہے وہ ملک کے کسی شہر کو حاصل نہیں ہے اور لکھنؤ کے طبی خانوادوں میں جو مرکزیت شہرت و اہمیت خاندان عزیزی کو حاصل ہے وہ مرتبہ کسی دیگر خاندان کو حاصل نہیں ہے۔

عبد اللطیف فلسفی خاندان عزیزی کے آخری نمائندۂ طبیب تھے۔ اگر وہ ایک جانب ظرافت کا نمونہ تھے تو دوسری جانب تحمل، بردباری اور سنجیدگی متانت کا پتلا تھے۔ فن ورزش کے جتنے ماہر تھے اتنے ہی دیگر علوم وفنون میں قابل تھے۔

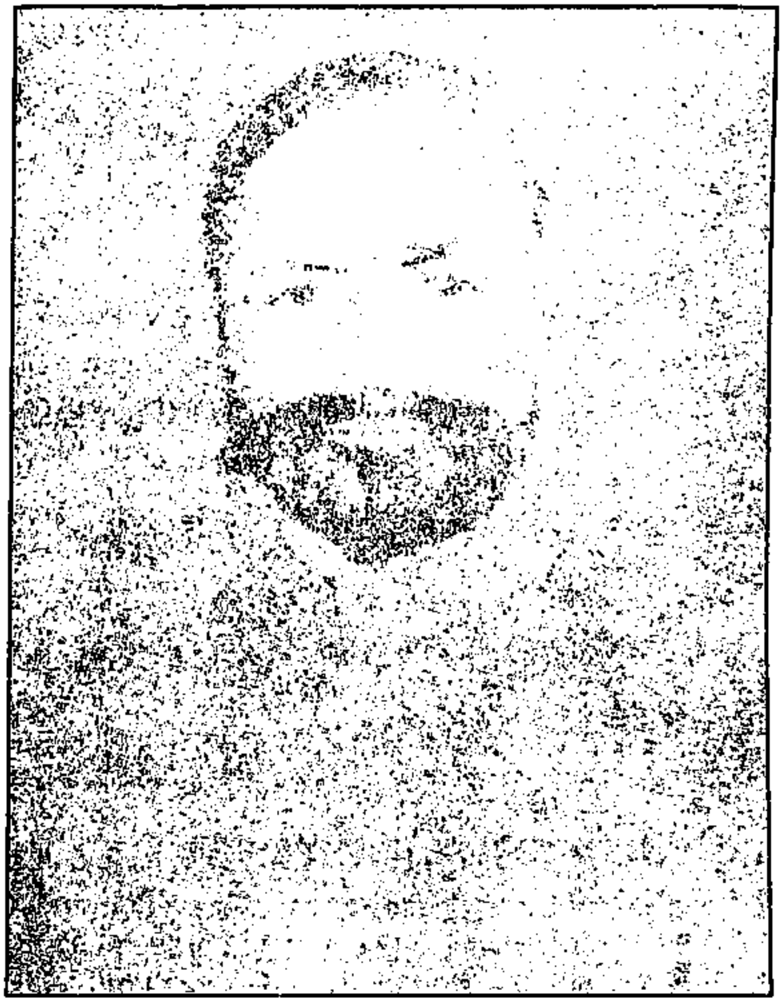

جناب شفاء الملک پروفیسر حکیم عبداللطیف فلسفی پرنسپل

خاندان:

ان کا خاندان جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا مشہور طبی خانوادہ خاندان عزیزی ہے۔ان کے اجداد کشمیر سے ترک وطن کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ان کے والد کا نام حکیم عبدالوحید تھا جو معروف طبیب تھے۔

پیدائش:

عبداللطیف کی پیدائش 10 محرم الحرام 1317ھ مطابق 29 اپریل 1900 بعد نماز جمعہ لکھنؤ میں ہوئی۔مفتی عبداللطیف ان کے والد کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور اپنے وقت کے جید عالم۔ان کے نام نامی واسم گرامی پر خاندان نیز گھر کے دیگر افراد نے ان کا نام بھی تبرکاً عبداللطیف ہی رکھا۔

ابھی 2 سال کی عمر کے ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

تعلیم و تربیت:

والد ماجد کے انتقال کے بعد ان کے چچا حکیم حاجی عبدالعزیز نے جو اپنے وقت کے نہ صرف لائق و فائق طبیب تھے بلکہ طبی درسگاہ تکمیل الطب کے بانی بھی تھے) ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی ان کے والد ماجد حکیم عبدالوحید کا انتقال مرض طاعون جس نے ایک وقت میں صوبہ اودھ نیز متعلقہ اضلاع میں لاکھوں لوگوں کو لقمۂ اجل بنایا تھا میں ایک مریض کو ملا پور دیکھ کر آنے کے بعد ہوا تھا ابھی عم محترم حکیم عبدالعزیز کا سایۂ عاطفت گیارہ سال ہی تھا کہ نئے سرپرست بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔چچا کی وفات کے بعد بڑے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالمعید نے اپنی سرپرستی میں لیا اور تعلیم و تربیت کی جانب متوجہ ہوئے۔

زمانہ کے دستور اور رواج کے مطابق تعلیم کی ابتدا گھر کے علمی و ادبی ماحول سے شروع ہوئی۔لکھنؤ میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا عبدالشکور جو مدرسہ فرقانیہ میں مدرس اعلیٰ بھی تھے ان سے اور شمس العلما مولانا عبدالمجید فرنگی محلی اور مولانا عبدالکریم جو دارالعلوم ندوۃ العلما میں فقہ کے اُستاد اعلیٰ تھے) سے حاصل کی۔پھر اپنے خاندان کی روایات کے برعکس پہلی بار خاندان کے کسی فرد کا بغرض حصول تعلیم وطن مالوف سے باہر کسی شہر کا سفر کیا۔

1914 میں رامپور جا کر مولانا فضل حق خیر آبادی سے درسیات کی تکمیل اور خصوصی طور پر استفادہ کر کے فاضل معقولات کی سند حاصل کی۔

طبی تعلیم:

1917 میں واپس رامپور سے آ کر اور درس نظامی کی تکمیل کے بعد فن طب جو ان کے خاندان کی معراج تھا اس کی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔

1921 میں طبی تعلیم سے فراغت کے بعد جو اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی تھی۔ لکھنؤ میں ہی مستقل مطب کے ساتھ مادر علمی تکمیل الطب میں درس و تدریس کا شغل شروع کیا۔

دیگر علوم:

حکیم عبداللطیف فلسفی کو فنون لطیفہ میں خطاطی موسیقی اور مصوری کے ساتھ ساتھ فن کشتی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور ہر فن کو باقاعدہ اُس فن کے ماہر اور استاد سے حاصل کیا۔ جب طب کی کتاب نبض کی تصنیف و تالیف میں منہمک تھے موسیقی اور نبض کے موضوع پر جب پہنچے تو اپنی موجودہ تعلیم سے مطمئن نہ ہو کر پہلے تو شرح قانون آملی کا مطالعہ کیا وہاں بھی جب تسلی نہ ہوئی تو علی گڑھ میں فن موسیقی کے استاد کامل مولا بخش شاگرد رشید ظہور حسین خاں نانک خواجہ سے دو سال تک فن موسیقی کی مشق کر کے خواجہ محمد اشعیا سے اس فن کی تکمیل کی۔

پھر علی گڑھ میں ہی فن مصوری کی باقاعدہ مشق سجاد صاحب آرٹسٹ مسلم یونیورسٹی سے سیکھی ان کی چند تصاویر آرٹ کا بیش قیمت نمونہ ہیں اور بطور یادگار آج بھی محفوظ ہیں۔

ورزش اور کثرت سے ان کا محبوب شغل رہا تھا۔ دوران قیام رامپور استاد سہراب خان کے شاگرد رشید رہے اور علی گڑھ میں جبکہ یہ درس و تدریس جیسے معزز پیشے سے اور وہ بھی طب کے جیسے فن کے پیشے سے منسلک اور وابستہ ہو گئے تھے۔ فن کشتی کی تکمیل تولا پہلوان اور حفیظ پہلوان سے کی۔ بنوٹ کی تعلیم و تکمیل استاد مصباح الدین رامپوری اور شاہ زدار میاں کے ایک شاگرد سے کی تھی۔

خدمات:

اپنے مادر علمی تکمیل الطب میں درس و تدریس سے جب منسلک ہو گئے تو یہ خدمت 1927

تک وہاں انجام دیتے رہے۔

1927 میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کی بنیاد پڑی تو شفاء الملک، مسیح الملک حکیم اجمل خان نے ان کی ذاتی قابلیت اور علمیت سے متاثر ہو کر حکیم عبداللطیف کا تقرر بحیثیت لیکچرار کے کرایا اور آپ نے 13 اکتوبر 1927 کو طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت استاد کے پروانہ تقرری پایا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ طبیہ کالج کے وائس پرنسپل 1949 میں ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ ایم ڈی بران مشہور امراض چشم کی کتاب کے مصنف مترجم کے رٹائرڈ ہونے کے بعد بحیثیت پرنسپل مقرر ہوئے اور 34 سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے وابستہ رہنے کے بعد 3 ستمبر 1961 کو اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

ہندوستان میں فن طب کے میدان میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو آج جو مرکزیت اور اہمیت حاصل ہے وہ آپ کی ہی دین ہے۔ حکیم عبداللطیف کی سرپرستی میں طبیہ کالج علی گڑھ نے بہت ترقی کی اور ملک کے طبی اداروں میں حسب روایات اس کالج کو درس و تدریس کے میدان میں ایک بلند و ممتاز مرتبہ ملا اور دہلی و لکھنؤ کی طرح آج ہندوستان میں طبیہ کالج کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اس کی بنیادی وجہ جہاں اور بہت سی ہیں وہاں حکومت پر سرپرستی بھی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جہاں علم و ہنر و فن کے قدر دان ہوتے ہیں وہیں فنکار جمع ہو جاتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی میں اس وقت تک میڈیکل کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ فیکلٹی آف میڈیسن کے دوسرے ڈین آپ عرصہ تک رہے۔ حکیم عبداللطیف یونیورسٹی طبیہ کالج کے بہت ذہین اور باصلاحیت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

آپ اپنی ذاتی شخصیت اور پروقار حیثیت کی بنا پر یونیورسٹی اور علی گڑھ میں بہت مقبول ہو گئے تھے جس کی بنا پر بہت سے اہم عہدوں پر رہے آپ کی مصروفیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوگا کہ آپ علی گڑھ مندرجہ ذیل متعدد اہم عہدوں پر عرصہ تک فائز رہے۔

1- لیکچرار طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
2- پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
3- پروفیسر طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

4- ڈین فیکلٹی آف میڈیسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

5- صدر طبی سوسائٹی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

6- ممبر مینجنگ کمیٹی دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

7- ممبر اکیڈمک کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

8- ممبر ایگزیکٹو کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

9- ممبر آف کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

10- ڈائرکٹر آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن۔

11- ٹریزرار جامعہ اردو علی گڑھ۔

12- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جوائنٹ سکریٹری۔

13- ممبر نمائش کمیٹی علی گڑھ۔

14- وائس پریسیڈنٹ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس۔

حکیم صاحب یونیورسٹی کے بہت ہی ذمہ دار فرد تصور کیے جاتے تھے وہ یونیورسٹی کی تمام اہم کمیٹیوں میں شریک ہوتے تھے۔ الیکٹرک کونسل اور کورٹ کی میٹنگوں میں ان کی تقاریر بہت زوردار ہوتی تھیں۔

ملک کے تقریباً تمام طبی تعلیمی اداروں سے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی کا کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق تھا اور وہاں کے معاملات میں ان کے اہم مشوروں کو دخل رہتا تھا۔ طبیہ کالج علی گڑھ کے علاوہ آپ تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر معتمد اعزازی اور آخر میں صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ آیورویدک کالج قرول باغ دہلی کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر پٹنہ طبیہ کالج کی مجلس مشاورات کے ممبر، جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل، جامعہ طبیہ دیوبند کی مجلس طبی کے صدر، نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے سلسلے میں قائم کردہ ملکوٹے کمیٹی کے ممبر بھی رہے تھے سری نگر (کشمیر) میں طبیہ کالج کا قیام آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا1958 میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی جانب سے مقرر کردہ نصاب کمیٹی کے کنوینر کے ساتھ ساتھ یونانی ایڈوائزری کمیٹی، پلاننگ کمیٹی فارماکوپیا کمیٹی، سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن، سینٹرل کونسل فار ریسرچ آف

یونانی میڈیسن اور ہومیوپیتھی کی گورننگ اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اور اتر پردیش پبلک سروس کمیشن کی تقرراتی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

سرکاری سطح پر ہمیشہ حکیم صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔1940 میں حکومت برطانیہ نے آپ کو ''شفاء الملک'' جیسے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

شفاء الملک کے خطاب پر ملک کے طبی و ادبی حلقوں میں نہایت مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ادارہ طبیہ کالج میگزین علی گڑھ نے اپریل 1941 مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارکباد پیش کی تھی۔

''ہم بصد فخر و مباہات، مبدع قوانین شفا مخترع آئین دوا، مجمع ملکات قدوسی، منبع معالجات جالینوس، عالی جانا شفاء الملک حکیم محمد عبد اللطیف صاحب فلسفی کی خدمت گرامی میں موصوف کے اعزازی خطاب پر پُر خلوص ہدیہ تبرک پیش کرتے ہیں۔''

اعزازی طبیب صدر جمہوریہ ہند:

حکیم عبد اللطیف فلسفی کی گوناگوں مصروفیات و خدمات اور طبی لیاقت اور حذاقت کی بنا پر حکومت ہند نے ان کو صدر مملکت جیسے معزز عہدے کا دوبار طبیب خاص مقرر کیا۔

ایک بار ان کے قریبی رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین سابق وائس چانسلر کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر ان کا دوسری بار صدر جمہوریہ عزت مآب وی۔وی گری کا معالج خاص مقرر کیا۔

حکیم سید شاہ علی بدایونی کراچی شہید نے ان کو مندرجہ ذیل اشعار میں تہنیت پیش کی۔

صدر بھارت نے طبیب اپنا بنا کے آپ کو　　طب یونانی کی گویا سرپرستی کی قبول
اس کو کہتے ہیں خداوند عالم کا کرم　　اس توجہ کی مبارک آپ کو شان نزول

اس کے ساتھ ساتھ متعدد ادبا و شعرا نے ان کو مبارکبادیں پیش کی تھیں جن میں چند خاص خاص اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول حکیم یوسف صدیقی یوسف کے۔

بہار خوشی گلشن طب میں آئی　　بنے گل چمن میں کلی مسکرائی
صدا دی یہ بلبل کے شاخ چمن پر　　جگہ فلسفی نے حکومت میں پائی

مبارک ہو اے ماہر فن حکمت خدا کے کرم سے ملی ہے یہ عظمت
طبابت نہ کیوں آپ پر ہو نازاں
جو ہاتھوں میں ہے نبض صدر حکومت

مشہور شاعر محمد میاں افضل کے اشعار جو انھوں نے حکیم عبداللطیف فلسفی کی خدمت میں پیش کیے۔

خدا داد ذہن رسا تم نے پایا ہر اک گام پر مرتبہ تم نے پایا
تمھیں اک عہدہ ملا شان والد مفاد ہنر برملا تم نے پایا

شفاء الملک مرحوم اطبا قدیم کی روایات اور فنی عظمت کا بے مثل نمونہ تھے قدیم سائنسی موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور فن طب کے ذخیرہ پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ ملک کے صنعتی مسئلہ کو طب یونانی کے ذریعہ حل ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ ان کا کوئی وقت ذاتی یا گھر کے لیے نہیں تھا۔ وہ ہر لمحہ علمی مباحثہ، تعلیمی معاملات اور طب کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے مصروف رہتے تھے۔ وہ نہ صرف قدیم بقراطی طب کے علمبردار تھے بلکہ انھوں نے فن نسخہ نویسی کو بام عروج پر پہنچایا۔ مریض کے جملہ حالات اور مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے مفردات پر مشتمل نسخہ تجویز کرنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

تصانیف:

آپ کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جن میں ادبی مذہبی اور طبی ہیں۔

آپ کے مقالات میگزین طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دیگر طبی رسائل میں شائع ہوتے رہے آپ کے اکثر مضامین ''تجدید طب'' کے موضوع یا ''طب میں ریسرچ'' کے موضوعات پر شائع ہوتے رہے تھے۔ طبی کانفرنسوں کے لیے آپ نے خطبات بھی لکھے ہیں۔ جو طبی تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

حکیم صاحب کی کاوشوں سے طبیہ کالج علی گڑھ سے 1932 سے ایک ماہنامہ میگزین کا اجرا ہوا جو جلد ہی سہ ماہی رسالہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس رسالہ کا مدیر کوئی استاد ہوتا تھا۔ 1940 میں اس رسالہ میں طلبا کو بھی شامل کیا گیا 1942 میں اس میگزین کو طبی سوسائٹی کے سپرد کیا گیا اور رسالہ کا

نام طبی سوسائٹی میگزین رکھا گیا۔ مقالات وخطبات کانفرنس کے علاوہ آپ نے طبی کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

طبی تصانیف:

1- تاریخ طب

2- ہماری سائنٹیفک طب یونانی۔

3- تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال۔

4- الحقیق المطلوب فی الماء المشرب۔

5- طبی ڈائری۔

6- مختصر تاریخ قدیم تشریح۔ منافع الاعضا وعلم الجراحت۔

7- ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا۔

8- طب اور سائنس۔

9- نبض

10- ترجمہ وشرح ادویہ قلبیہ مصنف شیخ بوعلی سینا۔

مذہبی تصانیف اور مذہبی رجحانات:

چونکہ حکیم صاحب گہرے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے اور ان کی مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ قرآن اور حدیث کا مطالعہ آخر عرصہ تک رہا ان مذہبی معلومات کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو جائے گا۔

مشہور ناقد اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی پر ایک تبصرہ مولانا کے داماد اور بھانجے حکیم عبدالقوی دریا آبادی کے اب کے صدق جدید میں حکیم صاحب کے تبصرہ میں مولانا نے پوری وسعت قلبی سے حاشیہ میں ان کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح مولانا منظور نعمانی نے جن تاثرات کا اظہار ہے وہ درک حدیث میں ان کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔

''اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ کبھی کبھی قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث

کے بارے میں تحریری مراسلات بھی فرماتے مولانا منظور نعمانی کی تالیف معارف الحدیث کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور مولانا حکیم صاحب کی خدمت میں ہدیتاً ان کو بھیجتے تو حکیم صاحب اس کتاب کا ہفتہ عشرہ میں ہی مطالعہ کر لیتے اور اس طرح مطالعہ کرتے کہ کتابت وطباعت کی غلطیوں کی جانب بھی متوجہ کر دیتے تھے تاکہ آئندہ کتابت وطباعت کی غلطیوں کا تدارک کیا جاسکے۔

صوم وصلوٰۃ اور وظائف کا اہتمام فرماتے تھے۔ پہلے حضرت میاں سید اصغر حسین سے بیعت ہوئے بعد ان کے انتقال کے مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی دیوبندی اور انتقال سے چند سال قبل مولانا شاہ وصی اللہ الہ آباد سے بیعت ہو گئے تھے۔

یہی بنا تھی کہ خالص طبی حیثیت سے معروف ہونے کے بعد بھی مولانا کا مذہب میں عمل دخل بہت تھا اور ساتھ میں مذہبی معلومات بھی۔

مندرجہ ذیل مذہبی تصانیف ہیں۔

1- فلسفۂ نبوت۔

2- راضیہ مرضیہ۔

3- مذہب اور لامذہبیت۔

اس کے ساتھ ساتھ طبی تحقیقات اور ریسرچ کے خیال سے آپ نے کتب خانے میں متعدد اضافہ کیا۔ اکثر نادر و نایاب طبی کتب آپ ہی کی کوشش سے طبیہ کالج میں فراہم ہوئیں اور یہ کتب خانہ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے ایک قابل قدر کتب خانہ بن گیا۔

65 سال کی عمر میں بھی آپ کی صحت قابل رشک تھی۔ بقول خود حکیم عبداللطیف کے۔

''اس زمانے میں شانوں اور بازؤں میں لعاب خوب تیاری پر تھا۔''

اور یہ صحت کا کرشمہ ان کی صحت اور ذوق وشوق وجذبہ سے نمایاں تھا۔ نمائش دنگل علی گڑھ کے وہ ہمیشہ جج ہوتے تھے۔ 1945 میں علی گڑھ کی نمائش میں جرمن کے مشہور پہلوان زبکو اور رستم زماں گاما پہلوان کی نمائش گراؤنڈ میں جو تاریخی کشتی ہوتی تھی اور اس کشتی میں بھولو پہلوان کا نمائندہ گاما اس جرمن پہلوان سے ایک گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد جیتا تھا اس تاریخ ساز کشتی کے

بھی صاحب جج تھے۔

چونکہ آپ طب اور فلسفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور آپ کا ہر مضمون و لیکچر طبی فلسفہ میں ڈوبا ہوتا تھا۔ اسی بنا پر آپ فلسفی کے خطاب سے معروف ہوئے۔

وفات:

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی 1961 میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد 1965 میں جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے یہیں پر آپ پر قلبی امراض شروع ہوئے۔ جس کی بنا پر مستعفی ہو کر اپنے وطن لکھنؤ پہنچے اور اپنا آبائی و اجدادی مطب جھوائی ٹولہ سنبھالا۔ اسی دوران مرض نے غلبہ کیا اور بالآخر یہ آفتاب علم 13 یا 14 نومبر 1970 مطابق 12-13 رمضان 1390ھ کی درمیانی شب میں اپنی گردش حیات پوری کر کے دامن لکھنؤ میں غروب ہوا۔

ان کے انتقال کے بعد دنیائے طب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ شعراء و ادباء و اطباء نے اپنے اپنے طرز پر نذرانۂ عقیدت پیش کیے۔

قطعات تاریخ وفات

از حکیم نور العین حسن راغب۔

عبد اللطیف فخر اطبائے روزگار ۔۔۔ نازاں تھا جن کی ذات پہ ہر جوہر وکمال

استاد طب مصنف و ذخار فلسفی ۔۔۔ جوہر کمال فن میں تھے یکتا و بے مثال

افسوس وہ طبیب کہ شیخ الرئیس وقت ۔۔۔ دار بقا کو کر گئے ناگاہ انتقال

راغب سن وفات یہ ایمائے غیب ہے ۔۔۔ عبد اللطیف واصل درگاہ ذوالکمال

حکمت پناہ وقت حذاقت مآب عصر

روپوش گشت حیف چو امروز زیر خاک

تاریخ انتقال بگو راغب حزیں

عبد اللطیف شد بجواز خدائے پاک

1390ھ

حکیم نثار احمد علوی نے کراچی سے مندرجہ ذیل اشعار بطور قطعات کہے۔

پھٹ پڑا سلسلۂ کوہ گراں ہے اے دوست
کہ نہ دل ہے نہ جگر اور نہ جان ہے اے دوست
شیخ دوراں وہ لطیف آہ کہاں ہے اے دوست
مضطرب خلق ہے جب سے وہ نہاں ہے اے دوست
ہیں پریشان ہر اک شہر مریضوں کے گروہ
جس کی چٹکی میں شفا تھی وہ کہاں ہے اے دوست
اب وہی رونق بزم اور گراں ہے اے دوست
اٹھ گیا ہائے جو تھا ہند میں رازی کی مثال
کون عالم میں نہیں گریہ کناں ہے اے دوست
مسند علم سے خالی ہے جھوائی ٹولہ
ایسا پردے میں گیا شیخ زماں ہے اے دوست
سر سے شاگردوں کے سایہ جو اٹھا کہ اُن کا
زندگی ان کے نئے بار گراں ہے اے دوست

پسماندگان وشاگرد رشید:

حکیم صاحب کی شادی 1917 میں ان کی منجھلی خالہ کی چھوٹی صاحبزادی رضیہ بیگم بنت منشی سید محمود حسین سے ہوئی تھی۔

ایک صاحبزادہ احمد سعید اور دو صاحبزادیاں حمیرہ بیگم اور شاہدہ بیگم ان کی یادگار ہیں۔

اور شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو آج بھی ملک کے مختلف مقامات پر متعدد اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

طبی معرکے:

حکیم عبداللطیف کے علاج و معالجہ طبی مشاہدات اور تجربات پر کئی کتب ان کے شاگردوں نے سپرد قلم کی ہیں۔ لیکن چند ایسے واقعات جو مخفی اور تاریخی ہیں ذیل میں تحریر ہیں۔

(1) ایک بار ایک نواب صاحب کی دختر حکیم صاحب کے مطب میں تشریف لائیں۔ ان کے پیر میں ایک سفید داغ تھا حکیم صاحب نے جن کا مطب مرجع خاص و عام تھا ان دختر نواب صاحب کو برص تجویز کر کے مندرجہ ذیل نسخہ لکھوایا۔

باؤچی سرسو کہ ہلیلہ سیاہ، گل حنا، گل نیم، چوب چینی، ہر ایک 6 ماشہ کوٹ کر رات کو گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح مل چھان کر 2 تولہ خالص شہد ملا کر پلائیں اور اک لیپ۔ (ضماد)

باؤچی ہارسنگھار کی ڈنڈی، سرمہ اصفہانی، تخم پنواڑ، کبریت، عاقر قرحا، ہم وزن باریک کر کے سرکۂ خالص میں پیس کر کے ضماد تیار کریں اور داغ پر کئی بار ملیں۔

تقریباً دو ڈھائی مہینہ یہی نسخہ استعمال میں رہا۔ پھر مریضہ نے مطب میں آ کر بتایا کہ اب طبیعت میں بوجھ اور کسل نہیں ہے اور سفید داغ مٹ کر جلد کے مشابہ ہو گیا ہے۔

ایک مرتبہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب اپنے بچہ کو لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ نہ صرف شہر بلکہ بیرون شہر کے ڈاکٹروں کو بھی دکھا چکے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب ڈاکٹروں نے آخری علاج آپریشن تجویز کیا ہے۔

حکیم صاحب نے پروفیسر صاحب کے اس پانچ سالہ بچہ کا بغور معائنہ کیا اور مطب میں موجود شاگردوں کو بھی بچے کو دکھا کر ورم نورتن (ٹانسلز) تجویز کیا۔ اور مندرجہ ذیل نسخہ لکھایا۔

لعوق خیارشنبر 5-5 ماشہ دن میں کئی بار چٹائیں اور مغز املتاس 5 تولہ کو پانی میں اتنا پکائیں کہ ½ پاؤ پانی رہ جائے۔ اب پھر 20 تولہ اس پکائے ہوئے پانی میں 20 تولہ دودھ ڈال دیں اور اتنا پکائیں کہ سب 15 تولہ رہ جائے یعنی سب کا نصف اب اس چھانی ہوئی دوا سے غرارہ کرائیں۔ پروفیسر صاحب کو یہ نسخہ ایک ماہ استعمال کرانے کی ہدایت کی۔

پروفیسر صاحب جاتے جاتے پوچھنے لگے کہ حکیم صاحب ٹھیک ہو جائے گا؟ میں ماہر گلہ کو بچہ کو دکھا چکا ہوں۔ حکیم صاحب نے تسلی اور تشفی دینے کے بعد کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا۔

انشاء اللہ لفظ کی برکت حکیم صاحب کے ہاتھ میں دست شفا اور نسخہ کی معقولیت کہ ایک ماہ میں بچہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

پدم شری حکیم ہمدرد 1908

حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی

بھارت میں کاروانِ طب کا سپہ سالار

آج ہندوستان میں طب یونانی کی اہمیت اور افادیت۔ گہرائی اور گیرائی سے، اگر کوئی واقف ہے تو وہ طب یونانی کی گراں مایہ۔ گراں قدر مایۂ ناز ہستی حکیم عبدالحمید سے بھی واقف ہوگا۔

تاریخ طب میں جس طرح نامی گرامی ہستیاں قابل قدر شخصیتیں، معروف حکما، مشہور اطبا ہوتے ہیں اور آج ہمیں ان کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ سوچنے اور خیال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ایسے بھی تھے۔ کیسے ہوں گے یہ ذی علم؟

ایسے لاتعداد سوالوں کے جواب میں موجودہ دور کے صرف ایک فرد کو سامنے اگر کر دیا جائے تو انسانی ذہن خود بخود یہ حقیقت سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔

حکیم حاجی عبدالحمید کی ذات گرامی ایسی ہی ہے جیسی تاریخ کے اوراق میں قصہ پارینہ بن چکی ہوتی۔ تاریخ حکیم عبدالحمید فرد واحد ہے مگر اپنی ذات میں ایک انجمن۔

تاریخ میں ایسی بہت کم ہستیاں ہوئی ہیں جن کو ان کی حیات ہی میں شہرت ابدی مل گئی ہو۔

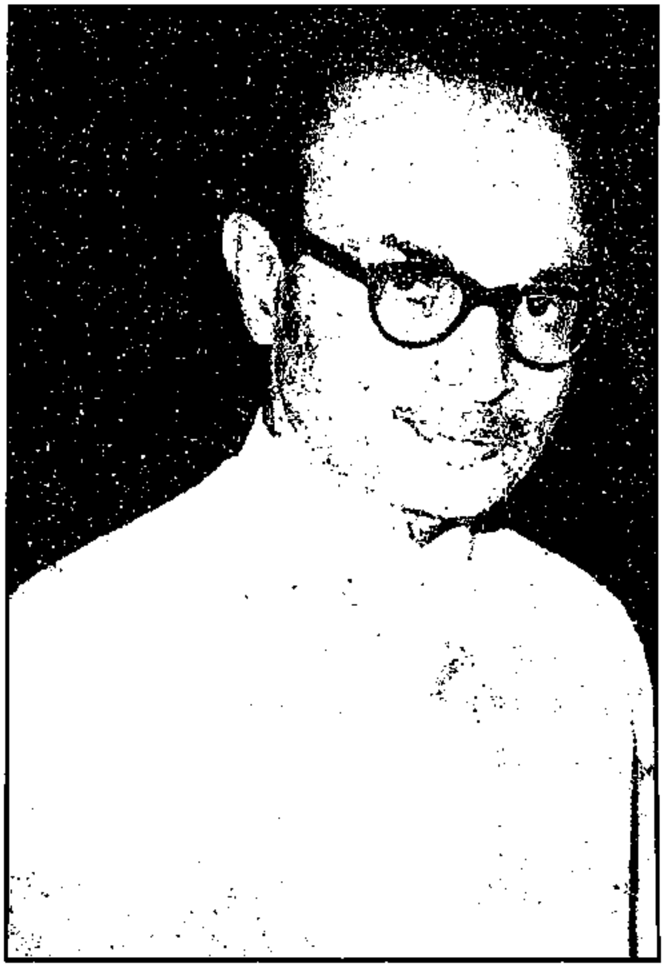

الحاج حکیم عبدالحمیدؔ صاحب

حکیم عبدالحمید بھی ان کمیاب ہستیوں میں ایک ہستی ہے جس نے صلہ وستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہوکر طب یونانی اور ہندوستان کے غربا کی خدمت کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔

ماضی کے بقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس، بوعلی سینا اور رازی کی مشترکہ مساعی جمیلہ کی اگر کوئی شکل بنتی تو وہ حکیم عبدالحمید کی محنت اور کوششوں کا مجموعہ ہوتی۔

ہندوستان میں طب یونانی کو زندہ و پائندہ رکھنے والا اگر کوئی فرد ہے تو وہ حکیم حاجی عبدالحمید کی شکل میں موجود ہے۔

خاندان:

حکیم عبدالحمید صاحب کے اجداد چینی ترکستان کے مشہور شہر کاشغر سے سترھویں صدی کے شروع میں ترک وطن کر کے پشاور شہر کو انتقال کیا۔ یہ مہاجرین اجداد تجار تھے۔

وطن اول بھی ترکستان چین اور کاشغر میں ان کے آبا و اجداد کا فن معاش اون اور قالین سازی تھا۔ کچھ افراد خاندان کپڑوں کی تجارت سے بھی وابستہ تھے۔ پشاور میں ان کے خاندان کے بزرگوں کا قیام قریب قریب پون صدی سے زیادہ رہا۔ جس میں بزرگ قدیمی روایات اور پیشہ سے منسلک رہے اور کچھ نے پیشہ خشک فروٹ کی خرید و فروخت کا اختیار کر لیا تھا تو کچھ پنساری یا دیگر کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد ایک لمبے وقفے تک یہ بزرگ ملتان میں بھی مقیم رہے تھے۔

حکیم عبدالحمید کے پردادا نے صوبۂ ملتان اور پنجاب میں سیاسی تغیرات اور اتھل پتھل کے بعد اٹھارھویں صدی کی دوسری دہائی کے قریب فکر معاش اور استحکام معاش کی تلاش میں ہندوستان کی سلطنت دہلی کا رخ کیا اور دارالسلطنت دہلی کے محلہ حوض قاضی جیسے تاریخی مقام میں فن عطاری اور پنساری ہٹا کی دکانوں سے خورد و نوش کا انتظام کرنا شروع کیا۔ ہنگامۂ غدر کی آمد آمد کی خبر سن کر مورث اعلیٰ پانی پت منتقل ہو گئے جہاں حکیم عبدالحمید کے دادا حافظ شیخ رحیم بخش کی پیدائش 1864 میں اور نانا شیخ کریم بخش کی پیدائش 1861 میں ہوئی۔ حسن اتفاق دونوں عزیز برادر تھے۔ شوق سیاحی اور جہاں گردی کے سبب شیخ رحیم بخش اودھ کے شہر پیلی بھیت منتقل ہو گئے ذریعہ اور سلسلۂ نسب کے لیے ایک بزرگ کے خاندان اور کاروبار سے منسلک ہو گئے۔

یہیں ان کے والد بزرگوار حکیم عبد المجید اور چچا حافظ عبد الرشید کی ولادت باسعادت بالترتیب 1883 اور 1886 کو ہوئی۔

اور کچھ عرصہ کے بعد ادادا اپنی اولادوں کے ساتھ مسکن قدیم حوض قاضی میں آکر مقیم ہو گئے ان کے والد کی تعلیم و تربیت ہونے لگی یہیں انھوں نے فن عطاری اور دوا سازی کی تربیت حکیم اجمل خاں کے ادارہ ہندستانی دواخانہ میں حاصل کیں اور دواخانہ کو ایک نئی شکل انجام دیں۔ اس دواخانہ میں ان کے والد کو طب کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا وقت ملا اور بعد میں ایک نیا حوصلہ امنگ اور جوش لے کر اپنی تمام دیانت داریوں اور ایمانداریوں کی عظمتوں کے ساتھ ہندستانی دواخانہ سے الگ ہو کر ایک عظیم کام کے لیے سینہ سپر ہو کر حوض قاضی میں ایک چند فٹ کی دکان میں دواخانہ کا کام عطاری سے شروع کیا۔

پیدائش:

عبد الحمید کی پیدائش بمقام دہلی 14 ستمبر 1908 مطابق 17 شعبان 1366 ھ کو ایک نہایت ماہر و کامل خاندان طب جس کی رگ رگ میں فن طب کا خون رواں دواں تھا آنکھ کھولی اور پروان چڑھتے چڑھتے فن عطاری کے رموز و نکات سے واقف ہو گئے۔ کیونکہ آنکھ کھولتے ہی والد کی ہدایت اور دین کی رغبت کی بنا پر فن میں کامل دستگاہ حاصل کر لی تھی۔

تعلیم و تربیت:

بچپن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور شوق و لگن کے بعد ابھی سن بلوغت کی جانب قدم اٹھا ہی رہے تھے ناگاہ 13 اور 14 سال کی عمر کے درمیان والد ماجد داغ مفارقت دے گئے اور ذمہ داریوں کا بوجھ ناتواں کاندھوں پر آن پڑا۔

آپ نے طبیہ کالج دہلی سے بقول جلال الدین فرزند علامہ حکیم کبیر الدین مرحوم خصوصی شفقت اور مہربانی شیوخ طب حکیم محمد کبیر الدین صدر الاطبا حکیم محمد الیاس خاں و حکیم فضل الرحمٰن کی خصوصی مہربانی سے سند طب حاصل کی۔

خدمات:

دستور زمانہ ہے کہ ہر بڑی ہستی خادم کے بعد مخدوم کے درجۂ کمال کو جا پہنچتی ہے لیکن

عبدالحمید کی ذات صفات پر یہ کایہ صادق نہیں آتا ہے لیکن آج بھی پیرانہ سالی کے باوجود وہ مجسم خدمات کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

80 سال سے زائد عمر کے باوجود جس تندہی۔ جانفشانی، محنت، لگن اور سب سے بڑھ کر پابندیٔ وقت سے اپنے دن کے تمام کے تمام کام کاج انجام دیتے ہیں وہ قابل رشک ہے۔

صحتی اخلاقی، تمدنی اور فنی نقطۂ نظر سے آپ نے جہاں بے شمار خدمات انجام دی ہیں وہاں پابندی وقت سے 1930 سے دہلی میں مطب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جاڑا، گرمی بہار اور موسم برسات غرضیکہ کوئی بھی موسم ہو آپ اپنے وقت معینہ پر دواخانہ ایسے حاضر ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے آنے جانے پر اپنی گھڑی کو ملا لیتے ہیں۔

ان کی پرورش و پرداخت میں ماں کی تعلیم وتربیت کا بڑا دخل تھا۔ ماں کی خدمت اور محبت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج ان کی محنت کا ثمرہ بشکل ہمدرد موجود ہے۔

ہمدرد آج نہ صرف طب کی دنیا میں بلکہ علاج و معالجہ کے میدان میں ایک معتبر و منفرد نام ہے اور حکیم صاحب موصوف تمام ملازمین ہمدرد کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے اور ان کی تمام مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ ہمدرد کی تعمیر اور محنت و دیانتداری کو اپنا فریضہ سمجھا اور یہ ہی وجہ ہے کہ فن دواسازی میں ہمدرد نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک میں اپنا ایک باوقار مقام حاصل کیے ہوئے ہے اور یہ فخر حاصل ہے کہ اس ادارے میں عمدہ خالص اور اصلی ادویات تلاش وجستجو کے بعد تیار کی جاتی ہیں۔

حکیم عبدالحمید آج فن کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

ان کو اس مقام پر پہنچانے میں چند معاونین نے ہاتھ تو بٹایا لیکن اپنی کوشش، عمل پیہم زیادہ معاون رہی۔ والد بزرگوار کے گزرتے ہی حکیم عبدالحمید نے مسلسل محنت بھرپور توجہ، وقت کی پابندی اور سب سے بڑھ کر خوش اخلاقی کی بدولت ہمدرد دواخانہ کو ملک میں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ طب یونانی آج ہمدرد کی ذات سے پہچانی جاتی ہے۔

اس درمیان کاروبار اور فن طب پر کئی بار زوال آیا لیکن مسلسل جانفشانی اور مستقل جدوجہد کی بنا پر فن اور دواخانہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا۔ ان کے بھائی حکیم محمد سعید ان کے بارے میں ایک مقام پر

لکھتے ہیں کہ

> تعلیم طبی ختم کر کے اور فراغت پا کر بھائی جان نے ہمدرد کی باگ ڈور سنبھال لی اور وہ ابا جان کے لگائے ہوئے پودے کو اب پھل دار درخت بنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اس حقیقت کا اظہار بے حد ضروری ہے بھائی جان کو بچپن سے ہوش سنبھالنے تک اور بڑے ہونے تک کھیل کود کے مواقع میسر نہیں آئے۔ انھوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماحول کو علمی پایا اور ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے ہاتھ میں کتاب وقلم پکڑ لیا۔

حکیم عبدالحمید کی زندگی سب کے سامنے ہے ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کتاب وقلم ہی دیکھے گئے ہیں شاید ہی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہوں اور اگر ایسی مثالیں موجود بھی ہوں گی تو صرف اولیاء اللہ ہی کی مثالیں ہوں گی۔ جب بھی غور کیا جاتا ہے کہ کیا ایک کاروباری انسان کی زندگی کا آغاز کتب وقلم سے بھی ہوسکتا ہے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب ایک کاروباری ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن مالک کونین کی طرف سے ایک فطری دل، حساس طبیعت اور نرم گفتار مزاج کے فرد بنے۔

کاروبار کو وسعت دینے اور جسم انسانی کو مرض سے بچانے کے لیے انھوں نے 1932 میں ایک رسالہ ''ہمدرد صحت'' جاری کیا جس کے خاص نمبر جو جولائی میں منظر عام پر آتے تھے۔ ہر خاص وعام کی توجہ اور مرضا وامراض کے بیش بہا خزانے سے پر ہوتے تھے۔ مدیر اول حکیم خواجہ نیاز احمد جوان کے دست راست تھے مقرر ہوئے پھر یہ ادارت کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر ڈال لی۔ بعد اس کے 1937 سے حکیم محمد سعید برادر خورد مدیر مقرر ہوئے جو تقسیم ملک سے قبل تک رہے۔ 1947 کے ہنگامے میں عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لیے بند رہا پھر برادر خورد حکیم محمد سعید کی مہربانیوں اور کوششوں سے 1948 سے کراچی سے دوبارہ اجرا ہو جو آج تک مسلسل پابندی وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

کاروبار کو وسعت دینے اور دیگر ممالک میں طب ورفتار طب کا جائزہ لینے کے لیے انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ 1952 میں جنوب مشرقی ایشیا کا سفر ایک دیگر رفقا ڈاکٹر برکات احمد کے

ساتھ کیا۔ اس دورے میں مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش، رنگون، بنکاک، انڈونیشیا وغیرہ میں دیسی طبوں کی ترقی کا جائزہ لیا۔ یہ سفر کوئی دو ماہ کے وقفہ کا رہا۔

اس کے بعد 1956 میں قریب ڈھائی ماہ کے طویل عرصہ تک کا ایک سفر یورپ کے مندرجہ ذیل ملکوں کا کیا۔

ترکی، انگلستان، فرانس، اسپین، جرمنی، ہالینڈ، سوئزرلینڈ وغیرہ کا گھومنے اور سیاحت کرنے کا حکیم عبدالحمید کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا کہ طب اور سائنس کی دنیا میں مغرب نے کس حد تک ترقی اور پیش رفت کی ہے۔ فن صدلہ یا دوا سازی میں کیا اصلاحی اور انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ارباب علم و دانش و ادب کس انداز اور نہج سے کام کر رہے ہیں۔ مذہبی حیثیت کی حامل مقامات کی کیا اہمیت ہے وغیرہ وغیرہ۔

سفر سے لوٹتے ہی حکیم صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اتنے بڑے وعظیم ادارہ کو ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ یہ خدمت ہی حکیم صاحب کی اتنی بڑی وگراں قدر خدمت تھی کہ حکیم صاحب کا یہی کارنامہ ان کو حیات جاودانی بخشنے کے لیے کافی تھا۔

مندرجہ بالا اسفار سے حکیم صاحب نے طب کو نئی شکل اور ایک نیا بانکپن عطا کرنے کا عہد کیا۔ تاریخ موجود ہے کہ اتنے بڑے بڑے پروجیکٹ اور پروگرام کسی ایک فرد واحد کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں اور کسی نے آج تک وہ کام نہ کیے جو اُن کی اکیلی ذات جیلہ سے ہوگیا ہے۔

1- ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن:

حکیم صاحب نے اپنے ادارے ہمدرد کی جانب سے انجینئرنگ کی۔ جہاں سے طب ادب اور نمایاں واعلیٰ تعلیم کے مقاصد کے لیے وظائف دیے جاتے ہیں۔ یہ 1964 میں بنا۔

2- ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم:

جہاں سے ہندوستان کے لاعلاج مرضا کی تجویز وتشخیص اور اسپتال میں بھرتی ہوکر آپریشن واکیوپنکچر کے ستائے ہوئے مریض علاج کراتے ہیں

اس نرسنگ ہوم میں لاتعداد ایم۔ ایس۔ وایف آر سی ایس ڈاکٹر حکیم صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

3- غالب اکادمی:

جہاں اردو ادب کے تحقیقی اور بنیادی کام انجام دیے جاتے ہیں۔

4- ہمدرد کالج آف فارمیسی:

اس کالج سے جدید تعلیم سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔

5- ہمدرد طبی کالج:

جہاں سے طبی تعلیم کی ترویج اور اشاعت ہوتی ہے اس کالج کے سند یافتہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دیگر ممالک تک میں ہیں۔

6- مجیدیہ گرلس اسکول:

جہاں سے ابتدائی تعلیم سے لے کر اونچے درجات تک کی تعلیم شعبۂ نسواں کے تحت دی جاتی ہے۔

7- ہمدرد پبلک اسکول:

جہاں سے بچے انگریزی ماحول میں پڑھ کر ملک وقوم کی خدمت کے لیے جاتے ہیں۔

8- مجیدیہ اسپتال:

جدید طریقۂ علاج کے لیے بھی حکیم عبدالحمید صاحب نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اسپتال اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

9- ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی:

جہاں سے تعلیمی مسائل سے متعلق بیش بہا خدمات انجام دی جارہی ہیں۔

10- انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز:

1957 میں حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ شعبہ تغلق آباد میں کھولا تھا جو تیس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر اسلامی ادب اور اسلامی مسائل سے متعلق جتنا مواد حکیم صاحب نے فراہم کر دیا ہے شاید پورے خطۂ ایشیا میں نہیں ہے۔ یہاں پر برابر سیمنار اور سمپوزیم ہوتے رہتے ہیں۔

11 - انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ:

یہ ادارہ جس کا مخفف آئی۔ایچ۔ایم۔آر۔ہے۔اس کی بنیاد اور رسم افتتاح ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں 1962 میں ہوا۔یہ شعبہ اور اس کے کارکنان خصوصاً مسٹر حبیب احمد خاں صاحب بڑی مستعدی سے فن طب اور محققین کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے برادر خورد حکیم سعید نے اس خدمت کے بعد حکیم صاحب کو داد تحسین دیتے ہوئے کہا ہے:

> ''ماضی میں اور آج بھی دنیائے اسلام میں بڑے عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں افراط وتفریط کی کم از کم دو جماعتوں نے اپنی اپنی راہوں کا تعین کیا ہے۔ایک جماعت ان علما کی ہے جو دنیا پرست ہیں اور متعصب اور علم سے بہت دور۔یہ وہ ارباب مذہب ہیں جو اپنی ہوا پرستی یا تعصب و جہالت سے خود مذہب کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔دوسری جماعت وہ ہے جو ان کے مد مقابل ہے اور داعی تحقیق و اجتہاد فکر ہے۔یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے علم و حکمت، دانش مندی، مذہب عقلی کے نام پر الحاد وانکار کا شور برپا کیا ہوا ہے۔اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ ممبر ومحراب میں اخلاق و اخلاص۔اصحاب صدق وصفا اور ارباب فکر ونظر الگ کھڑے ہیں............
>
> بھائی جان حکیم عبدالحمید کے بارے میں یقین اور دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شمار ارباب صدق وصفا میں ہے۔وہ بے نیاز دنیا اور نیاز مند حق ہیں۔وہ اپنے بوریائے فقر پر قانع ہیں اور اسی قناعت کے ساتھ علم و حکمت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ان کی جھولی میں حق وصداقت کا بیج ہے جسے انھوں نے تغلق آباد کی سرزمین پر ڈال دیا ہے اور وہ اب اپنی فصل کی کاشت خود کرلیں گے۔''

آج نئی دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد نگر اراولی پہاڑ کی پُر پیچ وادیوں کو کاٹ چھانٹ کر جس طرح بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے علم وفن وہنر کا ایک شہر بسا دیا ہے۔

اس ہمدرد نگر میں ایسی ایسی بلند وبالا عمارتیں جس طرح ایک فرد واحد کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ بقول خواجہ حسن ثانی نظامی:

> ''شاہ جہاں نے اپنی آمدنی کا جتنا حصہ عمارتیں بنانے میں صرف کیا ہوگا حکیم صاحب نے اس سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ مگر حکیم صاحب نہ تو کسی ملک کے مطلق العنان بادشاہ ہیں کہ رعایا کی کمائی بے حساب آئے اور بے حساب خرچ کی جائے اور نہ انھیں اس طرح کا ذوق ہے کہ محل قلعہ اور مقبرے بنواتے پھریں تاہم انھوں نے اپنی محنت کی اور حق حلال کی کمائی کو عمارتیں بنوانے میں بے دریغ خرچ کیا۔ نئے زمانے کی دتی میں کسی فرد کو شاہ جہاں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ حکیم صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

اعزازات:

حکیم عبدالحمید صاحب نے سب کچھ قوم اور ملک وملت کے لیے کیا ہے۔ اپنے لیے کچھ نہیں رکھا اور کہا

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ موجودہ ہمدرد دواخانے کا لائیسنس بھی حکیم صاحب نے دوسروں کے نام بنوادیا ہے۔

حکیم صاحب اب زندگی کے اس موڑ پر جا پہنچے ہیں۔ جہاں نہ تو صلہ کی تمنا ہے اور نہ ہی ستائش کی پرواہ ہے۔

وہ ہندوستان کی متعدد انجمنوں، تعلیم گاہوں، سماجی، ثقافتی طبی اور ادبی سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے صدر چیئرمین اور ممبر ہیں۔

اپنی ان تعلیمی وطبی خدمات کے عوض حکومت ہند نے ان کو 1965 میں پدم شری جیسے خطاب اور اعزاز سے نوازا اور یہی نہیں ممالک غیر تک نے ان کو ابن سینا جیسے اعزاز وخطاب سے

1983 میں دنیا کی عظیم حکومت روس نے سرفراز کیا۔

تصانیف:

آپ اتنے مصروف بلند حوصلہ، شفیق، سادہ مزاج اور سب سے بڑھ کر بلند اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہیں کہ وقت کے یہ تابع نہیں بلکہ وقت ان کا غلام ہے۔

ہر بڑے طبیب کی طرح انھوں نے بھی طب کی بہت سی کتب شائع کرائی ہیں جن میں ہمدرد مطب، ہمدرد عطار، قرابادین ہمدرد اپنے والد ماجد کے مرکبات، مجربات کے مجموعہ کو قرابادین مجیدی کے نام سے طبع کرایا ہے۔ نام ونمود سے بچنے کی خاطر ان کتب میں سے کسی پر بحیثیت مصنف، مؤلف، مرتب یہاں تک کہ ناشر کی حیثیت سے بھی اپنا نام نہیں ڈالا ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب حقیقتاً بڑے آدمی ہیں۔ ان میں وہ تمام تر خوبیاں موجود ہیں جو ایک بڑے فنکار یا بڑے ادیب یا فصیح و بلیغ فرد میں ہوتی ہیں۔

طبی اور ادبی ادب کا نقیب

حکیم سید علی کوثر چاند پوری

1908

ایسی شخصیت کا نام ہے جو طبی اور ادبی حلقوں میں یکساں مشہور ہے۔ اردو جاننے والا اور ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی باذوق شخص اس نام سے ناواقف نہیں ہوسکتا۔ خداداد صلاحیتوں کے مالک برصغیر ہندوپاک کے چوٹی کے طبیب اور صف اول کے ادیب وافسانہ نگاروں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔

حکیم صاحب کا پورا نام سید علی کوثر ہے اور ادبی نام کوثر چاند پوری۔

پیدائش:

آپ کی پیدائش 1908 میں یوپی کے ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور میں ہوئی آپ کے والد حکیم سید علی مظفر صاحب خود بھی پایہ کے حکیم تھے اور ضلع بجنور کے علمی اور طبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور نظم ونثر سے دلچسپی رکھتے تھے۔

تعلیم وتربیت:

حکیم کوثر صاحب کی پرورش بھی اس کی نگہداشت میں ہوئی۔ جو خصوصیات ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کو انھوں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور صلاحیتوں سے جلا دے کر ملک گیر شہرت حاصل کی۔ والد سے اردو، فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے 1917 میں ریاست

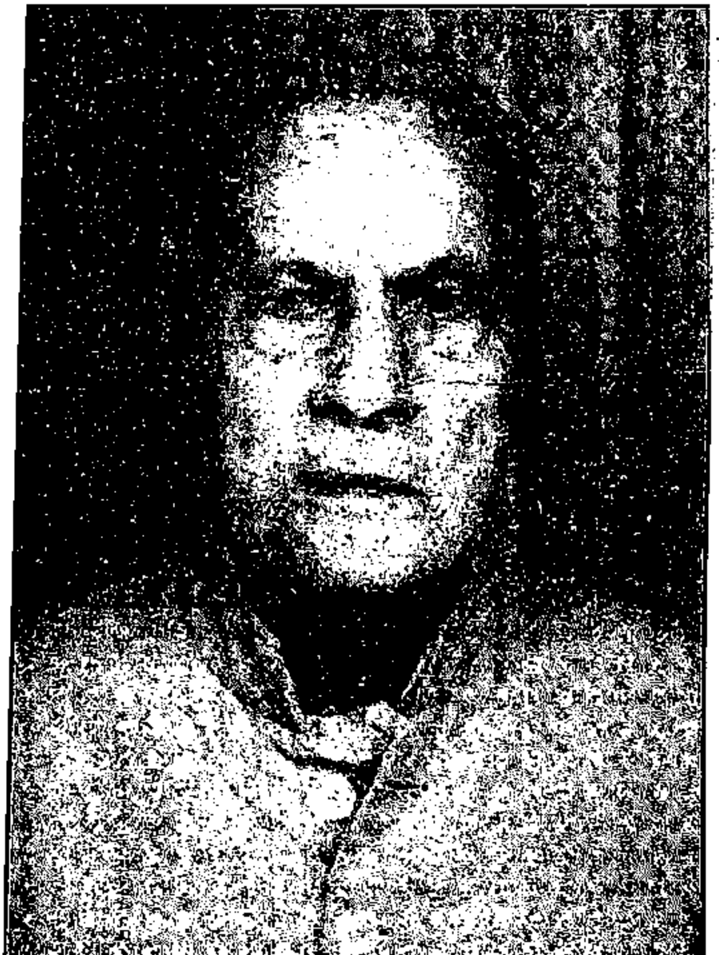

حکیم سیّد علی کوثر چاندپوری

بھوپال کے آصفیہ طبیہ اسکول (جو بعد میں آصفیہ طبیہ کالج کہلایا۔ میں داخلہ حاصل کر کے باقاعدہ طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ یہاں کا ماحول کوثر صاحب کی طبی اور ادبی تربیت کے لیے نہایت سازگار رہا۔ طبی اسکول میں ہر ہفتہ کو مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوتا تھا جس میں کوثر صاحب نے باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا اور طبی مضامین پیش کرنا شروع کیے اور رفتہ رفتہ اس عادت نے عادت ثانیہ کا رخ اختیار کر لیا اور ان کی تحریروں میں نکھار آتا رہا اور دوران تعلیم ہی ان کے مضامین الحکیم لاہور، جامع الطبا لکھنؤ اور مصباح الحکمت سہارنپور میں باقاعدگی سے شائع ہونا شروع ہو گئے اور ایک طبی ''الدق'' کے نام سے اسی زمانے میں شائع ہوئی۔ اس کی ایک جلد اب بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ ان تمام مشاغل کے باوجود حکیم صاحب اپنی طبی تعلیم کی جانب یکسوئی سے توجہ دیتے رہے اور امتیازی کامیابی بھی۔ 1922 میں طبی تعلیم امتیاز کے ساتھ اور سرجری و میڈیسن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے نقرئی تمغہ کے ساتھ مکمل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد ہی حکیم کوثر صاحب کا تقرر بحیثیت طبیب محکمہ صحت بھوپال کے زیر اثر تحصیل سلوانی کے یونانی شفاخانہ میں ہو گیا اور اس کے بعد قصبہ بیگم گنج، رائسین نیز دیگر مقامات پر نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔ ان تمام علاقوں میں حکیم صاحب اپنی طبی صلاحیت اور ادبی ذوق کے باعث نہایت مشہور اور ہر دل عزیز ہو گئے۔ ان کا نام اس وقت ادبی اور طبی دنیا میں اجنبی نہیں رہا تھا اور ادبی دنیا میں وہ صف اول میں شامل ہو چکے تھے۔ بحیثیت ملازم کوثر صاحب کا آخری تقرر بھوپال میں رابعہ اسپتال میں ہوا جہاں سے 1958 میں وہ بحیثیت افسر الاطبا ریٹائرڈ ہوئے۔ کوثر صاحب طبی، ادبی اور سماجی حلقوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز رہے۔ بھوپال کے اطبا اور ادیب و شعرا ان کو اپنا بزرگ اور قائد تصور کرتے تھے اور وہ بھوپال ہی نہیں بلکہ مدھیہ پردیش میں طب یونانی کے ارتقا اور اردو زبان کی بقا و ترقی کی مہم کے سپہ سالار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1964 میں بھوپال چھوڑنے تک وہ مسلسل بلا مقابلہ اتفاق رائے سے مدھیہ پردیش یونانی طبی کانفرنس اور مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔ اپنے قیام بھوپال کے دوران کوثر صاحب کی ذات اور شخصیت وہاں کی ادبی اور طبی زندگی کی جان تھی اور وہ ان حلقوں کے بے تاج بادشاہ تصور کیے جاتے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد کوثر صاحب بھوپال میں ہی اپنا ذاتی

مطب نہایت کامیابی سے کرتے رہے جب 1964 میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد نرسنگ ہوم اینڈ ریسرچ کلینک دہلی کی بنیاد ڈالی اور اس کے ساتھ یونانی طب کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی نظر انتخاب حکیم کوثر صاحب پر ٹھہری۔ حکیم عبدالحمید صاحب سے حکیم کوثر صاحب کے ذاتی اور دیرینہ تعلقات تھے اور انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ لیکن حکیم عبدالحمید صاحب نے یہ لکھ کر کہ فن طب کو آپ کی ضرورت ہے' کوثر صاحب کو خاموش کر دیا اور انھوں نے ہمدرد نرسنگ ہوم دہلی میں بحیثیت میڈیکل آفیسر یونانی اپنا عہدہ سنبھال لیا اور تقریباً 18 سال اس سے وابستہ رہے۔ اس دوران حکیم صاحب اپنی طبی صلاحیتوں اور نباضی کی بنا پر بہت مشہور ہوئے جس کا اندازہ مریضوں کی بھیڑ سے لگایا جا سکتا تھا۔ گردہ کی پتھری، ایکزیما اور برص کے علاج کے لیے حکیم کوثر صاحب خصوصی طور پر مشہور ہیں۔ دہلی کے مشہور سرجن اور ہمدرد نرسنگ ہوم کے چیف سرجن ڈاکٹر آر۔ این کنار یہ تو ان کی پتھری کے علاج سے اس قدر متاثر تھے کہ اکثر انھوں نے کئی مریض آپریشن کرنے کے بجائے حکیم کوثر صاحب کے پاس بھیجے اور ان کا ہر علاج کامیاب رہا۔ ایکزیما کی ایک مریضہ جو ہندوستانی افواج کے ایک کور کمانڈر جنرل لکھونت سنگھ کی بہن اور جن کے دونوں پیر نیچے سے اوپر تک اس مرض کا شکار تھے اور وہ مکمل مایوسی کی حالت میں تھیں۔

حکیم صاحب نے جونکوں کی مدد سے ان کا کامیاب علاج کیا تھا۔

اسی دوران حکیم صاحب یونین پبلک سروس کمیشن میں طبیب حضرات کے انٹرویوز کی پینل میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور کونسل آف ریسرچ یونانی میڈیسن کی کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور اس کے اجلاسوں میں حیدرآباد مدراس وغیرہ میں شرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ 1982 میں ہمدرد نرسنگ ہوم کے تغلق آباد میں منتقل ہو جانے پر حکیم صاحب نے بعد میں ذاتی طور سے سبکدوش ہو کر گھر پر ہی مریضوں کو مشورہ دینے کا سلسلہ شروع کیا جو ہنوز جاری ہے۔

اپنی تمام فنی مصروفیات کے باوجود حکیم صاحب نے تحریر و تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی طبی تصانیف گہرے مطالعہ تجربہ اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ وہ جس طرح ان پر محنت سے کام کرتے ہیں

اس کا اعتراف حکیم عبدالحمید صاحب نے کوثر صاحب کی تصنیف ''اطبائے عہد مغلیہ'' میں اس طرح کیا ہے۔

''تمام کتب تاریخ میں سے طبی مواد کا نکالنا آسان کام نہیں۔ یہ کام وہی شخص بہتر طور پر کرسکتا ہے جو بیک وقت طبیب بھی ہو اور تاریخ کا صحیح ذوق بھی رکھتا ہو اور پھر حاصل شدہ مواد کو دلکش انداز میں پیش کرنے کے لیے ادیب بھی ہو۔ کوثر چاند پوری کی ذات میں یہ صفات ایک خاص امتزاج سے جمع ہیں۔''

حکیم صاحب کی طبی صلاحیتوں سے ہر مکتب خیال کے لوگوں نے استفادہ حاصل کیا اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اردو کے مشہور شاعر رام کرشن مضطر صاحب بھی حکیم صاحب کے مداح تھے اور ان کی طبی صلاحیتوں سے بے حد متاثر۔ انھوں نے حکیم صاحب کو منظوم خراج تحسین اس طرح پیش کیا ہے۔

طبیب نیک سرشت و ادیب نکتہ نواز | ہر انجمن میں ہیں جو سر بلند وسرافراز
حکیم کامل و عیسیٰ نفس علی کوثر | شعور طب قدیم و جدید کے مظہر
وہ خوئے لطف کہ بیتاب دل سکوں پائے | وہ نرم لہجہ کہ بیمار کو قرار آئے
وہ جن کے سایہ میں ملتا ہے ہر دکھی کو چین | وہ جن کا خدمت انسانیت ہے نصب العین

حکیم کوثر صاحب کے طبی اور ادبی معرکوں اور تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو شاید یہ خود ایک ضخیم کتاب کی شکل میں جمع ہو۔

وہ جسمانی مرضوں کا علاج اپنے نسخوں کے ذریعہ اور سماجی برائیوں کا علاج و مداوا اپنے ادبی شاہ پاروں سے جس طرح کرتے ہیں اس سے ہر آدمی متاثر ہوتا ہے اور دونوں میدانوں میں ان کی مہارت اور شہرت قابل رشک بات ہے۔ ان کی ہمہ رنگ شخصیت کو مشہور ناقد ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''لفظ حکیم اپنے مروجہ مفہوم کے ساتھ کوثر چاند پوری کی قبا شخصیت پر اتنا تنگ ہے کہ باوجود اپنی نمایاں قدر خصوصیات کے پوری طرح ان کے جوہر حکمت کو سامنے نہیں آنے دیتا۔''

(ٹائٹل کور دانش و بینش مصنف کوثر چاند پوری)

حکیم صاحب کی طبی تصانیف میں سینکڑوں شائع شدہ طبی مضامین کے علاوہ ''اطبائے عہد مغلیہ''۔ ''الدق'' حکیم اجمل خاں، طب قدیم میں جدید علوم کی آمیزش اور موجز القانون شامل ہیں۔ آخر الذکر نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

آپ کا شمار برصغیر ہندو پاک کے چوٹی کے طبیبوں اور صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور ان کو ادبی طبی اور ثقافتی حلقوں میں یکساں مقبولیت و شہرت حاصل ہے۔

یہ فیصلہ کرنا از حد مشکل ہے کہ ان کا طبی سرمایہ زیادہ ہے یا ادبی۔ بہر حال یقیناً یہ طب یونانی کی خوش قسمتی اور اردو ادب کی نیک بختی ہے کہ اس کو کوثر صاحب کی ملکیت حاصل ہے۔ چاہے ادب کا ذکر ہو یا طب کا، حکیم صاحب کی شخصیت پر دونوں پہلوؤں سے نظر ڈالے بغیر یہ کام پورا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے قلم سے بہترین افسانوی ادب کی تخلیق کی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کا کوئی معیاری جریدہ ایسا نہیں جس میں کوثر چاند پوری کی شمولیت قابل فخر نہ سمجھی جاتی ہو۔ بلاشبہ ہزاروں افسانے کوثر صاحب کے قلم سے جنم لے چکے ہیں اور ان کی بیشتر کہانیاں لافانی مقام کی مالک ہیں۔ کوثر صاحب نے صرف افسانے ہی نہیں بلکہ ناول، تحقیقی وتنقیدی کتب رپورتاژ اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کی شخصیت اردو ادب میں قابل تعظیم واحترام ہے۔

مشہور طنز نگار فکر تونسوی مرحوم کوثر صاحب سے تحریری انٹرویو (''ماہنامہ شاعر کوثر چاند پوری'') میں فرماتے ہیں۔

''آپ ہمیشہ مجھے قابل تعظیم ہی لگتے ہیں۔ آپ کا جب بھی تصور آتا تو آپ کے ساتھ منشی پریم چند کا تصور بھی آجاتا۔ اس کو میری عقیدت سمجھیے، میں آپ کو ہمیشہ پریم چند سے ایسوسی ایٹ کرتا۔ جب میں آپ کے سامنے سرتسلیم خم کرتا ہوں تو شرمندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ کا تو صرف احترام ہی کیا جاسکتا ہے۔''

کوثر صاحب ایک اچھے نباض اور معالج ہیں۔ اپنے مریضوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کے مرض کو پہچان کر اس کا علاج کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنے تیکھے نشتروں سے سماجی ناسوروں کو چیرتے ہیں۔ سماج میں رہنے والوں کے زخموں کا اندازہ کرکے اپنے دل سے ان کی نباضی اور قلم

سے ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول اس کے مظہر ہیں۔ جنھیں انھوں نے بیشتر سماج کی برائیوں کو سامنے رکھ کر تصنیف کیے ہیں۔ ان کے افسانے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی بات کو دل کی نظر سے دیکھ کر قلم کی زبان عطا کر دیتے ہیں۔

مشہور ادیب حیات اللہ انصاری فرماتے ہیں:

''کوثر کے اسلوب میں پریم چند کی جھلک سے عمومی بات میں گہرائی دیکھ لینا۔ نا قابل توجہ حرکتوں میں افسانہ پیدا کر لینا اور بڑی کہانیوں کو اختصار میں سمیٹ لینا ان ہی قلم کاریوں کی وجہ سے کوثر کی بعض کہانیاں دماغ میں عرصہ تک گونجا کرتی ہیں۔''

(رات کا سورج، مصنفہ کوثر چاند پوری)

کوثر صاحب کے افسانوں کے کردار ہمارے لیے نئے نہیں۔ وہ ہمارے اردگرد کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں میں تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے افسانے حقیقت سے قریب لگتے ہیں بعض وقت ان میں ہم کو ہماری روزمرہ کی زندگی کا احساس رہتا ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد وقار عظیم نے اپنی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' میں کوثر چاند پوری کے افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں اور فن کی رعنائیوں کا اعتراف کیا ہے اور جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو معراج عطا کی اُن میں کوثر صاحب کو بھی شامل کیا ہے۔

کوثر صاحب نے طب یونانی اور اردو ادب کی انتھک اور خاموش خدمت کی ہے وہ کسی گروہ یا گروپ بندی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی صلہ ستائش یا اعزاز کی خواہش کی۔ اس کے باوجود بھی ان کو مختلف اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اب تک شاید کوئی بھی اعزاز یا انعام ان کی بلند پایہ شخصیت کے قابل نہیں ہے۔

ڈاکٹر مجاہد حسینی صدر شعبۂ اردو و فارسی ایم ڈی کالج پریل، بمبئی۔ کوثر صاحب کی فن اور شخصیت پر ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں اور بھوپال میں شفیق اعجز نے ایم اے کے لیے اپنے تحقیقی مقالے کوثر چاند پوری فن اور شخصیت کو وسعت دے کر اس پر ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کے لیے کام کر رہے ہیں۔

کوثر صاحب کا شمار اردو کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب (جو ہمارے محترم دمقتدر نقاد ہمیشہ شمار کیے جاتے ہیں) نے اپنے عکس اور آئینہ میں اردو افسانے کا سربلند کرنے والے جن 21 افسانہ نگاروں کو نامزد کیا ہے ان میں کوثر چاند پوری بھی شامل ہیں۔

کوثر صاحب کی تاریخی تصنیف ''بیرم خان ترکمان'' ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے حوالہ سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لندن میں ابوسعید بزمی ایم اے کا مقالہ شائع ہوا ہے اور اسی کتاب کا حوالہ ایک روسی کتاب مصنفہ غضنفر علی یوف میں دیا گیا ہے جس میں کتاب کے اقتباسات فارسی رسم الخط میں دیے گئے ہیں۔

کوثر صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے تھکے نہیں ان کا قلم ابھی بھی رواں دواں ہے وہ 80 سال کی عمر میں بھی اسی انہماک سے اپنے مریضوں کو دیکھتے اور اسی ذوق وشوق وجستجو سے ادبی تخلیق کرتے ہیں اور آج بھی صف اول میں اپنے مقام پر فائز ہیں۔ مشہور پاکستانی ادیب انور سدید رقم طراز ہیں:

> ''آج کے بہت سے ادیب جب پالنے میں انگوٹھا چوس رہے تھے کوثر چاند پوری شہرت کے نصف آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ پھر کئی نامور افسانہ نگار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی شہرت کا بوجھ نہ سہار سکے اور آج اتنے گمنام ہو گئے ہیں کہ ان کا نام افسانہ نگاروں کی طویل فہرست میں بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن کوثر چاند پوری کا قلم نہ صرف رواں دواں ہے بلکہ ان سے آس رہتی ہے جس کا تذکرہ دل سے نکل کر لبوں تک بھی آجاتا ہے۔''

(رسالہ اوراق اپریل 1975 تبصرہ آوازوں کی صلیب مصنفہ کوثر چاند پوری)

انور سدید کا یہ تبصرہ آج بھی کوثر صاحب کے لیے بالکل موزوں ہے۔ ان کا قلم آج بھی اسی طرح جوان ہے اور اپنے سفر پر گامزن ہے۔

وہ طب یونانی اور اردو ادب کی قابل قدر اور قابل احترام میراث ہیں۔

16 دسمبر 86 کو اردو اکادمی دہلی نے کوثر صاحب کے اعزاز میں ایک شام منعقد کی۔ انور علی دہلوی نے صدارت کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے۔

''کوثر صاحب نہ چاند پوری ہیں۔ نہ بھوپالی، نہ دہلوی، وہ ایک ملک گیر شخصیت ہیں۔''

اعزازات:

(1) میونسپل بورڈ مدھیہ پردیش کا ادبی اعزاز 1962

(2) اردو اکادمی یو پی کا مختلف کتابوں پر انعامات۔
1973-1974-1977

(3) اردو اکادمی مدھیہ پردیش ایوارڈ 1981

(4) میر ایوارڈ، میر اکادمی، لکھنؤ

حکیم کوثر چاند پوری کی چند مطبوعہ تصانیف:

نمبر	فن	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت
1	ناول	ویرانہ	انوار احمد پریس الہ آباد	1944
2	//	داستانیں (باغ و بہار) جدید افسانوی لباس ہیں)	//	1955
3	//	پیاسی جوانی	نیو تاج آفس دلّی	//
4	//	جی موہن	-	-
5	//	اغوا	مکتبہ جمالستان دلّی	-
6	//	سب کی بیوی	چندن بک ڈپو دلّی	-
7	//	توڑ دو زنجیریں۔	بھنکا بک ڈپو علی گڑھ	-
8	//	راکھ اور کلیاں (دوسرا ایڈیشن)	ناولستان گاندھی نگر	1981
9	//	فریدہ موٹی کی ڈائری (فیفٹی)	مکتبہ بیسویں صدی دلّی	1964
10	//	شام غزل	مشورہ بک ڈپو، نئی دلّی	1964
11	//	مسکرائی زندگی	// //	-
12	//	عشق نہ دیکھے	اسٹار پبلی کیشنز، دلّی	1965

13	//	محبت اور سلطنت	مکتبہ کائنات لاہور	1962
14	//	مرجھائی کلیاں	مجلس اشاعت ادب دلّی	1962
15	//	پتھر کا گلاب	حلقۂ فکر و شعور دلّی۔	1968
16	//	گونگا ہے بھگوان	مکتبہ جامعہ	1972
17	//	مہکتی بہاریں	–	–
18	افسانوی مجموعے	دل گداز افسانے	مکتبہ جدید لاہور	1929
19	//	دنیا کی حور	آسی پریس لکھنؤ	1930
20	//	ماہ و انجم	عالمگیر بک ڈپو لاہور	1937
21	//	دلچسپ افسانے	جامعہ پریس دہلی	1938
22	//	رات کا سورج	1221 بلی ماران، دہلی	1976
23	//	دنیا کی حور اور دوسرے افسانے	مکتبہ جدید لاہور	1938
24	//	گل و لالہ	انوار احمدی پریس الہ آباد	–
25	//	شب مالح	// //	1941
26	//	عورتوں کے افسانے	مکتبہ جدید لاہور	–
27	//	رنگین سپنے	نفیس بک ڈپو، حیدر آباد	–
28	//	لیل و نہار (فسانۂ عجائب جدید افسانوی لباس میں)	انوار احمدی پریس الہ آباد	1944
29	//	اشک و شرر	دارالبلاغ لاہور	1944
30	//	شعلۂ سنگ	ہمدرد اکیڈمی کراچی	1963
31	//	آوازوں کی صلیب	حلقۂ فکر و شعور دلّی	1973
32	//	تحقیق و تنقید، دیدۂ بینا	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1968
33	//	جہان غالب	مکتبہ کائنات لاہور	1965

34	//	// // //(ہندستانی ایڈیشن)	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1968
35	//	فکر و شعور	مدھیہ پردیش اردو اکادمی	1981
36	//	دانش بینش	حلقۂ فکر و شعور بلی ماران دہلی	
37	(انشائیہ)	کوثرستاں	انوار احمدی پریس الٰہ آباد	1945
38	رپورتاژ	کارواں ہمارا	حلقۂ فکر و شعور دلّی	1966
39	تاریخ	بیرم خاں ترکمان	آگرہ پریس آگرہ	1931
40	//	تاریخ اطبائے عہد مغلیہ	ہمدرد اکادمی، کراچی	1960
41	//	حکیم اجمل خان	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	1974
42	(طنز و مزاح)	مسکراہٹیں	مشہور بک ڈپو دلّی	1937
43	//	موج کوثر	// //	1938
44	//	شیخ جی	لاجپت رائے بک ڈپو لاہور	1939
45	//	نوک جھونک	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد	1940
46	//	خندۂ دل	انوار احمدی پریس الٰہ آباد	1942
47	(الف)(بچوں کے لیے(ب)	حالی سرسید۔	الٰہ آباد	
48		سیاح لڑکا کولمبس	//	
49		استقلال	انوار احمدی پریس الٰہ آباد	
50		رشوت	// // //	
51		بادلوں کی ملکہ	// // //	
52		بہادر لڑکا	// // //	
53		چوہیا بیگم	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد	
54		چالاک مرغا		
55		لڑکے کا خواب		
56		ہونہار لڑکا		

57	غرور کا انجام		
58	موتیوں کا انڈا		
59	چوہوں کی بستی		
60	جادو کا خزانہ		
61	(الف) کبڑا جادوگر		
62	خوب صورت محل		
63	وفادار دوست		
64	(طب) موجز القانون	ترقی اردو بورڈ دہلی	1983
65	〃 محسن اطفال		
66	〃 الدق		
67	〃 دستور العمل		
68	〃 المباحثہ العلائیہ		
69	〃 قدح کبیری		
70	〃 رسالہ آتشک		
71	طب قدیم میں جدید علوم کی آمیزش	حلقہ فکر و شعور بلی ماران، دہلی	وغیرہ وغیرہ
72	دغا باز دوست		
73	سمندر کا شہزادہ		
74	علم و تجارت		

حکیم شکیل احمد شمسی

1914 1958

طبی سیاست کے ترجمان

دہلی ولکھنؤ جس طرح شعر وادب، تہذیب وتمدن، تاریخی حیثیت سے جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں اسی طرح دونوں مقام کے عوام کے خیالات، احساسات واطبا کے طریقۂ علاج بھی جدا جدا ہیں۔ دہلی جو شان وشوکت کا بانکپن لیے اگر مرکبات کا شیدائی ہے تو لکھنؤ میں علاج بالمفردات کے طریقہ کا چلن ہے۔ دہلی میں طریقۂ علاج کے میدان میں اگر خاندان شریفی کو ملکہ حاصل ہے تو لکھنؤ میں خاندان عزیزی کی حکمرانی ہے۔ ان مراکز میں کسی غیر طبی خاندان یا فرد واحد کو کامیابی ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

سرزمین ہند جو ہمیشہ سے گہوارۂ امن اور صوفی سنتوں و بزرگان دین کا مرکز و مسکن رہی ہے۔ ان صوفی سنتوں و بزرگوں نے اپنے اوصاف حمیدہ سے وہ قابل ذکر کارنامے انجام دیے ہیں جو تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ شمس تبریز تھے۔ جن سے شمسی طبقہ (پنجابی) اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔

قوم پنجابی میں فرقہ کھتری کے اجداد کسی دریا میں نہانے جا رہے تھے اُدھر سے شمس تبریزؒ جو دعوت تبلیغ اسلام میں منہمک تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اگر اس قوم کی اصلاح کر دی جائے

حکیم شکیل احمد شمسی صاحب مرحوم

اور یہ قوم باشرف اسلام ہو جائے تو خطۂ پنجاب میں دین اسلام کی کرنیں بکھر جائیں گی۔

شمس تبریزؒ نے سردار قوم سے کہا کہ اگر وہ ندی جس میں تم نہانے جارہے ہو۔ یہیں بلا دیں تو کیا قبول اسلام کرو گے۔ کھتری قوم کے پیشوا راضی ہو گئے۔ شمس تبریزؒ نے کہا کہ آنکھ بند کرو۔ ان کے ایسا کرتے ہی شمس تبریزؒ نے خدا سے دعا کی اور مرضیٔ خدا وہ ندی ان کے پاس اور اُن کے سامنے آ گئی۔

اس طرح یہ قوم دامن اسلام کے آغوش میں آ گئی۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے اجداد اسی نومسلم خاندان سے متعلق تھے۔ شمس تبریزؒ جو ایک عالم باعمل صوفی باوصف اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان کے جاہ و جلال، علم و فضل اور کرامات کے بہت سے واقعات مشہور ہیں جن میں مندرجہ ذیل واقعہ کی تاریخی اور علمی حیثیت اظہر من الشمس ہے۔

مشہور بزرگ اور ولی کامل وصادق مولانا جلال الدین رومیؒ دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام پر تصنیف و تالیف۔ غور و فکر اور خیالات تصوف میں غلطاں و پیچاں بیٹھے تھے کہ ناگاہ نظر کا ٹکراؤ ہوا اور اللہ والے ایک دوسرے کو پہچان گئے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سے شمس تبریزؒ مخاطب ہوئے اور کہا ایسا بھی علم کیا اور عالم کیا جو کتابوں کا محتاج ہو اور مولانا جلال الدین رومی کے اردگرد پھیلی ہوئی کتب کو جو ایک ذخیرہ کی شکل میں تھیں۔ بیک جنبش غرق دریا کر دیا۔

مولانا جلال الدین از حد فکرمند اور متحیر تھے کہ سارا علم و ذخیرہ دریا کی نظر ہو گیا۔ یہی کل کائنات اور اثاثۂ زندگی تھا۔ مولانا کی اضطراری کیفیت اور پریشانی کو دیکھتے ہوئے حضرت شمس تبریزؒ نے دریائے دجلہ میں ہاتھ ڈالا اور غرق شدہ کتب مولانا کی خدمت میں حسب سابق پیش کر دیں۔

تب یہ شعر نذر کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

خاندان:

حکیم شکیل احمد شمسی کے اجداد ہند و پاک پر مشتمل پنجاب کے کچھ اضلاع میں مقیم ایک غیر

مسلم طبقہ پر مشتمل تھے۔ یہ طبقہ نومسلمین میں شمار ہوتا تھا اور حضرت شمس تبریزؒ کے ہاتھوں مشرف با اسلام ہوا۔ تاریخی واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طبقہ کے افراد حسب معمول کسی ندی میں نہانے جارہے تھے۔ راستہ میں شمس تبریزؒ نے ان کو دعوت اسلام دی اور کہا اگر گنگا یا ندی اسی مقام پر منگا دیں تو کیا قبول اسلام یہ طبقہ کرے گا۔ شمس تبریزؒ جن سے اس کے قبل حیران کن واقعات ظہور میں آچکے تھے۔ انھوں نے وعدہ کے بموجب وہ ندی اُسی مقام پر پلک جھپکتے ہی جاری وساری کر دی۔ ان نومسلمین نے حضرت شمس تبریزؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

پیدائش:

شکیل احمد یوپی کی مشہور ریاست رامپور کے محلہ گھیر مردان خاں کے ایک تاجر گھرانہ میں 20 جولائی 1914 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حاجی حبیب احمد حسب دستور پیشہ تجارت سے منسلک تھے ان کے نانا مولوی منور علی محدث کا شمار مشہور علما میں ہوتا تھا۔

تعلیم وتربیت:

بچپن کے ابتدائی اسباق اپنے نانا منور علی سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کی تکمیل مدرسہ عالیہ رامپور (جو رامپور میں ایک نمایاں وقدیم مرکز علم وادب ہے) سے کی۔ بعد فراغت مدرسہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر کے حصول طب کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا اور طب کی مشہور طبی درسگاہ تکمیل الطب طبیہ کالج میں عوام الناس کی خدمت کرنے کے لیے طب کی تعلیم میں داخلہ لیا۔ ایسے وقت میں سرزمین لکھنؤ پر خاندان عزیزی کے روشن ستاروں شفاء الملک حکیم عبدالحمید شفاء الملک حکیم عبدالمعید، شفاء الملک حکیم عبدالحسیب کا ڈنکا بج رہا تھا۔ شکیل احمد شمسی نے مذکورہ بالا صاحب علم وادب سے نہ صرف فیضان حاصل کیا بلکہ تکمیل الطب کالج کے ماہر فن اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا۔ شکیل احمد شمسی کا طالب علمی کا زمانہ لکھنؤ کا بہترین طبی زمانہ تھا۔ آپ نے نہ صرف طب کی تعلیم حاصل کی بلکہ لکھنؤ کی علمی وادبی صحبتوں سے فیضیاب ہوکر شعروادب کی جانب بھی مائل ہوئے اور اس شوق کو جلا حاصل ہوئی۔ تکمیل الطب کالج سے طبیب ماہر اور انڈین میڈیسن بورڈ سے ڈی۔ آئی۔ ایم ایس کی اسناد حاصل کیں۔ آپ کا شمار تکمیل الطب کالج کے قابل فخر فرزندوں میں ہوتا تھا۔ تکمیل الطب کالج سے

فراغت کے بعد 1933 میں اپنے آبائی وطن رامپور میں خدمت کی غرض وغایت سے مطب و دواخانہ قائم کیا۔ 1942 میں اپنے استاد محترم اور مربی شفاء الملک حکیم عبد المعید کی دعوت پر مادر علمی طب تکمیل الطب طبیہ کالج میں بحیثیت استاد کے مقرر ہوئے۔ کالج میں آپ کے لیے کوئی مخصوص مضمون درس کے لیے نہ تھا۔ آپ کو جو بھی مضمون پڑھانے کے لیے دیا جاتا تھا آپ نے اس کو بحسن وخوبی پڑھایا۔ آپ کے پڑھائے ہوئے اسباق کو طلبا تکمیل الطب کالج، طبیہ کالج دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ آپ نے اس کالج میں علم تشریح، تو کبھی علم کیمیا، کبھی علم الولادت اور کبھی معالجات جیسے مضامین پڑھائے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ طبی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ 1956 میں تکمیل الطب کالج کے پرنسپل حکیم عبد الحسیب کے اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے جانے پر پرنسپل کے عہدۂ جلیلہ پر کام شروع کیا۔ 1965 میں اپنی ہی مادر علمی سے بحیثیت پرنسپل سبکدوش ہوگئے۔

دوران ملازمت آپ کو طبیہ کالج کشمیر نیز دہلی طبیہ کالج میں پرنسپل کے عہدہ کی پیش کش ہوئی۔ لیکن آپ نے اپنے مادر علمی تکمیل الطب کالج کو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ تکمیل الطب کالج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مینیجنگ باڈی نے آپ کو کالج کے سکریٹری جیسے اہم عہدہ پر مقرر کردیا۔ انھوں نے اپنے مختلف ادوار میں ادارہ کی تاریخی روایات کا پورا لحاظ رکھا۔ حکیم شکیل احمد شمسی کے دور میں تکمیل الطب طبیہ کالج نے نمایاں ترقی کی۔

آپ تکمیل الطب کالج اور خاندان عزیزی کی طبی تحریک کے پیروکار کی حیثیت سے نہ صرف یوپی بلکہ پورے ہندوستان میں پہچانے جانے لگے۔ طبی تحریکات سے شکیل احمد شمسی کو ابتدا سے ہی تعلق رہا۔ انجمن طبیہ یوپی اور اس کے بعد آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ برسوں یونانی طبی کانفرنس صوبۂ یوپی کے صدر رہے اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سینئر نائب صدر کی حیثیت سے مختلف اہم اور نازک مرحلوں پر انھوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ طبی کانفرنس کے عام جلسوں اور اس کی مجلس عاملہ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے قیام کے بعد وہ اس کی پہلی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی متعدد سب کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

ہندوستان کے بیشتر طبیہ کالجوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ تھے اور حکومت ان کے وسیع تعلیمی تجربات سے استفادہ کرتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم نے ان کو جب طبیہ کالج علی گڑھ کو بلانا چاہا اور اسی طرح 1955 میں کرنل بشیر حسین زیدی نے طبیہ کالج بورڈ دہلی کے جب وہ چیئر مین تھے ان کو پرنسپل کی حیثیت سے بلانا چاہا تو حکیم شکیل احمد شمسی نے لکھنؤ اور مادر علمی صرف اس لیے نہیں چھوڑنا پسند کیا کیونکہ وہاں لکھنؤ کی علمی وادبی محافل کا فقدان تھا۔

تصانیف:

ان کے زیر ادارت کئی برس تک تکمیل الطب کالج کا میگزین بطور ماہانہ شائع ہوتا رہا۔ ان میگزینوں کے کئی دقیق نمبر شائع ہوئے تھے اور دو خصوصی پیش کش حمیات حصہ اول و دوم نیز بحران پر بھی نمبر نکالے۔

طبی تصانیف میں حمیات، بحران کے ساتھ ایک مختصر رسالہ کتابی شکل میں طبی کیمیا کے نام سے تحریر کیا تھا ان کی سب سے نمایاں کتاب کتاب الولادت ہے جو آج بھی طبیہ کالجوں کے درسیات میں مفید خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر ایڈیشن میں طب جدید کے ساتھ طب قدیم سے بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا کتب کا طبی دنیا میں بلند معیار ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی صاحب کی شخصیت بحیثیت ایک طبیب کے زیادہ مستحکم ہے۔ لیکن آپ ادب میں بھی ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ آپ نے حج جیسا مقدس و بابرکت فریضہ 1969 میں ادا کیا۔ واپسی کے بعد آپ نے اپنا سفر نامۂ حج جس کو متعدد اہل قلم پہلے ہی سپرد قلم کر چکے تھے لیکن حکیم شمسی کے سفر نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو تاریخ میں یہ پہلا سفر نامۂ حج ہے جو ہوائی جہاز سے کیا گیا تھا اور اس کے تاثرات قلمبند کیے گئے ہیں۔

حکیم شکیل احمد شمسی کا یہ سفر نامہ ''ارض حرم تک'' کے نام سے 1969 میں چھپا تھا۔ حکیم صاحب نے کتنے اچھے پیرایہ میں کہا ہے۔

الجھی ہوئی یادوں کے صنم لے کے چلے ہیں　　دیوانے یہ کیا سوئے حرم لے کے چلے ہیں
آشفتہ خیالات کی شوریدہ سری بھی　　جذب نگہ ناز پہ خم لے کے چلے ہیں

کچھ چاک گریباں نئے رنگ جنوں میں　　کیا جانے کہاں دیدۂ نم لے کے چلے ہیں
جلتا ہوا احساس ہے بہکا ہوا دل ہے　　الجھے ہوئے حالات کے غم لے کے چلے ہیں
کہسار و فلک جس کے سزاوار نہ ٹھہرے　　وہ بار گراں دیکھیے ہم لے کے چلے ہیں
ناگفتہ خلش بھی ہے مسرت کے جلو میں　　اب کشمکش لذت و غم لے کے چلے ہیں
آنکھوں سے چھلکتے ہوئے تقدیر کے شکوے　　ہم تیرے تغافل کی قسم لے چلے ہیں
اک انجمن ناز سے آیا ہے بلاوا　　پھر ذوق نظارہ کے قدم لے کے چلے ہیں

ہم گامزن منزل جاناں ہیں جو شمسی
سامان خرد ساتھ میں کم لے کے چلے ہیں

مندرجہ بالا اشعار آپ نے حج کے موقع کے لیے کہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ متعدد عمرے بھی ادا کیے تھے۔

شعروشاعری:

حکیم شکیل احمد کا تخلص شمسی تھا۔ ان کی آخری تصنیف ان کا شعری مجموعۂ کلام جو قید حیات و بند غم کے نام سے 1985 میں زیور طباعت سے مزین ہوا۔ سفرنامۂ حج ''ارض حرم تک'' اور شعری مجموعۂ کلام'' قید حیات و بند غم'' ہندوستان کے مشہور اردو کتب کے ناشر نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم انہونوی نے (جو سینکڑوں اصلاحی، سماجی، معاشرتی نیز ادبی ناولوں کے نہ صرف مصنف ہیں بلکہ ناشر بھی ہیں) طبع کرائی ہیں۔

حکیم شکیل احمد شمسی نے غزلوں کے اس مجموعہ کا انتساب اپنی دیرینہ مطب کی ساتھی مس نسیم کے نام کیا ہے جو نہ صرف حکیم شمسی کے رفیق رہیں بلکہ آخر عمر تک شریک مطب رہیں۔

حکیم شمسی نے اپنے اس مجموعہ کے انتساب کو مندرجہ ذیل اشعار سے مزین کیا ہے۔

شعروں کو حسن دے کے غزل کو سنوار کے
فکر و نظر میں رنگ محبت نکھار کے
خود چل دیے تو مر گئے نغمے بہار کے
ہم رہ گئے متاع سخن تک بھی ہار کے

حکیم شمسی کا فطری رجحان اگر فنون لطیفہ شعر و ادب، فلسفہ اور ماورائیات میں تھا تو علاج و معالجہ، مطالعہ، طبی و ادبی نوشت و خواند، محفل آرائی اور خلوت گزینی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اگر ایک جانب مفکر تھے تو دوسری جانب عظیم شاعر بھی تھے۔

حکیم شکیل احمد شمسی اپنی عملی مصروفیات کے باعث ہی نہیں بلکہ طبعاً بھی وہ عام شعرا کی طرح عوامی مشاعروں میں بھی شرکت کرنا پسند نہ فرماتے۔ صرف چیدہ چیدہ محافل شعر وسخن ہی میں اپنے افکار کو اشعار و غزلوں کی شکل میں پیش کرتے اور وافر داد پاتے۔ مشاہیر شعرا حکیم شمسی صاحب کے کلام کو سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ خود حکیم صاحب کے گھر پر برابر شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔

مندرجہ ذیل کلام جوان کے جذبات وخیالات کے آئینہ ہیں۔ اندازہ ہوگا کہ حکیم شمسی کتنے پائے کے شاعر تھے۔

(1)
نہ بزم شوق میں ہلچل نہ ولولوں پہ شباب
پڑی ہے موت کے چہرے پہ زندگی کی نقاب
کہاں سے کیجیے ایام زندگی کا حساب
پلٹ گیا ہے ورق بند ہو گئی ہے کتاب
سراب صبح بنارس فریب شام اودھ
وہ آفتاب کا دھوکا یہ فتنۂ مہتاب

(2)
تمھاری چشم تغافل کی بے رخی کی قسم
جہاں پہ چھوڑ گئے تھے ابھی وہیں ہیں ہم
ہمارے شہر نگاراں کا ہے یہ کیا عالم
بجھی بجھی ہے محبت تھکے تھکے ہیں قدم

(3)
چاہتا ہوں کہ پھر افسانۂ دل دہراؤں
ہو اجازت تو سر عام تجھے لے آؤں
ابھی راہوں میں حرم بھی ہیں صنم خانے بھی
ان مقاموں سے گزر جاؤں تو منزل پاؤں

جذبات کا اظہار اگر حرکات میں ہوتو رقص، رنگ وخطوط میں ہوتو مصوری، آواز وآہنگ میں ہوتو موسیقی اور الفاظ میں ہوتو شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ حکیم شکیل احمد شمسی نے جذبوں کا اظہار اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی الفاظ یعنی شعروشاعری میں کی ہے۔

انسان کے ذاتی خیالات، احساسات وجذبات کو جب کوئی ٹھیس لگتی ہے یا جب وہ عمل رد عمل، شکست، مزاحمت، سپر اندازی اور ٹکراؤ کی کیفیات سے دو چار ہوتا ہے تب یہی عناصر مل کر شعر ونغمہ کا روپ لے لیتے ہیں۔ اشعار گنگنا کر وہ اپنے میں موجود خلش کی تسکین کرتا ہے۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا بھی کرتا ہے تو کوئی بھڑکاتا بھی ہے۔ کبھی ہر چوٹ پر تلملا کر لاف زنی کرتا ہے تو کبھی ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جاتا ہے تو کبھی کرب والم کی لذت کوشی کرتا ہے۔ اس کی غرض تو آسودگی سے ہے۔ حکیم شمسی نے بھی اپنے جذبات کی تسکین شعروشاعری میں کی ہے۔

ان کی شاعری میں غم ماضی، غم دوراں، غم عشق کی جو جھلک بشکل آپ بیتی ہے وہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ؏

(4) جنون عشق میں بے چارگی ایسی بھی ہوتی ہے
کہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں مگر ہر چیز روتی ہے
تماشا ہیں ہمارے دل کے ہنگاموں کی راتیں بھی
محبت جاگتی رہتی ہے اور تقدیر سوتی ہے

عشق کے غم نہ چھپے لاکھ چھپانا چاہا
لب کو روکا تو نگاہوں نے بتانا چاہا
دل سے کچھ بن نہ پڑا اُن کو بھلانا چاہا
اُن کی یادوں نے مگر خود ہی نہ جانا چاہا

پھر ایک غزل میں کہتے ہیں

بجھا دوں کس طرح تیرے تصور کے چراغوں کو
خدا جانے کہاں کب زندگی کی شام ہو جائے

شعر و شاعری کے ذوق کے علاوہ حکیم صاحب اردو کے بہترین ادیب، خطیب مصنف اور صحافی بھی رہے اور ایک مدت تک رسالہ تکمیل الطب کے مدیر رہے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کو سیاست سے گہری دلچسپی تھی تاہم خود کبھی کسی قسم کی سیاست میں نہیں الجھے اور نہ کبھی کسی سیاسی پارٹی کے نظریات کو قبول کیا۔ طبی سیاست پر گہری نظر ضرور رہی لیکن گھٹیا قسم کی سیاسی حرکتوں سے اپنے کو آزاد اور پاک رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ طبی دنیا کے ہر طبقۂ فکر و عمل کے لوگوں میں وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے رہے اور ان کے غیر جانب دارانہ مشورہ اور خیالات کی قدر سب ہی لوگ کرتے۔ طبی تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی کی پیش کش کو تو بخوبی قبول فرماتے لیکن کسی منصب کے لیے الیکشن نہیں لڑے۔ اپنی شخصیت کو متنازعہ نہیں بننے دیا۔ مختلف اداروں کے لکھنؤ میں صدر سکریٹری یا نائب صدر بھی رہے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کو مطالعہ کا شوق حد درجہ تھا۔ کم سے کم دو گھنٹہ اس عدیم الفرصتی میں بھی مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اخبار کا مطالعہ ان کی عادت میں شامل تھا۔ اس ذوق کی تسکین کے لیے اپنا کتب خانہ بھی تھا جس میں مختلف موضوعات کی کتب بشمول طب، مذہب تاریخ ادب، مختلف زبانوں کی لغات رسائل پر مشتمل تھا۔ ان کتب کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

غرض حکیم شمسی عظیم شاعر و مفکر اور ادیب ہی نہیں بلکہ عالم دین بھی تھے۔ مذہبی معاملات میں بڑی عالمانہ بحث و تقریر فرماتے تھے۔ ان کے ایسے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے جن میں مذہبی مسائل پر علمی بحث ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں مولانا منظور نعمانی مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے اکثر نسبت ہوا کرتی تھی۔

پسماندگان:

حکیم شکیل احمد شمسی کے 3 صاحبزادے مظفر اقبال شمسی جو وکیل ہیں۔ عقیل احمد شمسی جو سعودی عرب میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں اور طارق شکیل شمسی کے علاوہ 3 دختران عذرا، طلعت اور صبیحہ ہیں۔ ایک ڈاکٹر اکمل شمسی کو منسوب ہیں دوسری محکمۂ عدلیہ کے جج فضل الباری کو بیاہی ہیں۔

حکیم شکیل کا مطب قلب شہر میں شفا محل عبدالعزیز روڈ پر واقع تھا۔

وفات:

12 نومبر 1985 کو بوقت 3 بجے سہ پہر لکھنؤ کے کارڈیالوجی سینٹر میں داغ مفارقت دے گئے۔

حکیم شکیل احمد شمسی کے انتقال پُر ملال پر متعدد شعرا نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا لیکن حکیم ظل الرحمٰن آرگنائزنگ سکریٹری آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس نے حکیم شمسی کے لیے جن جذبات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے وہ نہ صرف ان کے بلکہ تمام اطبا کے جذبات کی ترجمانی ہے۔

آہ حکیم شکیل احمد شمسی

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی
کوئی رہبر کوئی نقش پا بھی نہیں کوئی شمع سر رہ گزر بھی نہیں
جانے کیا ان کی ویرانیوں نے کہا میرے ذوقِ طلب میں کمی آ گئی
زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں وہ نقوش قدم ہیں نہ زلفوں کے خم
راہ ویران ہے کس کو آواز دوں کوئی ایسا نہیں جو مری انجمن
فکر اور فن کی شمعوں سے روشن کرے آج پھر ایک خبر موت کی ساتیا
ایک غم ایک خلش ایک چبھن دے گئی مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
گاتے گاتے غزل کوئی چپ ہو گیا پیتے پیتے کوئی بادہ کش ہو گیا
بزم کی خامشی داستاں بن گئی زندگی موت کی میزباں بن گئی
آج پھر ایک خبر موت کی ساتیا کتنے چہروں کی صبحوں کو کجلا گئی
کتنی آنکھوں میں ویرانیاں چھا گئیں کتنی کلیاں اُمیدوں کی کمھلا گئیں
آج پھر اک خبر موت کی ساتیا ایک غم ایک خلش ایک چبھن دے گئی

مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
آج کم خواب آنکھوں کو نیند آ گئی
زندگی گوشۂ عافیت پا گئی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمارے جسم کا معجزاتی نظام

مصنف: قیصر سرمست

صفحات: 216

قیمت: -/41 روپے

معالجات (اوّل تا چہارم)

مصنف: وسیم احمد اعظمی

قیمت: -/455 روپے (سیٹ)

یونانی طب میں (مانع حمل ادویہ اور تدابیر)

مصنف: اُمّ الفضل

صفحات: 80

قیمت: -/31 روپے

قبالیات

مصنف: سیّد محمد عباس رضوی

صفحات: 345

قیمت: -/58 روپے

امراض الاطفال

مصنف: خورشید احمد شفقت اعظمی

صفحات: 568

قیمت: -/120 روپے

علاج بذریعہ غذا

مصنف: احتشام الحق قریشی

صفحات: 512

قیمت: -/90 روپے

₹ 109/-

ISBN: 978-93-5160-028-2

9 789351 600282

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025